کاشف باورچی خانے میں ماں کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ سر جھکائے جانے کیا سوچ رہا تھا؟ سالن کی دیگچی چولھے پر سے اُتارنے کے بعد امی نے توا اُوپر دھر دیا۔ روٹی پکانے کے لیے آٹے کا پیڑا سا بناتے ہوئے اُنہوں نے کتنی ہی بار نگاہ اُٹھا اُٹھا کر کاشف کی طرف دیکھا۔ دو چپاتیاں بھی پک گئیں ــ مگر وہ ہنوز اسی طرح چپ چاپ اور گم سم سا بیٹھا تھا۔ آخر ان سے رہا نہ گیا۔

"کیا بات ہے کاشی؟ اتنے خاموش کیوں ہو بیٹے ــ؟؟"

"ابا یاد آ رہے ہیں ــ"

"کیا ــ؟" امی چونک پڑیں ــ اس نے بڑی انوکھی سی بات کی تھی ــ باپ کا انتقال ہوئے کئی برس ہونے کو آئے تھے مگر آج کاشف کے منہ سے پہلی بار یہ فقرہ ماں نے سُنا تھا۔ ورنہ اک گڑیا کو پا کر وہ تو جیسے باقی ساری دنیا کو بھلا بیٹھا ہوا تھا۔

"کیوں ابا یاد آ رہے ہیں بیٹے ــ؟" امی قدرے افسردہ سی ہو کر پوچھنے لگیں ــ

"گڑیا بڑی ہو رہی ہے امی۔ اس کی شادی وغیرہ بھی کرنا ہوگی۔؟"

"ہاں بیٹے۔!" امی اک آہ بھر کر چپ ہوگئیں۔

"ابا زندہ تھے تو کتنے عیش تھے۔"

"خدا تجھے سلامت رکھے — دو تین سال ہی کی تو بات اور ہے۔ انشاءاللہ پھر وہی دن آجائیں گے۔" امی نے جیسے جوان بیٹے کو دلاسہ دینے کے ساتھ ساتھ اس کی ذمہ داری کا بھی احساس دلا دیا۔

"ابا کی یاد تو مجھے گڑیا کے لیے ہی آ رہی تھی۔ دو تین سال تک تعلیم مکمل کر کے میں کسی ملازمت پہ لگ جاتا تو گڑیا کی شادی ہم دو آمدنیوں کے ساتھ زیادہ دھوم دھام سے کرتے۔"

بیٹے کی یہ معصوم سی سوچ انہیں بڑی پیاری لگی — تو — ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کی سوچوں کا مرکز وہی تھی۔ امی کا خیال گزرے ایام کی بھول بھلیوں میں جا پھنسا۔ کاشف چھ سال کا تھا جب دھنک پیدا ہوئی تھی۔ بے حد خوبصورت تھی وہ — اتنی — کہ —

"میں نے آج تک بے شمار بچے پیدا کیے ہیں مگر ایسا خوبصورت بچہ، آج پہلا دیکھا ہے — خدا اس کے نصیب اچھے کرے۔" ڈاکٹر بے ساختہ کہہ اٹھی تھی — پھر اسی کے بتانے پہ باقی ڈاکٹر اور نرسیں اور ہسپتال کے دوسرے لوگ اسے دیکھنے بھی آتے تھے — مگر — اک کاشف تھا جو اس کا وجود برداشت نہ کر پایا — شاید اس لیے کہ چھ سال تک گھر میں اکیلا بچہ رہا تھا — ماں باپ دونوں ہی کی توجہات کا واحد مرکز — !

اور — امی کی گود میں اپنے بجائے کسی اور کو دیکھ کر وہ بگڑ اٹھا۔" اسے پھینک دیں امی۔! اسے دُور پھینک دیں —!" بڑی معصوم سی فرمائش تھی۔ امی مسکرا پڑیں۔

"میں کہہ رہا ہوں نا کہ اسے پھینک دیں۔" پہلی بار کہنے پر امی نے عمل نہ کیا تو اب وہ سختی سے بولا اور ساتھ اسے ٹانگ سے پکڑتے ہوئے گھسیٹ کر سچ مچ پھینکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس لمحے امی نے اسے ڈانٹ دیا۔ یہ اس کی زندگی کی پہلی جھڑکی تھی۔ وہ زور زور سے رونے لگا — وہی ڈاکٹر اس وقت کمرے میں موجود تھی۔ کاشف کو روتے دیکھا تو قریب آکر اسے پیار کرنے لگی۔ مگر اس کا مطالبہ وہی تھا — کہ امی اسے گود سے نکال دیں۔

لمحہ بھر کے لیے ڈاکٹر نے کچھ سوچا اور پھر ننھی سی بچی کو اس کی امی کی گود سے لے کر کاشف کی گود میں ڈال دیا۔ "یہ بیٹے! آپ کی بہن ہے اور صرف آپ کے لیے اللہ میاں نے آسمان سے بھیجی ہے۔ آپ کی امی تو صرف اس کے چند ضروری ضروری کام کریں گی — باقی یہ ساری آپ کی ہے۔" کاشف نے بڑی حیرت سے ڈاکٹر کی بات سُنی اور پھر نگاہ جھکا کر اس ننھی سی گڑیا نما بچی کی طرف دیکھا۔

"کیا سوچ رہی ہیں امی —؟ وہ دیکھو روٹی جل گئی۔" کاشف کی آواز سنتے ہی امی ماضی کی بھول بھلیوں سے نکل حال میں آپہنچیں۔

"ارے —!" وہ پھر مسکرا دیں۔ "تمہاری وہ بات یاد آگئی تھی۔"

"کونسی —؟"

"وہی — جب دھنک پیدا ہوئی تھی تو تم کہتے تھے کہ میں اسے پھینک دوں۔" پھر امی زور سے ہنس پڑیں۔ "اگر اس وقت تمہاری بات مان لیتی تو —؟"

"ہائے ہائے — خدا نہ کرے۔ میں قربان ہو جاؤں اپنی گڑیا پر سے۔"
کاشف کو بھی وہ سب کچھ یاد آ گیا۔ اور اب — وہ ماضی کی پُرپیچ راہوں میں کھو گیا —

امی کی گود میں گڑیا کو دیکھ کر سچ مچ اسے بڑا حسد آیا تھا — مگر جب اس ڈاکٹر نے کہا کہ یہ اس کی بہن ہے — تو — ایک بڑا انوکھا سا، بڑا سہانا سا جذبۂ ملکیت کا احساس تھا جو اس نے اپنے اندر محسوس کیا تھا — یہ گڑیا صرف اسی کے لیے خدا نے بھیجی تھی — اس سوچ، اس احساس کے ساتھ اس کی گرفت خود بخود اس پر مضبوط ہوتی چلی گئی تھی۔

اپنی ملکیت کو ہر کوئی سنبھال کر اور بڑی حفاظت سے رکھتا ہے۔ اس لمحے کے بعد اس پر بھی وہی دور آ گیا۔ اب وہ خود اسے اپنی امی کی گود میں دے دیتا۔ تاکیدیں کرتا کہ اسے حفاظت سے، احتیاط سے اُٹھائیں۔ اس کے کام کریں۔ یوں اسے تو بس ہر وقت اسی کا فکر پڑا رہنے لگا۔

اپنی ملکیت کے احساس کے ساتھ ساتھ اسے وہ پیاری بھی بہت لگنے لگی تھی — گول مٹول، سرخ اور سفید سی گڑیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سانس بھی لیتی تھی۔ وہ مسکراتی بھی تھی — روتی بھی تھی — اس میں تو بڑی صفات موجود تھیں۔ اس کے دوسرے کھلونوں سے کہیں زیادہ اعلیٰ تھی وہ — ان دنوں وہ اپنے باقی سب کھلونوں کو بھول گیا تھا — اس کے لیے صرف گڑیا ہی گڑیا تھی۔ پھر — ایک دو سال اور گزرے تو وہ باقی ساری دنیا کو بھی بھول گیا۔ اس کی کل کائنات گڑیا ہی بن کر رہ گئی — وہ اس کے ساتھ کھیلتا تھا — وہ اس کے ساتھ باتیں کرتا تھا — وہ اسے پیار کرتا تھا پھر بدلے میں وہ بھی اپنے بھائی کو پیار کرتی تھی۔ ایسے خوبصورت اور ایسے پیارے پیارے جذبے بخشنے والا کوئی

اور وجود تھا دنیا میں — ؟

اپنے ان تصورات سے وہ خود ہی چونکا — مسکرایا — "پھر امی! میں نے چھینک دینے والی بات کا ازالہ بھی تو کر دیا تھا — مجھے یقین ہے جتنا گڑیا کو میں نے پیار کیا ہے — اور جتنا مجھے اس سے پیار ہے — اتنا تو شاید آپ ماں ہو کر بھی اسے نہ کر سکیں۔"

"ہاں — یہ سچ ہے — اس کا مجھے اعتراف ہے۔" امی کے ہونٹوں پر کسی پرانی یاد نے مسکراہٹ بکھیر دی۔ "پھر تو تم اتنا اس کو اپنا سمجھنے لگے تھے کہ کوئی اور اس کو گود میں لیتا یا پیار کرتا تو تمہیں بُرا لگ جایا کرتا تھا۔ یاد ہے نا جب دھنک دو سال کی اور ساجدہ بہن ہمارے ہاں آئی تھیں۔"

"ہاں —" کاشف زور سے ہنس پڑا۔ "میں سکول سے آیا تو گڑیا ان کی گود میں بڑے اطمینان سے براجمان تھی۔ اس کے سامنے کھلونوں کا ڈھیر پڑا تھا اور اس کے ننھے منے سے، پیارے پیارے سے ہونٹوں پر بڑی خوبصورت سی مسکراہٹ تھی۔" کاشف یوں ڈوبا ڈوبا سا بول رہا تھا جیسے اب بھی اس کی نگاہیں وہی نظارہ دیکھ رہی تھیں۔

"گڑیا میری تھی — اور وہ میرے بغیر اور کسی دوسرے کی گود میں بھی خوش رہ سکتی تھی — جانے مجھے کیا ہو گیا تھا — یکایک ہی بہت غصہ آ گیا تھا۔ اس وقت — سچی امی! مجھے اب بھی وہ وقت اچھی طرح یاد ہے — میں نے غصے میں پھنکارتے ہوئے اس کا بازو پکڑ کر ساجدہ خالہ کی گود سے اسے کھینچ لیا تھا اور ساتھ بڑی تلخی سے بولا تھا — "اللہ میاں نے یہ گڑیا صرف میرے لیے بھیجی ہوئی ہے۔" اور جب جواب میں اُنہوں نے کہا تھا کہ نہیں ان کے آثم کے لیے بھیجی ہے تو میرے تن بدن

میں اک آگ سی لگ گئی تھی۔ کون ہوتی ہیں وہ میری گڑیا کو کسی اور کا کہنے والی ۔؟
میں اپنی گڑیا کو گھسیٹتا ہوا اسی وقت ان کی نگاہوں سے دور ہٹا لینے کے لیے کمرے
سے باہر لے گیا تھا ۔

امی کی آنکھوں میں ماضی کے روشن سائے لہرا رہے تھے ۔

"کیسے اس دن کی وہ چھوٹی سی بات اک اتنا بڑا بندھن بن گئی ۔"

"ہاں امی! عجیب سی بات ہے نا ۔۔۔ آتم کے نام سے پھر مجھے چڑ سی ہو گئی۔ بلکہ
صاف کہوں کہ دل ہی دل میں میں اس سے نفرت کرنے لگا تھا اور اب ۔۔۔ خود اپنے
ہاتھوں سے اور بڑی ہنسی خوشی کے ساتھ اپنی گڑیا کو اس کے حوالے کرنے کو تیار ہوں ۔"

"دنیا اسی کا نام ہے بیٹے ۔ ۔!"

اور امی! نہ صرف یہ کہ کسی زبردستی یا مجبوری کے تحت اپنی عزیز ترین ملکیت
کو اب اس کے سپرد کروں گا بلکہ خود وہ مجھے اتنا عزیز ہو چکا ہے کہ جب کبھی اپنے
لیے کوئی دعا مانگتا ہوں تو دل سے پہلے اس کے لیے نکلتی ہے ۔ نہ آج تک میں نے
اسے دیکھا ہے نہ ہم دونوں میں کوئی رابطہ یا تعلق کبھی رہا ہے مگر ۔۔۔ شاید گڑیا
کے ناطے ۔ ہاں گڑیا کی ہر چیز مجھے ہمیشہ بڑی عزیز رہی ہے ۔"

"لو ۔۔۔ باتوں باتوں میں پتہ ہی نہیں چلا ۔ دیکھو تو کتنی ساری روٹیاں پک گئیں ۔"

"گڑیا کب آئے گی امی ۔۔۔؟"

"جاؤ تو ذرا ۔۔۔ تم ہی کوثر کو آواز دو کہ اسے ادھر بھیج دے ۔"

"امی! اب گڑیا ماشاء اللہ کافی بڑی ہو گئی ہے ۔ اتنی اتنی دیر تک اسے ہمسایوں
کے گھر رہنے کی اجازت نہ دیا کریں ۔"

"کبھی کبھار جاتی ہے بیٹے ۔ ۔ ! کوثر اس کی ہم عمر ہے نا ۔"

"مگر امی! زمانہ بڑا خراب ہے ۔ کسی پر بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے ۔"

"ذرا سی تو ہے ابھی ۔" امی نے لاپرواہی سے سر جھٹک دیا ۔

"ابھی سے اس پر پابندیاں لگانا شروع کر دوں ۔ کمال کرتے ہو تم بھی ۔"

"امی! تیرہ سال کی وہ ہو گئی ہے ۔" کاشف نے گویا انہیں کسی حقیقت کا احساس
دلانے کی کوشش کی ۔" اور ۔۔۔" پھر وہ ذرا سا جھجک کر بولا ۔" میری گڑیا خوبصورت
بہت ہے امی ۔ ! ساری دنیا سے نرالی ۔۔۔ ہمیں اس کی بڑی حفاظت کرنا ہو گی ۔"

"تم تو خواہ مخواہ ہر بات کو ، ہر مسئلے کو اتنا سنجیدہ بنا لیتے ہو ۔"

"لیکن یہ مسئلہ امی ! ۔ ۔ ۔ ۔" اور ۔۔۔ اس کا فقرہ نامکمل ہی رہ گیا ۔ بیرونی
دروازے پر بڑے زور زور سے دستک ہو رہی تھی ۔

"جا دیکھ کون آیا ہے ۔ ۔؟ اور ساتھ دھنک کو بھی آواز دے لینا ۔ روٹی
ٹھنڈی ہو جائے گی ۔"

کاشف کسلمندی سے انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ کر دیکھنے چل دیا ۔

"کون ہے بھئی ۔۔؟" ایک کواڑ کھول کر اس نے سر باہر نکالا ۔

"ارے شہزاد تم ۔۔۔ ! یہ اتوار کے دن اور اس وقت ۔۔۔؟"

"کھانا کھا چکے ہو ۔۔۔؟" بغیر سلام دعا کے اس نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا ۔

"اندر تو آؤ ۔" کاشف مسکرا دیا ۔

"بتاؤ نا ۔۔۔ اگر کھا چکے ہو تو واپس جاؤں ۔"

"واپس کیوں ۔۔؟"

"بھوک بہت لگی ہے ۔ جا کر کسی ہوٹل کی خاک پھانکوں ۔"

"مرغوں چرغوں کو خاک کہتے ہو ۔ ؟" کاشف نے قہقہہ لگایا ۔

"خاک ہی کھاتا ہوں ۔ ورنہ جو ماں کے پاس بیٹھ کر اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانے میں مزہ ہے وہ ہوٹلوں کے مرغوں چرغوں کا تو نہیں نا۔"

"تو آجاؤ پھر۔ چولھے کے پاس بٹھا کر، ماں کے ہاتھ کا گرما گرم کھلاؤں۔"

"نہیں بھئی انھیں تکلیف۔"

"ارے تکلیف کے بچے ۔۔ !" کاشف نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دروازے کے اندر کھینچ لیا۔ وہ اس کا بہت گہرا اور مخلص دوست تھا!

"کون آیا ہے کاشی ۔۔ ؟" امی نے باتوں کی آواز سُنی تو وہیں سے پوچھا۔

"امی! یہ شہزاد آیا ہے اور حسبِ معمول فاقے سے ہے۔"

"سو بار آئے۔ آجاؤ بیٹے ۔ یہیں آجاؤ ۔" انھوں نے جلدی جلدی اس کے لیے جگہ بنائی۔

"آداب ۔۔ !"

"جیتے رہو ۔ سکھی رہو۔" امی دعائیں دیتے ہوئے میز پر جلدی جلدی پلیٹیں اور چپاتیاں وغیرہ رکھنے لگیں۔

"دراصل امی! ہوسٹل کا کھانا اچھا نہیں ہوتا۔ میں اس لیے روز روز آجاتا ہوں ۔"

"ہائے ہائے تو پھر کیا ہوا ۔۔ ؟ اپنا نصیب کھاتے ہو ۔۔ ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی بیٹے ۔۔ !" امی کو شہزاد کی انہیں امی کہنے والی ادا بہت بھایا کرتی تھی نہال نہال ہو جاتیں۔

"دھنک کو بلایا ہے یا نہیں ۔۔ ؟" شہزاد کو جواب دینے کے بعد وہ کاشف سے مخاطب ہوئیں ۔

"اوہ ۔۔! شہزاد کے ساتھ باتوں میں لگ کر ادھر ہی چلا آیا۔"

"چل پھر جا اسے آواز دے ۔" کاشف پھر باہر نکل گیا۔

"لو بیٹے! اتنی دیر تم کھانا شروع کرو۔"

"لائیے امی! کچھ تو پہلے ہی میرا بھوک کے مارے بُرا حال تھا اوپر سے یہ گرم گرم چپاتیاں دیکھیں اور نتھنوں میں مصالحہ جات کی تیز سی خوشبو گھسی تو بس ۔ صبر و قرار رخصت ۔۔" اور وہ بیٹھ کر، بڑی بے تکلفی سے دونوں بہن بھائی کا انتظار کئے بغیر کھانا کھانے لگا۔

"واہ واہ امی! آپ کے ہاتھ کا کھانا تو بس ایسے ہوتا ہے جیسے جیسے۔" وہ لقمہ چباتے ہوئے مثال دینے کے لیے کچھ سوچ رہا تھا۔

"من و سلویٰ ۔" کاشف نے اندر آتے ہوئے اس کی بات مکمّل کر دی۔

"ہاں ہاں ۔ ایسے ہی ۔"

"ہاں ہاں کا بچہ ۔ میری ماں کو مسکہ لگانے کی ضرورت نہیں ۔ بے شک روز آکر کھا لیا کرو ۔"

"ہاں شہزاد بیٹے! کھانا تم یہیں کھایا کرو۔"

"امی! میرا دل پہلے ہی ہوسٹل کے کھانے میں نہیں لگتا، آپ یہاں کی دعوت دے کر اور اُچاٹ کرنے لگی ہیں۔"

"میں پورے خلوص اور سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں بیٹے ۔۔!"

"سوچوں گا ۔" اور سر جھکا کر وہ جلد جلد کھانے لگا ۔۔

"دھنک نہیں آئی ۔۔ ؟"

"آگئی امی جی ۔۔ آگئی ۔" دھنک ہانپتے ہوئے اندر آگھسی۔

"تمہارا دوپٹہ پھر غائب ہے — بھائی مارے گا —" امی نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھتے ہوئے دبی دبی سی آواز میں کہا۔ پچھلے کتنے ہی عرصہ سے یہ احساس دلانے کی کوشش کی جارہی تھی کہ وہ اب بڑی ہوگئی تھی مگر اس کوڑھ مغز کے دماغ میں کوئی بات بیٹھتی ہی نہ تھی —

"اوں امی —!" وہ کاشف کے ساتھ ہی بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میری بات سنی نہیں —؟" امی نے غصہ بھری نگاہ سے پھر اس کی طرف دیکھا —

"اچھا —!" وہ پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔

"امی! گڑیا کے ساتھ ذرا نرمی سے پیش آیا کریں — اس کے ساتھ کوئی بھی سخت لہجے میں بات کرے تو مجھے بُرا لگتا ہے۔"

"تمہیں نے اسے سر چڑھایا ہوا ہے۔ دیکھتے نہیں۔ لوٹھا کی لوٹھا ہوگئی ہے — اور لاپرواہ اتنی ہے کہ . . . ."

"سمجھ جائے گی امی —!" اب پاس سے شہزاد بولا۔

امی جلدی سے چپ ہوگئیں — انہیں شاید احساس ہوگیا تھا کہ ان کے درمیان کوئی غیر بھی بیٹھا تھا۔

"ہاں ہاں سمجھ جائے گی — بچی ہی تو ہے —" کاشف نے جیسے بات ختم کردی

جس طرح امی نماز پڑھنے کے وقت ململ کا سفید دوپٹہ لیا کرتی تھیں اسی طرح اوڑھنیں کا یہ بڑا سا دوپٹہ لیے اسی لمحے دھنک اندر آگئی — اس کا حلیہ دیکھتے ہی بے اختیار کاشف کی ہنسی چھوٹ گئی۔ شہزاد بھی ہنسنے لگا۔

"دیکھ لیجئے امی! دونوں ہنس رہے ہیں۔" دھنک بسوری۔

"چل ہنسنے دے۔ تیرا کیا بگڑتا ہے —" امی خود بھی زیرِ لب مسکرا رہی تھیں۔ "لے تو بیٹھ کر کھانا کھا۔"

"یہ کاشی جی مجھے بیٹھنے کے لیے جگہ نہیں دیتے —" وہ روٹھ کر پرے جا کھڑی ہوئی —

"ارے ارے! کب میں تجھے جگہ نہیں دے رہا۔ تُو تو —" پھر وہ لہک لہک کر ترنم کے ساتھ گانے لگا۔ "لاکھوں کروڑوں میں، اربوں میں، کھربوں میں، میری ایک بہنا ہے۔"

آنکھوں میں کئی سمندروں کی گہرائیوں جتنا پیار سمیٹے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ کھانا کھاتے ہوئے مسکرا مسکرا کر بھائی کی تانیں سُن رہی تھی۔

یکایک۔ نہ جانے کیا ہوا — اس نے منہ کے پاس لے جاتے لے جاتے نوالہ واپس پلیٹ میں پٹخ دیا۔ "میں نہیں کھاتی۔"

"کیوں —؟ گڑیا کیا ہوا؟" کاشف بے قرار سا ہوکر پوچھنے لگا۔

"یہ آپ کا شہزاد میرے نوالے گن رہا ہے۔ میں اس کے سامنے نہیں کھاؤں گی۔"

"میں — میں — نہیں تو — نہیں تو —" شہزاد گھبرا گھبرا کر صفائی پیش کرنے لگا — پیشانی یکدم عرق آلود ہوگئی۔ ساتھ اسے صاف کر رہا تھا۔

امی اور کاشف دونوں ہی ہنس پڑے۔

"یقین کیجئے میں بالکل نہیں گن رہا تھا اس کے نوالے۔" وہ بےحد بوکھلایا ہوا تھا۔ خجالت کے مارے زبان سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

"پھر اتنے غور سے مجھے کھانا کھاتے ہوئے دیکھ کیوں رہے تھے۔؟"

دھنک چیخ کر بولی۔

"تمیز سے ۔" امی نے اسے گھورا۔

"نہیں نہیں ۔ میں تو ویسے ہی ۔" شہزاد مزید صفائی کے لیے جانے کیا کہنے لگا تھا کاشف نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ارے چھوڑو یار! کس کی باتوں میں آ گئے ۔ یہ تو ہے ہی پگلی! تم خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہے ہو۔" کاشف شہزاد کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا "کھانا کھا چکے ہو تو آؤ ہم اپنے کمرے میں چلیں۔"

شہزاد خفیف سا نادم سا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"لو میری گڑیا رانی! اب تم بیٹھی بے شک شام تک کھاتی رہنا۔ کوئی تمہارے نوالے نہیں گنے گا۔" کاشف باورچی خانے سے نکلتے نکلتے اس کے بکل مارے سر پہ ایک پیار بھری چپت لگاتا گیا۔

"دیکھئے امی! یہ کاشی جی مجھے مار کر گئے ہیں۔"

"چل اب چپ کر کے کھانا کھا۔" امی طیش بھری آواز میں بولیں۔

"کتنا آج اس بیچارے کو شرمندہ کیا ہے تو نے۔"

"امی جی! میں سچ کہہ رہی ہوں ۔ وہ مجھے کھانا کھاتے ہوئے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔"

"تمیز سے بات کر۔ تیرے بڑے بھائی کا دوست ہے۔ اور عمر میں تو شاید کاشف سے بھی کچھ بڑا ہی ہو۔" امی تو اُلٹے ہوئے باقی چیزیں سمیٹنے لگیں ۔

"اتنی بڑی ہو گئی ہے ۔ جانے کب عقل آئے گی۔ کل کلاں کو اگلے گھر بھی جانا ہے۔ ارے ہاں یاد آیا۔" بڑبڑاتے بڑبڑاتے امی یکایک چونکیں اور پھر بلند آواز میں

کاشف کو پکارنے لگیں۔

"کیا بات ہے امی ۔ ؟" کاشف واپس آ گیا۔ "ارے تو ابھی تک کھا ہی رہی ہے۔" پہلی نگاہ اپنے مرکز پر ہی پہنچی۔

"میں آپ سے بالکل نہیں بولتی ۔ آپ نے اس کی حمایت میں مجھے پاگل کہا تھا۔" وہ روٹھی روٹھی سی بیٹھی کھانا کھاتی رہی۔ کاشف ہنسنے لگا۔ "تو جھوٹ تھوڑا کہا تھا۔" پھر وہ امی سے مخاطب ہو گیا۔ وہ ابھی تک چیزیں اِدھر اُدھر رکھ رہی تھیں۔

"امی! مجھے کیوں بلا رہی تھیں ؟"

"وہ ۔ کل اس کی ساس کا خط آیا تھا۔ پڑھا تم نے ؟"

"نہیں تو ۔ ؟ کوئی ضروری بات ہے ۔ ؟" ساتھ ہی کاشف نے امی کی نظر بچاتے ہوئے گڑیا کی بکل کے نیچے ہاتھ ڈال کر اس کے بالوں کی ایک لٹ کھینچ دی۔ "ایک تو اس کی ساس نے خط بھیج بھیج کر ہمیں تنگ کر چھوڑا ہے۔" وہ اسے چھیڑنے کے لیے بڑبڑایا۔

"نہیں بیٹے! تنگ، کیوں ۔ ؟ ہمیں تو ان کی ایسی قدردانی پہ خوش ہونا چاہیے ۔ آ تم جیسا رشتہ ہمیں دھنک کے لیے اور کوئی نہ ملے گا۔ ایسے پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے اور امیر لوگ ہیں۔ پھر آ تم جو شہزادوں ایسا خوبصورت ہے۔"

"امی! میری گڑیا بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ ایسی پیاری اور بھولی بھالی لڑکی خالہ ساجدہ کو بھی اور کوئی نہیں مل سکتی۔ قدر کیوں نہ کریں گی ۔" خلافِ معمول آج دھنک خاموش بیٹھی تھی۔ اسے چھیڑنے کے لیے کاشف پھر مسکرایا۔

"میں ایسی لڑکی کی اگر ساس ہوتی نا تو ابھی سے اسے اُٹھا کر لے جاتی اپنے

گھر ـــ "

"کیوں ـــ ؟" جانے کس ضبط سے وہ اب تک خاموش بیٹھی تھی ۔ مگر اب رہ نہ سکی ـــ بھڑک کر بولی "مجھے کیوں اُٹھا لے جاتی ۔ میں تو اپنے کاشی جی کو چھوڑ کر کہیں بھی نہ جاؤں ـــ"

"اور ایک دن تمہارا کاشی خود ہی تمہیں دوسرے گھر بھیجنے کو بے تاب ہو جائیگا" امی مسکرائیں ۔

"چھوڑیئے امی ! اس ذکر کو ـــ" دھنک نے ایسی بات کہہ دی تھی کاشف دل گیر سا ہو گیا ـــ "یہ بتائیے خالہ ساجدہ نے خط میں کیا لکھا ہے ؟"

"کوئی خاص بات نہیں ـــ میں نے تو صرف اس لیے ذکر کیا تھا کہ بڑی ہی قدر کرنے والے لوگ ہیں ۔ میں جواب دوں یا نہ دوں ۔ ان کا خط ضرور تیسرے دن آجائے گا ۔ جس میں دھنک کی خیر خیریت پوچھی ہوتی ہے ۔ بڑا خیال رکھتے ہیں ـــ"

"جی ہاں ـــ" کاشف زہر خند سے بڑبڑایا "ہماری کل کائنات لوٹ لینے کو تیار بیٹھے ہیں اور ہمارا خیال رکھتے ہیں ۔ ہماری رونقیں اپنے دامن میں بھر لینے کے منتظر بیٹھے ہیں اور ہماری قدر کرتے ہیں ـــ" وہ بڑبڑاتے ہوئے باورچی خانے سے باہر نکل گیا ۔

"ارے ہاں یاد آگیا کاشی ـــ !" امی پھر پیچھے سے بولیں تو وہ واپس آگیا ۔

"آثم کی آج کل میں کھنچوائی ہوئی تصویر انہوں نے بھیجی ہے ۔ ماشاءاللہ بہت جوان ہو گیا ہے ـــ" پھر امی زیرِ لب مسکرائیں ۔ "اور خوبصورت بھی بہت ہے ـــ"

دھنک سر جھکائے بیٹھی جانے اب کیا کر رہی تھی ۔ ایک نظر ماں کو دیکھنے کے بعد کاشف نے اس کے جھکے ہوئے سر پہ آہستہ سے اِک دھول جمائی "مجھے بھی تو اپنے اس کی تصویر دکھا ـــ"

"اوں اوں ـــ" دھنک کسمسا کر، شرما کر کچھ اور جھک گئی ۔

"ارے ـــ !" کاشف نے حیرت سے اس کا یہ انداز دیکھا ۔ تو سچ مچ اس کی گڑیا اب جوان ہوتی جا رہی تھی ـــ اس نے دل ہی دل میں سوچا ـــ ورنہ پہلے کاشف آثم کی کوئی بات کیا کرتا تھا تو وہ بجائے شرمانے لجانے کے ڈھیر ساری باتیں اسے بنا ڈالا کرتی تھی ـــ اور آج ـــ وہ شرما کر چپ ہو گئی تھی ۔ نہ صرف جسمانی لحاظ سے بلکہ وہ ذہنی طور پر بھی جوان ہو رہی تھی ـــ "اسے ہے ـــ اس کے پاس تھوڑی ہے تصویر ـــ میرے کمرے میں میز پر ہے ـــ جا کر دیکھ لینا ـــ اور ہاں ـــ" وہ پھر اس کے قریب ہوتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہنے لگیں ـــ "انہوں نے گڑیا کی بھی تصویر مانگی ہے ـــ کسی دن اچھی سی اُتروا دینا ـــ"

"انھیں بھیجنے کے لیے تصویر ـــ" کاشف لمحہ بھر کے لیے جھجکا ـــ پھر ہولے سے بولا ـــ "امی ! میں اس کا بھائی ہوں ـــ بہن کی تصویر اُتروا کر بھیجتا اچھا لگوں گا ؟"

"لو اور سنو ـــ" امی اس کی بات پہ ہنس دیں "یہ تو سلدا زمانہ جانتا ہے کہ دھنک آثم کی بچپن کی منگیتر ہے ۔ ہر سال عید بقر عید پہ تحفے تحائف اس کے لیے آئیں ـــ ہر تیسرے دن خط ان کا آئے ۔ ہر سال دو سال بعد آثم کی تصویر وہ بھیجیں تو کیا ان کا کوئی حق ہی نہیں ـــ یہ منگنی نہیں نکاح ہی سمجھو کاشی ! بلکہ نکاح سے بھی کوئی زیادہ مضبوط رشتہ ـــ تصویر بھیجنے میں کیا حرج ہے ؟"

"جیسی آپ کی مرضی امی ـــ ! شہزاد کے پاس کیمرہ ہے ۔ کسی دن اس سے لے کر فلم ڈلوا لوں گا ـــ"

"ہاں ضرور ـــ اتنے سالوں میں پہلی بار انہوں نے کوئی خواہش کی ہے ۔

ورنہ وہ تو خود اتنے انصاف پسند ہیں کہ کبھی کوئی ناجائز مطالبہ اُنہوں نے نہیں کیا۔ اس کے سسر تو بہت ہی اللہ محمدؐ کو جاننے ماننے والے ہیں ۔۔ اور اس کی ساس شوہر سے پوچھے بغیر کبھی کوئی قدم نہیں اُٹھاتی ۔۔ تصویر لینا نامناسب نہیں لگا ہوگا ۔"

"اچھا امی اچھا ۔۔" وہ جیسے قائل ہو گیا ۔ پھر اس نے چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی دھنک پر ایک نگاہ ڈالی ۔۔ کوئی شرارت کرنا چاہتا تھا مگر ۔۔" امی! اس کے پاس ڈھنگ کا کوئی دوپٹہ نہیں ہے؟ آپ کا لیے بیٹھی ہے ۔۔ بالکل اک ننھی سی بڑھیا لگ رہی ہے ۔"

" تو اور کیا کاشی جی!" وہ جلدی سے کھڑی ہو کر بسورتے لہجے میں بھائی کے آگے شکایت کرنے لگی "جب بھی آپ مجھے دوپٹہ لینے کو کہتے ہیں یہ امی مجھے اپنا دے دیتی ہیں ۔ اسی لیے میں نہیں لیتی ۔ پھر سب مذاق کرتے ہیں ۔"

"کیوں امی ۔۔؟"

"وہ بیٹے ۔۔!" امی قدرے بوجھل سی آواز میں بولیں "کرایہ داروں نے کرایہ نہیں دیا ورنہ لے دیتی ۔"

" اور گھر کا خرچ ۔۔؟"

" اللہ مالک ہے ۔"

"تب بھی آپ تصویر اترنے کا کہہ رہی تھیں ۔۔؟"

" بھرم بھی تو قائم رکھنا ہوا ۔۔ انھیں ہمارے حالات کا کوئی علم نہیں ۔ اور بیٹی کی سسرال کے سامنے میں ہلکا ہونا نہیں چاہتی ۔"

" اوہ ۔۔!" کاشف سوچوں میں ڈوبا ڈوبا خاموشی سے باورچی خانے سے باہر نکل گیا ۔

○

آثم البم کھولے بیٹھا تھا ۔

" ابا میاں! بھلا میں کون ہوں ۔۔؟"

"کون ہو ۔۔؟ مجھے تو لگتا ہے دھنو چمارن ہو ۔"

" ناہیں ۔۔ ناہیں ۔۔"

" پھر گلابو کی ذکیہ ہو گی ۔۔؟"

" وہ بھی نہیں ۔۔ وہ بھی نہیں ۔۔"

" آثم تم ہو ۔۔؟" وہ آنکھوں پر ٹکے ننھے منے ہاتھوں کو بڑے پیار سے، بڑی شفقت سے ٹٹولنے لگے ۔

" ابا میاں! میں تو یہاں ہوں ۔۔ یہ سامنے ۔۔ اور آپ کی آنکھیں تو صنم نے بند کی ہوئی ہیں ۔"

یکایک ابا میاں کی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے وہ آثم کی طرف لپکی ۔ "تمہیں کس نے کہا تھا کہ بتاؤ ۔۔" غصے سے اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا " ابا میاں! آپ اسی کو سمجھا دیں ۔ ہمارا کھیل نہ خراب کیا کرے ۔ اتنا اچھا ہم دونوں کھیل رہے تھے ۔"

" ہونہہ اتنا اچھا کھیل رہی تھیں،" آثم نے منہ بگاڑ کر اس کی نقل اُتاری ۔

"ابا میاں کو بھلا پتہ نہیں تھا کہ یہ تم ہو۔"

"بالکل نہیں معلوم تھا۔ ورنہ فوراً بتا دیتے۔ ارے اثمی؟" یکایک وہ چونکی۔ سارا غصّہ یکدم معدوم ہو گیا۔ اپنی ہی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں پکڑے کیمرے کو دیکھنے لگی۔ "یہ کیمرہ ہے نا۔؟"

"ہاں۔"

"کہاں سے لیا۔؟"

"پاس ہونے پر ابّا میاں نے تحفہ دیا تھا۔ یاد نہیں۔ ابھی کل پرسوں ہی کی تو بات ہے۔"

"میری تصویر اُتارو گے نا۔؟"

"نہیں۔" اس نے کورا جواب دے دیا۔ "ایسی فضول قسم کی لڑکی کی تصویریں اُتارنے کے لیے یہ کیمرہ نہیں ہے۔"

"میں فضول لڑکی ہوں۔؟" وہ زور سے چیخی۔

"تو اور کیا۔؟" وہ بڑی بے نیازی سے زیرِ لب مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ صنم وہیں کھڑی زور زور سے رونے لگی۔ ابّا میاں چپ چاپ بیٹھے بڑی دلچسپی سے ان کی باتیں سُن رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔

"ابّا میاں میں فضول لڑکی ہوں۔؟" وہ روتے ہوئے ابّا میاں کے پاس چلی گئی۔

"کون کہتا ہے بیٹی۔؟" اپنی مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر اُنہوں نے چہرے پر سنجیدگی طاری کر لی۔

"یہ اثمی کہتا ہے کہ میں فضول لڑکی ہوں۔"

"اثمی خود فضول ہے بیٹی۔!" وہ اسے گود میں بٹھا کر پیار کرنے لگے۔

"تو تو میری بے حد اچھی بیٹی ہے۔"

"اثمی فضول ہے۔ آہا جی! اثمی فضول ہے۔" وہ خوش خوش ابّا میاں کی گود سے نکلی اور تیزی سے آثم کے کمرے میں جا گھسی۔

"ابّا میاں کہتے ہیں کہ تم فضول ہو۔" وہ جھگڑا کرنے کے انداز میں اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ غصّے سے چہرے پر جلال چھایا ہوا تھا۔

"چلو جانے دو غصّہ۔ یا دونوں فضول۔ یا دونوں ہی بے فضول۔" وہ اس وقت لڑائی کے موڈ میں بالکل نہ تھا۔ ہنستے ہوئے اور پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے صلح و آشتی کے لہجے میں بولا۔

"چلو ٹھیک ہے۔" وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ "اب سچ سچ بتاؤ میری تصویر اُتارو گے نا۔؟"

"پاگل! پاگل!!" آثم نے دانت کٹکٹا کر اس کی ربن میں جکڑی ننھی سی پونی ٹیل کھینچ لی۔ "یہ کیمرہ میں نے ابّا میاں سے کہہ کر اور بھلا لیا کس کے لیے ہے؟"

"سچی۔؟" وہ خوشی میں بے قابو سی ہوتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔

"بالکل۔ اور ابھی ابھی میں تمہاری ایک تصویر اُتار بھی چکا ہوں۔"

"کب۔؟"

"جب تم نے ابا میاں کی آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔"

"دکھاؤ۔ مجھے بھی دکھاؤ۔"

"بیوقوف! احمق؟! ابھی سے کیسے دکھا دوں۔ پہلے یہ ساری تصویریں اُتریں گی۔ پھر فلم دھلنے جائے گی۔ تب تمہیں یہ تصویر دیکھنے کو ملے گی۔"

وہ کتنی خوش ہوئی تھی اس وقت!! اس کی صورت دیکھنے کے قابل تھی۔ خوشی سے کندنی چہرہ دمک رہا تھا۔ پتلے پتلے ننے منے سے گلابی ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں عجیب سی چمک۔۔!

صنم کی امی ابا میاں کی وہی تصویر اس کے سامنے تھی اور سارا واقعہ اسے یاد آ رہا تھا۔ پھر اس کیمرے سے سبھی تصویریں صنم ہی کی کھینچی گئیں۔ آثم کو فوٹوگرافی کا بہت شوق تھا اور اپنا اس کا کوئی بہن بھائی بھی نہ تھا۔ یوں سارے شوق، سارے ارمان صنم کی ذات سے ہی پورے ہوتے۔

وہ صرف سات سال کا تھا جب صنم کے ڈیڈی نیازی صاحب نے ان کے ساتھ والی کوٹھی خریدی تھی اور اس میں رہائش پذیر ہوئے تھے۔ بیگم نیازی اور امی بیگم کے مزاج ایک دوسرے سے ایسے ملے کہ آپس میں قریبی عزیزوں سے بھی زیادہ گہرے مراسم ہو گئے۔

طبیعتوں کے علاوہ ان دونوں خاندانوں میں روز بروز بڑھنے والی محبت کی وجہ صنم تھی۔ خود ان کے ہاں آثم کے بعد اوپر تلے تین لڑکیاں پیدا ہوئیں لیکن زندگی کی نعمت کوئی بھی نہ پا سکی۔ یوں ابا میاں اور امی بیگم کی لڑکی کی خواہش صنم کے ننھے سے وجود نے بڑی حد تک پوری کر دی۔

بیگم نیازی پھر امید سے تھیں ۔۔۔ ان کی طبیعت اکثر خراب رہتی تھی۔ اس عالم میں صنم کو ماں سے پوری توجہ نہ ملتی تو وہ امی بیگم کے پاس چلی آتی۔۔ اور امی بیگم کی گود تو ہر وقت ایسی ہی ننھی سی لڑکی کے وجود کو ترستی رہتی تھی۔

پھر اس کے سارے کام وہی کرتیں ۔۔۔ اسے نہلاتیں ۔۔۔ اس کا لباس تبدیل کرتیں ۔۔۔ اس کے لیے بسکٹوں کے پیکٹ سنبھال سنبھال رکھتیں۔۔ اس کے لیے

میٹھے، نمکین پکوان تیار کرتیں۔ یوں ان کا سارا سارا دن بڑی خوبصورت سی مصروفیت اور رونق میں گزرتا۔ ابا میاں دفتر ہوتے تھے، آثم سکول چلا جایا کرتا تھا۔ ان کی سارے دن کی تنہائیوں میں صنم نے بڑے خوبصورت رنگ بھر دیئے تھے۔

بیگم نیازی کے ہاں لڑکے کی شدید ترین خواہش کے باوجود دوسری بھی لڑکی ہی پیدا ہو گئی۔ یوں انجم کی پیدائش سے صنم کی قدر اپنے گھر میں کچھ اور گھٹ گئی اور ۔۔۔ خدا تو سب کا ہے نا ۔۔۔ ان کے گھر کی لڑکی کی محرومی کو صنم نے پورا کر دیا۔ امی بیگم کے بعد ابا میاں اور پھر آثم کی توجہ کا بھی وہ مرکز بن چکی تھی ۔۔۔ ان سب کے ہاتھ تو گویا چلنے پھرنے اور توتلی توتلی باتیں کرنے والا ایک ننا سا کھلونا آ گیا تھا۔

سکول کے بعد آثم کے وقت کا اک اک لمحہ اسی کے ساتھ گزرنے لگا۔

بچپن کا ساتھ بڑا سہانا اور خوبصورت سا ہوتا ہے۔ اب تک آثم اکیلا ہی رہنے کا عادی تھا مگر ۔۔۔ صنم کا تجربہ بڑا انوکھا اور نرالا ثابت ہوا۔۔۔ وہ تو اب سکول میں بھی اسی کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ کتنا مزہ آتا تھا اس کے ساتھ کھیلنے میں۔ پہلے بھی اس کی کوئی زندگی تھی ۔۔۔؟ اور زندگی تو جیسے وہ اب ہی گزارنے لگا تھا۔

پھر ۔۔۔ ایک دن ۔۔۔ وہ اپنی کوئی کاپی یا پنسل وغیرہ خریدنے لگا تو یکایک اسے صنم کا خیال آ گیا۔ اپنی ننی سی دوست کے لیے اس نے بچے ہوئے پیسوں سے ٹافیاں خرید لیں۔

وہ اپنے لیے اکثر چیزیں خود خریدا کرتا تھا مگر صنم کے لیے شاپنگ کرتے ہوئے عجیب سی خوشی اور ذمہ داری کا احساس جیسے اس کے اندر اترتا چلا گیا۔ یہ بڑا انوکھا احساس تھا۔ بڑا مسرور کرنے والا جذبہ ۔۔۔!

امیر الدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کم عمری میں بھی جیب خرچ کافی مل جاتا تھا۔۔۔

اب وہ سب کا سب صنم پر ہی خرچ ہونے لگا۔ سکول سے آتے ہوئے اس کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آنا وہ کبھی نہ بھولتا ۔۔۔ اپنی خوشی کے علاوہ وہ منظر بھی اسے بہت بھاتا جب وہ صنم کے حضور خریدی ہوئی چیزیں پیش کرتا ۔

گو اپنے گھر میں صنم کو کسی چیز کی کمی نہ تھی ۔۔۔ ڈیڈی کبھی خالی ہاتھ گھر میں نہیں آتے تھے مگر گھر میں آئی ہر چیز ممی کی تحویل میں پہنچتی تھی پھر اس کے حصے بخرے ہو جاتے تھے ۔ انجم سے ایک سال بعد ہی لڑکے کے شوق میں اس کے والدین ایک اور لڑکی کو جنم دے چکے تھے ۔

اور ۔۔۔ پوری کی پوری چیز پر واحد ملکیت کا احساس زیادہ خوشگوار تھا۔ آثم جو کچھ بھی لاتا ۔۔۔ زیادہ یا تھوڑا ۔۔۔ وہ سارے کا سارا صرف اور صرف اس کے لیے ہوتا ۔۔۔ ڈھیر ساری خوشی اسے بوکھلا سا دیتی ۔۔۔ اس کے گلابی رخسار دہک اُٹھتے۔ آنکھوں میں ستارے چمکنے لگ جاتے ۔۔۔ ننھے ننھے، گلاب کی پتیوں ایسے سرخ سرخ پتلے پتلے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے وا ہوتے مگر پھر صرف کپکپا کر رہ جاتے اور وہ بے اختیار و بے قابو ہو کر اس سے لپٹ جاتی ۔ چند لمحے بڑی خاموشی کے ساتھ اس سے لپٹے رہنے سے جس بھرپور انداز میں تشکر کا اظہار ہوتا تھا وہ کچھ کہہ دیتی تو شاید نہ ہو سکتا ۔ اس لمحے آثم کا سینہ جیسے رنگ برنگی روشنیوں سے بھر بھر جاتا۔ یہ صنم کا وجود، کتنی ڈھیر ساری مسرتوں کا آئینہ دار تھا۔ سارے گھر بھر کے لیے ہی۔

" اثمی ! کل بھی میرے لیے کچھ لے کر آؤ گے نا ۔۔۔ ؟" کافی دیر بعد لمبے لمبے اور غیر ہموار سے سانس لیتے ہوئے وہ سیدھی ہو کر پوچھتی ۔۔۔

" ہاں ۔۔۔ !" اثمی کو بھلا ایسا خوبصورت بدل اپنی رقم کہیں اور خرچ کرنے سے مل سکتا تھا ۔۔۔ !

" مگر ایک شرط ہے ۔ ؟"

" کیا ؟"

" بس ! تم زیادہ تر ہمارے گھر میں ہی رہا کرو ۔" اور بھولا اور معصوم آثم یہ نہیں جانتا تھا کہ اپنے گھر میں رکھنے کے لیے اسے تو کوئی رشوت وغیرہ پیش کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی ۔۔۔ اسے تو خود اپنا گھر اب کاٹ کاٹ لیتا تھا ۔ وہ تو بمشکل رات ہی وہاں گزارتی تھی ۔۔۔ اس کا بس چلتا تو وہ رات بھی انہیں کے گھر میں، آثم کی ننھی منی کہانیاں سن کر اور امی بیگم کے نرم گرم سینے میں چہرہ گھسا کر گزار لیتی۔ تمام تر خواہشوں کے باوجود اپنی امی کا تو قرب ہی اسے کم نصیب ہوتا تھا۔ وہاں تو اس کے دل میں مچلنے والی ہر تمنا کا گلا گھونٹنے کو ایک نہیں دو دو چڑیلیں ہر وقت موجود رہتی تھیں ۔۔۔ اور یہاں ۔۔۔ ابا میاں ، امی بیگم اور اثمی ۔۔۔ ہر ایک کی محبت اور توجہ کا وہ واحد مرکز تھی ۔۔۔ یہاں کوئی حسد یا جلن کا جذبہ سینے میں نہیں اُبھرتا تھا ۔۔۔ یہاں تو سکھ ہی سکھ تھا اور مزے ہی مزے تھے ۔

دس گیارہ سال کا عرصہ اسی طرح بیت گیا ۔۔۔ لڑکے کا شوق ان کے گھر میں لڑکیاں ہی لڑکیاں لیے آ رہا تھا ۔ اب وہ پانچ ہو چکی تھیں ۔۔۔ زیادہ لڑکیوں کی وجہ سے نیازی صاحب کے گھر میں اس کی قدر روز بروز کم ہو رہی تھی اور ادھر وقت اور توجہ اسے زیادہ سے زیادہ اس گھر کا کئے دے رہا تھا ۔

وہ اپنے والدین کی نسبت ابا میاں اور امی بیگم کو زیادہ اپنا سمجھتی تھی ۔ آثم اور وہ تو جیسے بلا شرکتِ غیرے ایک دوسرے کے تھے ۔۔۔ اس کا زیادہ وقت آثم کے ساتھ گزرتا تھا ۔ آثم کے پاس ۔۔۔ آثم کی نگاہوں کے سامنے ۔۔۔ بالکل گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے ۔۔۔ ایک عام سا فرد بھی نہیں ۔۔۔ ہر ایک کی توجہ کا مرکز

جب وہی تھی ۔۔۔ تو ۔۔۔ اس کے دو دو البم کیسے نہ اسی کی تصویروں سے بھرے ہوتے۔ ہر تصویر کے ساتھ کوئی نہ کوئی مزیدار واقعہ، کوئی نہ کوئی خوبصورت یاد وابستہ تھی۔ آثم اکیلا بیٹھا دیکھ رہا تھا اور یاد کر رہا تھا ۔۔۔ کبھی مسکراہٹ ہونٹوں پہ تیر جاتی۔ کبھی باقاعدہ زور زور سے ہنسنے لگتا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ۔۔۔؟" ایک جھپٹے کے ساتھ البم اس کے ہاتھوں سے چھین لیا گیا ۔۔۔ آثم نے نگاہ اُٹھائی۔ صنم البم تھامے کھڑی ہنس رہی تھی۔

"چڑیل ۔۔۔!" اک مصنوعی تیوری آثم نے پیشانی پر ڈالی ۔ "دے دو البم۔"

"نہیں دیتی ۔" وہ پرے ہٹ کر نیچے قالین پر جا بیٹھی۔

"البم بے شک تمہارا ہے ۔۔۔ لیکن تصویریں تو میری ہی اس میں ہیں نا۔" وہ اسے انگوٹھا دکھاتے ہوئے ایک ایک ورق اُلٹ کر دیکھنے لگی۔ "امی! یہ دیکھو۔" وہ اک دم بھاگ کر اس کے پاس صوفے پر جا بیٹھی۔ "اُس دن میرے کان چھدے تھے۔ میں رو رہی تھی۔" وہ ہنس ہنس کر آثم کے اُوپر گری جا رہی تھی۔ "اب یاد آتا ہے تو ہنسی آتی ہے ۔۔۔ روتی ہوئی میں کتنی عجیب لگتی تھی ۔۔۔؟"

"اور ہنستے ہوئے جیسے عجیب نہیں لگتیں۔" آثم اس کے ہنستے کھلکھلاتے پیکر کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے شوخی سے بولا۔

"کیا مطلب؟" وہ یکدم سنجیدہ ہو گئی۔

"مطلب یہ کہ ۔۔۔ تم ہو ہی ایک عجوبہ ۔۔۔ دُنیا کا آٹھواں عجوبہ۔"

"میں عجیب ہوں۔" اس نے غضب ناک ہوتے ہوئے لال انگارہ آنکھیں آثم کے چہرے پر گاڑ دیں۔ "یعنی کہ بہت خراب۔"

"اب آ گئے تم خود سوچ لو۔ کافی سیانی ہو۔" البم پھینک کر وہ اس سے گتھم گتھا

ہونے کے لیے آگے بڑھی۔ آثم ابھی اپنے دفاع کے لیے کچھ بھی نہیں کر پایا تھا کہ وہ اس کے ساتھ لپٹ گئی۔

"ہائیں ہائیں ۔۔۔ کیا کر رہی ہو ۔۔۔؟" جیسے بجلی کے کئی ننگے تار اسے چھو گئے تھے۔ اک زوردار جھٹکے کے ساتھ اس نے اسے پرے ہٹا دیا۔ "کچھ عقل کرو۔ کیا کر رہی ہو ۔۔۔؟"

وہ تو ہمیشہ یونہی لڑا جھگڑا کرتے تھے۔ اسی طرح ان میں اکثر ہاتھا پائی بھی ہو جایا کرتی تھی مگر کچھ عرصے سے ۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا ۔ صنم کا لمس اس کے سارے جسم میں عجیب قسم کی پھلجھڑیاں سی چھوڑ دیتا تھا۔

وہ تیرہ سال کی ہو گئی تھی اور خود وہ اٹھارہ کا شاید ۔۔۔ وہ بھی جوان ہو گیا تھا اور وہ بھی جوان ہو رہی تھی ۔۔۔ یہ احساس جہاں اس کے لیے بڑا عجیب سا تھا وہیں ایسی سوچوں کے ساتھ چپکے سے بہت سارے چور بھی دل میں آ گھستے۔ پہلے دن جب اسے یہ احساس ہوا تھا تو وہ ساری رات سو نہیں سکا تھا۔ دل کو بہت ڈھیر ساری پریشانیوں نے آن گھیرا تھا۔

وہ جوان ہو رہی تھی ۔۔۔ اب شاید اس کی ممی یوں کھلے بندوں آزادانہ اسے ان کے گھر نہ آنے دے ۔۔۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اس پر کوئی پابندی نہ لگاتے کہ وہ خاصے ماڈرن لوگ تھے ۔۔۔ تو ۔۔۔ تو امی بیگم یا ابا میاں ہی کوئی پابندی نہ لگا دیں۔ انھیں اکٹھے اُٹھنے بیٹھنے سے روکنے ٹوکنے نہ لگیں۔

اگر ایسا ہُوا ۔۔۔ اگر کوئی ایسی بات ہُوئی ۔۔۔ تو وہ کیا کرے گا؟ صنم تو جیسے اس کے وجود کا، اس کی زندگی کا اک بڑا ضروری جزو بن کر رہ گئی ہوئی تھی۔ اس کے بغیر تو جیسے نہ وہ خود مکمل تھا اور نہ اس کی زندگی ۔۔۔!

بابا آدم کی تنہائی کے لیے اللہ میاں نے اس کی پسلی سے اماں حوا کو پیدا کیا تھا۔ اسی طرح اسے لگتا اس کی تنہائی کا روگ کاٹنے کے لیے خدا نے صنم کو دنیا میں بھیجا تھا۔ اس کے بغیر تو وہ ایک دن کیا ایک لمحہ نہیں کاٹ سکتا تھا۔

کاش! وہ اتنی ہی رہتی — چھوٹی سی ہی — اسی طرح اس کے ویران گھر کی اور اس کے دل کی رونق بنی رہتی — وہ کیوں بڑھ رہی تھی —؟ وہ کیوں جوان ہو رہی تھی —؟ لیکن — لیکن — دوسرے ہی لمحے اس کے دل میں جنم لینے والے نئے نئے احساسات و جذبات دبے دبے سے لہجے میں بول اُٹھتے۔

اس کے بچپن کے ساتھی کو اس کی زندگی کی راہوں میں قدم قدم ساتھ ملانے کو اب جوان ہونا ہی چاہیے تھے۔ یہ شاید اس کے جوان ہونے والے دل کا تقاضہ تھا — اندر سے ایسی صدا اُٹھتی تو وہ بوکھلا سا جاتا۔

یہ سب کیا تھا —؟ یہ سب کچھ کیا تھا —؟ اتنی ڈھیر ساری سوچوں نے دماغ پہ یلغار کر دی تھی، کہ نہ ٹھیک طرح نیند آتی اور نہ کسی کل چین۔ جانے اسے کیا ہوتا جا رہا تھا —؟

"صنم! تجھے کتنی بار میں نے سمجھایا ہے کہ اب تم یوں لڑکوں کی طرح دھینگا مشتی نہ کیا کرو —" آتم نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیئے۔

"تو تمہارے ہی ساتھ لڑتی ہوں نا۔"

"میں نے کہا نا میرے بھی ساتھ نہیں —" اتنے ڈھیر سارے بچوں نے اس کی ماں کو اتنی فرصت ہی نہ شاید دی تھی کہ وہ اسے وقت اور عمر کے تقاضوں سے باخبر کرتیں۔ اور وہ بے حد معصوم تھی۔ ذرا بھی کوئی احساس نہیں تھا۔

"اور —" پھر اس نے بڑے غور سے اسے سر سے لے کر پاؤں تک گھورا۔

وہ اس کی بچپن کی ساتھی تھی — ماں کو کوئی دھیان نہیں تھا تو — اس پہ بھی تو کوئی فرض عائد ہوتا تھا۔ اسی فرض کے تحت بڑی مدھم سی آواز میں بولا —

"اب تم دوپٹہ لیا کرو صنو —!"

"وہ — وہ —" آتم کے اس فقرے نے اسے جانے کیا سمجھا دیا کہ کوئی ایسا مفہوم جو شاید پہلے کبھی اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ گھبرا کر فدیے سُرخ ہو کر اس نے آتم کے ہاتھوں سے اپنے دونوں ہاتھ چھڑا لیے۔

"ممی نے لے کر ہی نہیں دیا —" اس کی پلکیں بڑی تیزی سے اُٹھ رہی تھیں۔ گر رہی تھیں — اور وہ مجرمانہ انداز میں سر جھکائے کھڑی تھی۔

"تم نے ممی سے کہا تھا —؟" وہ بڑی دل چسپی سے اس کے لجائے، گھبرائے وجود کو تک رہا تھا — بڑے غور سے — آنکھوں میں بہت ڈھیر سارا پیار لیے — اس لمحے، اس انداز میں، وہ اسے ہمیشہ سے بہت زیادہ اچھی لگ رہی تھی — اس کی ننھی سی دوست —!

"مجھے تو بڑا شوق ہے مگر وہ ہمیشہ یہی کہتی ہیں کہ فیشن نہیں ہے۔"

"تو ٹھیک ہے — وہ اپنا فیشن اپنے پاس رکھیں — میں کل کالج سے آتے ہوئے تمہارے لیے ایک دوپٹہ لیتا آؤں گا — اوڑھو گی نا —؟"

"اتمی!" وہ معمول کی طرح پھر اس کے گلے میں بازو ڈالنے کے لیے آگے بڑھی — "ریشمی لانا — ایک نیلا — میرا نیلا بیل باٹم ہے اور ایک پیازی۔ پیازی میرا فراک ہے اور ایک —"

"اتنے ڈھیر سارے میرے پاس پیسے نہیں ہیں — لمبی سی فہرست بنانے لگ گئی ہو —" آتم نے مسکراتے ہوئے گلے میں حمائل ہونے سے پہلے ہی اس کے دونوں

بازو تھام لیے " اور اب ہر وقت میرے گلے میں باہیں بھی نہ ڈالا کرو "

" اوہ ۔۔! " صنم شرمندہ سی ہو کر پرے ہٹ گئی ۔

" ویسے تم جب میرے گلے میں ایسے بازو ڈالتی ہو، تو مجھے بُرا نہیں لگتا۔۔۔ صرف دوسروں ۔۔۔۔" اور آتم کی بات بھی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی، کہ چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ کر صنم وہاں سے بھاگ گئی ۔

" صنم ! صنو ۔۔! ! سنو تو ۔۔" آتم اسے آوازیں دیتا رہ گیا ۔ وہ رکی ہی نہیں۔

" ہائے ! اسے کیوں منع کر دیا ۔۔؟" آتم اپنے دل کے اس تقاضے پر مسکرا دیا۔

یہ اس کے قدم کس طرف اُٹھ رہے تھے ۔۔؟ وہ سوچنے لگا ۔ کہیں یہ راستہ غلط تو نہ تھا ۔ ؟؟

" نہیں نہیں ۔۔" یکایک دل نے جواب دیا ۔ منزل پانے کے لیے اس سے بہتر، ہموار اور صحیح راستہ اور کونسا ہوگا ۔۔؟؟

صنم بڑی پیاری تھی ۔ بڑی اچھی تھی ۔ بڑی معصوم اور بھولی بھالی تھی ۔

اس کے علاوہ ۔۔ ابا میاں اور امی بیگم کی محبتوں، چاہتوں اور توجہات کا بھی تو وہی مرکز تھی ۔۔!!!

پھر یہ راستہ غلط کیسے ہو سکتا تھا ؟ یہی اس کی منزل تھی اور یہی نشانِ منزل!!!

○

" گڑیا ۔۔! اے گڑیا ۔۔!! "

" جی کاشی جی آئی ۔۔ "

" دیکھ میری رانو ! میں تیرے لیے کیا لے کر آیا ہوں "

" کیا ۔۔؟ " خوبصورت اور معصوم چہرے پر بڑی پیاری سی مسکراہٹیں لیے وہ آئی ۔ آتے ہی کاشف کے ہاتھ سے اُس نے وہ پیکٹ چھین لیا ۔

عجلت اور بے صبری میں اُس سے پیکنگ بھی نہیں کھل رہی تھی ۔ سخت ڈوری کی گرہ کھولنے کی دانتوں سے بھی بہت کوشش کی مگر جب ناکام رہی تو اسے وہیں چھوڑ اندر بھاگی ۔

" کہاں جا رہی ہو ۔۔؟ " آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر پیار لیے وہ بڑی دلچسپی سے اس کی حرکات دیکھ رہا تھا " کیا یہ قبول نہیں ۔۔ میں واپس لے جاؤں؟" اس کی بے صبری کو جانتا تھا ۔ صرف اسے چھیڑنے کی خاطر کہہ رہا تھا ۔

" نہیں نہیں ۔۔" وہ بڑی عجلت سے بولی " ڈوری نہیں کھل رہی قینچی لینے جا رہی ہوں "

" تو گڑیا ! اپنے منہ والی استعمال کر لی ہوتی "

" اُوں ۔۔! " وہ لاڈ سے مسکرا دی " میں کوئی بہت تیز باتیں کرتی ہوں " اور جواب لیے بغیر ہی وہ بھاگ گئی ۔

" بیوقوف ہے بالکل " کاشف امی کے پاس بیٹھ گیا ۔

" کیا ہے اس میں ۔۔؟ " امی نے متجسس نگاہ سے اسے دیکھا ۔

" دوپٹے ہیں ۔۔ ریشمی کے شوق میں ہر وقت اوڑھے رکھا کرے گی "

" خدا تمہیں ایمان اور برکت دے ۔ کتنا بہن کا خیال رکھتے ہو " امی وہ پیکٹ اُٹھا کر کھولنے لگیں ۔

" لو ۔ پاگل ابھی تک قینچی ہی ڈھونڈ رہی ہے " امی نے ایک منٹ میں وہ

کھول لیا۔ "بڑے خوبصورت ہیں۔" باریک ریشم کا ایک نیلا اور دوسرا پیازی دوپٹہ تھا۔ دونوں کو ہاتھوں پر پھیلا پھیلا کر وہ بغور دیکھنے لگیں۔

"دونوں ہی رنگ دھنک پر بہت اُٹھیں گے۔" وہ الٹ پلٹ کر ان کا ملائم ملائم سا کپڑا محسوس کرتے ہوئے پھر بولیں۔

"بہت قیمتی اُٹھا لائے ہو۔ سچ ہے۔۔۔ ابھی معمولی ہی لے آتے۔"

"خیال معمولی ہی لینے کا تھا۔ مگر آپ جانیں گڑیا کے لیے کوئی گھٹیا یا کم قیمت کی چیز خریدنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"اچھا۔" امی نے اک آہ بھری۔ "خدا اسی کے بھاگوں اس امتحان کے بعد تمہیں کوئی اچھی سی نوکری دے دے۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔"

"میں اس بار امتحان نہیں دے رہا امی۔۔۔!"

"کیوں۔۔۔؟" امی نے تعجب سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"بس ایسے ہی۔" پھر وہ لاپرواہی کا اظہار کرنے کے لیے جلدی سے بولا۔ "یوں بھی ایف اے کے امتحان سے نوکری پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میٹرک کے بعد بی۔ اے کی سند کام آتی ہے۔ ویسے تو آج کل بی۔ اے کو بھی کوئی نہیں پوچھتا۔"

"پھر۔۔۔؟ پھر ہمارا کیا بنے گا بیٹے۔۔۔؟" امی کا لہجہ بے حد فکر مند تھا۔

"نہیں نہیں امی! پریشان مت ہوں۔ میں نوکری کی کوشش کر رہا ہوں۔ ابھی مل گئی اور جتنے کی بھی مل گئی فوراً کر لوں گا۔ اور ساتھ ساتھ پڑھائی بھی انشاءاللہ کرتا ہی رہوں گا۔"

"امی! امی جی! قینچی کہاں ہے۔۔۔؟" دھنک اندر سے ہی پوچھ رہی تھی "تو ہر جگہ ڈھونڈ چکی۔"

"آجاؤ گڑیا! اب تمہاری قینچی کی ضرورت نہیں رہی۔" کاشف ہنسا۔

دھنک باہر آگئی۔ وہیں سے پیکٹ کھلا دیکھا تو قریب آتے ہوئے شوخی سے مسکرائی۔ "آپ نے اپنی استعمال کر لی ہے کاشی جی۔۔۔؟"

"اور کوئی سلیقہ آیا ہو یا نہ۔ مگر بڑے بھائی کو باتیں بنانا آگیا ہے۔" امی نے تیکھی سی نگاہ سے اسے گھورا۔

"نہیں امی، میری گڑیا انشاءاللہ بڑی سلیقہ شعار ہو گی۔ وہ تو ایسے ہی مجھ سے لاڈ کر رہی تھی۔ آپ ہر بات میں اسے ٹوکا نہ کریں۔"

"اگلے گھر جانا ہے۔ کیسے نہ کوئی ہدایت دوں۔ وہاں بھی جا کر بڑوں کے سامنے اگر یونہی زبان چلائی تو کیا ہماری عزت رہے گی۔ ناک نہ کٹے گی۔۔۔؟"

جو کچھ کاشف اس کے لیے لایا تھا وہ دیکھا بھی نہیں تھا۔ ساری خوشی کافور ہو گئی۔ بے دلی سے قدم اُٹھاتی ہوئی چپ چاپ جا کر برآمدے کے پرلے ستون کے پاس کھڑی ہو گئی۔

"دیکھا نا آپ نے اسے ناراض کر دیا۔" کاشف بے کل سا ہو کر اُٹھا اور اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ "ناراض ہو گئی ہو۔۔؟"

"کاشی جی! امی ہر وقت مجھے جھڑکیاں دیتی رہتی ہیں۔" بھائی کے سینے کے ساتھ سر لگا کر وہ سسکنے لگی۔ "میں نے کبھی کوئی چیز نہیں مانگی۔ لڑکیوں کے پاس اتنا کچھ ہوتا ہے۔ میں نے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا مگر پھر بھی۔۔۔۔" اور اس کی بڑھتی ہوئی سسکیوں نے اس کی بات بھی پوری نہ ہونے دی۔

"مجھ سے مانگو میری گڑیا! مجھ سے کہو۔ جو خواہش تمہارے من میں پیدا ہو۔ جو تمنا تمہارا دل کرے۔ تمہارے کاشی جی کی زندگی کا اور مقصد ہی کیا ہے۔"

"دیکھ لو ۔ بات کیا ہوئی اور یہ کدھر لے گئی ۔"

"امی! کوئی محرومی محسوس کی ہو گی نا ۔ تبھی ہونٹوں پہ آ گئی ۔"

"لو بھلا غریب لوگ دنیا میں ہوتے نہیں ۔ اسے معلوم ہونا چاہیے نا کہ جن کے باپ سر پہ نہ ہوں انہیں . . . ."

"امی ۔!" کاشف نے تڑپ کر امی کی بات کاٹ دی "آپ کیوں اسے بات بے بات یتیمی کا احساس دلانا چاہتی ہیں۔ ویسے بھی امی! جس بہن کا بڑا بھائی موجود ہو وہ یتیم کبھی نہیں ہوتی ۔" پھر اس نے سینے کے ساتھ لگے دھنک کے سر کو سہلایا، تھپتھپایا۔ "سن گڑیا! آئندہ جو چیز لینے کو دل چاہے تو بس چپکے سے آ کر میرے کان میں کہہ دیا کر ۔"

"ہاں ۔ تمہارے پاس قارون کا خزانہ ہے نا ۔؟" امی طنز یہ بولیں۔

"اپنی گڑیا کی خاطر تو قارون کا خزانہ بھی سمجھیں میرے پاس موجود ہے ۔"

"تو لاؤ اس میں سے کچھ مجھے دے دو ۔ گھر کی ضروریات کے لیے مجھے کچھ رقم درکار ہے ۔"

"میرے الفاظ پہ آپ نے غور نہیں کیا امی ۔!"

"کیا ۔؟"

"میں نے کہا تھا کہ قارون کا خزانہ صرف میری گڑیا کے لیے ہے۔ باقی فضول سے اخراجات کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے ۔" کاشف نے بات مذاق میں ٹال دی "جب نوکری لگوں گا تو پھر ساری تنخواہ آپ کے لیے اور آپ کے گھر کے لیے ۔ چل آ گڑیا! آ دیکھ نا میں تیرے لیے کیا لایا ہوں ؟"

کاشف اسے کھینچ کر وہیں لے آیا جہاں امی بیٹھی تھیں ۔

"کونسا والا زیادہ اچھا ہے ؟" اس نے دونوں دوپٹے اس کے سر پہ پھیلا دیئے۔

"ہائے! کتنے پیارے ۔!!" وہ دونوں کو باری باری لے لے کر دیکھنے لگی۔

"ایسے ملائم اور ایسے نازک سے ہیں کہ ذرا وزن محسوس نہیں ہوتا ۔" دھنک کی پلکوں پر ابھی تک آنسو موتیوں کی طرح اٹکے ہوئے تھے مگر دوپٹوں کی نزاکت اور ملائمت نے اس کے صبیح رخساروں پہ بڑی خوبصورت سی سرخیاں اور ہونٹوں پہ بڑی دلآویز سی مسکراہٹیں پھیلا دکھی تھیں۔

"بس بس! اسی طرح کھڑی رہنا ۔ صرف چہرہ ذرا سا اونچا کر لو ۔"

کاشف کی آواز پہ وہ چونکی "ارے! یہ تو کیمرہ ہے ۔ تصویر کھینچنے لگے ہیں ؟"

"یہ کب لائے ۔؟" امی نے بھی چونک کر کاشف کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔

"ابھی ان دوپٹوں کے ساتھ ۔ آپ کے پاس ہی تو پڑا ہوا تھا ۔ بس بس گڑیا! اسی طرح کھڑی رہنا ۔ شاباش ۔!"

"اتر گئی ۔؟"

"ہاں ۔ بڑی اچھی تصویر آئے گی ۔!"

"کیمرہ خریدا ہے ۔؟" امی نے پوچھا۔

"نہیں امی ۔! کیمرہ خریدنے کی ابھی پسلی نہیں ۔"

"تو کاشی جی! میرے والے خزانے میں سے خرید لیتے ۔"

"مذاق کرتی ہو ۔ سنجیدگی سے کہو ۔ کل ہی نیا کیمرہ نہ آ جائے تو نام بدل دینا اپنے کاشی جی کا ۔"

"ایک ہی تصویر ۔ کیا پتہ اچھی آئے یا نہیں ۔" امی بڑبڑائیں پھر قدرے بلند آواز میں بولیں "کاشی! بیٹے دو تین اور اتر سکتی ہیں ؟ میں چاہتی ہوں اس

کی کوئی بہت ہی اچھی تصویر اس کی ساس کو بھیجوں۔"

"جتنی تصویریں اُتر سکتی ہیں۔ اور ساری کی ساری اس کی اُتاروں گا۔ بڑی مدّت سے دل میں حسرت تھی۔ چلو گڑیا! اب ادھر اس کونے میں — اس چھوٹی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔"

"کس بات کی دل میں حسرت تھی —؟"

"اسی کی کہ گھر میں اپنی گڑیا کی بہت ڈھیر ساری تصویریں ہوں۔ میں جدھر دیکھوں ادھر مجھے اپنی گڑیا ہی نظر آئے۔"

امی مسکرا پڑیں۔ چہرے پر بڑی پُرنور سی چمک لہرائی۔ "شکر ہے مولیٰ! تو نے میرے بچّوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے اتنی محبّت ڈالی ہوئی ہے۔"

"کاشی جی! اب میں آپ کے ساتھ تصویر اُترواؤں گی۔" تین چار تصویریں اُتروانے کے بعد ہمیشہ کی طرح وہ آکر کاشف کے گلے میں جھول گئی۔

"اس پوز میں —؟"

"نہیں — ٹھیک طرح سے۔" خفیف سی ہوتے ہوئے اس نے جلدی سے بازو ہٹا لیے۔

"یہ غلط ہے نا —؟"

"ہاں۔"

"تو بس پھر — تم بھی ٹھیک طرح رہا کرو۔" پھر وہ بہت نرمی سے بولا۔

"اب تم بڑی ہو گئی ہو گڑیا —!"

"ہائے کاشی جی! مجھے یاد ہی نہیں رہتا۔" بڑی پیاری سی مسکان اس کے گلابی ہونٹوں پہ لہرا گئی۔

"دماغ میں شاید بھوسہ بھرا ہوا ہے۔" کاشف نے بڑے پیار سے اس کی کھوپڑی ہلائی۔

"دھوپ جا رہی ہے کاشی جی —!"

"تو پکڑ لو جلدی سے۔" وہ اس کی طرف کیمرے کا فوکس کرتے ہوئے شوخی سے بولا۔

"اب اکیلے نہیں — آپ کے ساتھ —" دھنک مچل کر پرے ہٹ گئی۔

"مگر پھر تصویر کون اُتارے گا —؟"

"امی۔"

"مجھے نہیں اُتارنا آتی۔"

"یہ بندہ کس لیے دُنیا میں آیا ہے —؟"

"ارے شہزاد! تم کب آئے —؟" کاشف نے صحن کے اس پار بیرونی دروازے میں کھڑے شہزاد کو حیرت سے دیکھا۔

"میں تو کتنی ہی دیر سے کھڑا تمہاری فوٹو گرافی کا تماشہ دیکھ رہا ہوں۔"

"کاشی جی! انہیں تصویر کھینچنا آتی ہے —؟" دھنک نے رازدارانہ انداز میں کاشف سے پوچھا۔

"ارے گڑیا پگلی! اسی کا تو کیمرہ لے کر فلم ڈلوائی ہے۔"

"تو پھر انہیں کہئے کہ آپ کی اور میری ایک تصویر کھینچ دیں۔"

وہ براہِ راست شہزاد سے کبھی بات نہیں کیا کرتی تھی۔

"تمہارا اس سے پردہ ہے یا بول چال بند ہے؟" امی اس کی اس طرزِ گفتگو پہ ہنس پڑیں — دھنک شرما کر سر جھکاتے ہوئے پرے ہٹ گئی —

"اُتار دیتے ہیں جی — جتنی حکم کریں گی اُتار دیں گے۔" شہزاد ان سب کے قریب آتے ہُوئے فیاضانہ بولا۔

فوٹوگرافی میں شہزاد بڑا ماہر تھا۔ بڑے خوبصورت اور اچھے اچھے پوز بنوا کر اُس نے دھنک، کاشف اور امی کی کئی تصویریں اُتاریں — پھر —

اس تصویر کے لیے دھنک، کاشف اور امی قطار میں کھڑے تھے۔ بڑے خوبصورت اور دلفریب سے انداز میں دھنک مسکرا رہی تھی۔ کاشف ماں اور بہن کے درمیان تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بھی تبسّم تھا۔

وہ کیمرہ شاید آٹومیٹک تھا — کسی کو خبر نہ ہوسکی — وقت سیٹ کر کے کیمرہ اونچی میز پر رکھتے ہُوئے شہزاد تیزی سے ان کے پاس آکھڑا ہُوا — عین دھنک کے ساتھ — اس سے پہلے کہ کوئی بھی حقیقت سے باخبر ہوتا چشمِ زدن میں تصویر اُتر چکی تھی — "سوری بھئی! پہلے آپ کو مطلع ہی نہیں کر سکا — بس اچانک ہی دل چاہ اُٹھا کہ اس پیارے سے فیملی گروپ میں میں بھی شامل ہوجاؤں — ہوسٹل کی زندگی نے تو ایسی چھوٹی چھوٹی گھریلو قسم کی خوشیاں چھین ہی لی ہُوئی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں بیٹے! پھر کیا ہُوا — تم بھی تو اپنے کاشی ہی کی طرح ہو۔"

"اچھا امی! باقی تصویریں کل یا پرسوں۔ اب ذرا چائے کا پروگرام ہوجائے۔"

اچانک ہی کاشف نے جیسے کھیل ختم کرنے کا اعلان کر دیا — اس کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی — "کاشی جی! میں چائے بناؤں —؟ اب بڑی اچھی بنانے لگی ہوں۔" دھنک بھاگ کر باورچی خانے میں جا گھسی —

"چائے کے ساتھ کچھ کھانے کے لیے مل سکتا ہے —؟" کسی کو مخاطب کئے بغیر شہزاد بلند آواز میں بولا۔

"ہاں ہاں — کیوں نہیں —؟" پاس سے امی نے جلدی سے جواب دیا۔ "دھنک! ابلے آلو پیسے رکھے ہیں — جتنی دیر میں چائے کا پانی کھولتا ہے تم دوسرے چولھے پر کٹلس بنالو۔"

"اچھا امی جی —!"

"گڑیا بنالے گی —؟" کاشف نے قدرے متحیر ہوتے ہُوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں —؟ دیکھنا تو سہی کتنے اچھے بناتی ہے۔" امی بڑے فخر سے بولیں۔

"ہائے امی! اتنی چھوٹی کو آپ نے ہنڈیا چولھے پر لگا دیا۔"

"لو — ابھی چھوٹی ہے۔" امی جیسے کاشف کی نادانی پر مسکرا پڑیں۔

"کل کو ہی اسے لے جانے والے دروازے پر کھڑے ہوں گے۔"

"نہیں نہیں — میری گڑیا ابھی کہیں نہیں جائے گی۔" شاید یہ موضوع اسے بڑی تکلیف پہنچا گیا تھا — کاشف اُٹھ کر چل دیا —

"کاشف سنو!" شہزاد کے پکارنے پر وہ پلٹ آیا —

"آج فیس داخلہ جمع کرانے کی آخری تاریخ تھی۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔" کاشف نے بے پرواہی سے نظر پھیرلی۔

"تو تم نے ...؟" شہزاد جو کچھ کہنے لگا تھا کاشف شاید سمجھ گیا تھا۔ جلدی سے اس کی بات قطع کرتے ہُوئے بولا — "میں اس بار امتحان نہیں دے رہا۔"

"کیوں —؟"

"میری تیاری نہیں ہے۔"

"تمہیں تیاری کی کیا ضرورت ہے —؟ تم اتنے لائق ہو۔"

"مگر —" کاشف نے گھبرا کر دزدیدہ نگاہوں سے امی کی طرف دیکھا —
پھر شہزاد کی طرف جھک کر قدرے آواز دباتے ہوئے بولا "میرے پاس داخلہ
بھیجنے کے لیے پیسے نہیں تھے ۔"

"پیسے نہیں تھے —؟" امی کا دھیان بھی انہیں کی طرف تھا اور کان بھی انہیں
کی باتوں پر لگے تھے ۔"اور وہ جو تم کہتے تھے کہ ٹیوشن کے ملیں گے تو داخلہ دے
دو گے — کیا وہ نہیں ملے —؟"

"ملے تھے امی —!" اس کی نگاہیں جھک گئیں ۔

"پھر —؟ وہ کہاں گئے —؟"

کاشف گردن جھکائے چپ چاپ کھڑا رہا ۔

"نناؤ نا — اس رقم کو کیا کیا —؟" امی کی مشکوک نگاہیں اس پر گڑی تھیں ۔

"گڑیا کے لیے دوپٹے خرید لیے اور کیمرے میں فلم ڈلوالی ۔" وہ ہولے سے بولا

"اوہ —!" امی وہیں سر تھام کر رہ گئیں ۔ تبھی کہہ رہے تھے کہ امتحان دینے سے
کیا فرق پڑتا ہے — کاشی! یہ تو نے کیا کیا —؟"

کاشف رُخ پھیرے چپ چاپ کھڑا دُور ڈوبتے سُورج کو تک رہا تھا ۔
اب وہ ماں کو کیسے سمجھاتا کہ گڑیا کی کسی ضرورت یا خوشی سے مقدم اس کی نگاہ میں
اور کچھ بھی نہ تھا ۔ کتنا خوش ہُوئی تھی وہ دوپٹے لے کر اور — تصویروں کے لیے
تو خود امّی نے کہا تھا — بیٹی کی سُسرال کے سامنے وہ سفید پوشی کا بھرم قائم
رکھنا چاہتی تھیں — پھر وہ کیا کرتا —؟ اس کی مجبوری کو کوئی کیوں نہیں
سمجھتا تھا —؟؟

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لڑکے کے دماغ میں کیا ہے؟ آخر کب تک
یوں سسک سسک کر زندگی گزاریں گے — ارے! پڑھائی مکمل کر کے اور
کسی اچھی نوکری پر لگ کر کیا بہن کو اس گھر سے باعزت طریقے سے رخصت
کرنے کی تمنا تمہارے دل میں نہیں ہے؟" امی رونے لگیں ۔

"ارے! ارے!!" شہزاد اپنی جگہ سے اُٹھ کر امی کے قدموں میں جا بیٹھا ۔

"آپ اتنا پریشان نہ ہوں ۔ میں نے کاشف کے داخلے کی فیس جمع کرا دی ہے ۔"

"کیا —؟" کاشف جلدی سے پلٹا ۔

"جب میں نے فہرست دیکھی تو اس میں تمہارا نام نہیں تھا — میں سمجھا کہ تم
بھُول گئے ہو گے ۔ آج آخری تاریخ کے متعلّق تمہیں یاد ہی نہیں رہا ہو گا ۔"

کاشف آہستہ آہستہ قدم اُٹھا کر اس کے قریب آ کھڑا ہُوا "شہزاد!
بہت بہت شکریہ — میں بہت جلد تمہاری یہ رقم لوٹانے کی کوشش کروں گا ۔"
کاشف کا لہجہ بڑا گھمبیر تھا ۔

"واہ یار! چھوڑو بھی تکلّف — دیکھتے نہیں میں کس بے تکلّفی سے تمہارے گھر
آ جاتا ہوں — تم سب کو میں اپنا ہی سمجھتا ہُوں ۔"

"خدا تمہیں خوش رکھے بیٹے —!" امی اپنے آنسو پلو سے صاف کرتے ہوئے
اسے دُعائیں دینے لگیں ۔"تم تو رحمت کا فرشتہ ثابت ہُوئے ہو اس وقت ۔"

"ارے امی! کھانا پلیز! تکلف چھوڑیئے — میں شرمندہ ہوتا ہوں ۔ اور
بھئی کہاں گئی چائے — میری آنتیں تو مارے بھُوک کے قُل ھو اللہ
پڑھ رہی ہیں ۔"

"دھنک! بیٹی چائے جلدی سے لے آ — اور کٹلس بنے یا ابھی نہیں —؟
شہزاد کو بہت بھُوک لگی ہے ۔"

"میں دیکھتا ہوں —" کاشف اسی طرح سنجیدہ چہرہ لیے باورچی خانے میں چلا گیا۔

○

ساجدہ بیگم کے ایک ہاتھ میں لفافہ تھا۔ اور ایک میں تصویر اور وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں اور کبھی برآمدے سے لان میں شوہر کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں — انہیں پکارتی پھر رہی تھیں — وفورِ مسرت سے اُن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور آواز میں کپکپاہٹ تھی — "سمجھ میں نہیں آتا کہ اک پل میں ہی کہاں غائب ہو گئے —" ہونٹوں پہ بڑبڑاہٹ تھی۔ اور نگاہ ہنوز تصویر پر ہی جمی تھی —

"ارے بھئی! اس قدر چاہت سے ہمیں کیوں پکارا جا رہا ہے — لگتا ہے پیار و محبت کی کوئی بات ہے —" ابا میاں ہنستے ہوئے غسل خانے میں سے برآمد ہوئے —

"اپنی دھنک کی تصویر آئی ہے —" ان کی سنے بغیر وہ ان کے قریب آ کر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے بولیں — "دیکھئے تو ماشاءاللہ کتنی بڑی ہو گئی ہے"

ساجدہ بیگم نے جلدی سے تصویر ان کی طرف بڑھائی — "ذرا دیکھئے۔ نیلے دوپٹہ میں کتنی خوبصورت لگ رہی ہے —" "یعنی کہ نیلے دوپٹے کی وجہ سے محض — ورنہ حقیقت میں وہ ہے نہیں —" ابا میاں اخبار میز پر سے اُٹھا کر اپنی جگہ پہ بیٹھتے ہوئے بولے۔

"آپ تو بات پکڑتے ہیں۔ نیلے دوپٹے کا تو میں نے ایسے ہی ذکر کر دیا تھا۔

ورنہ میری دھنک تو چاند ہے چاند"

"دھنک — چاند — واہ واہ — ! کیا کیا القاب دیئے جا رہے ہیں"

ابا میاں نے مسکراتے ہوئے اور مذاقیہ انداز میں بیگم پر اک نگاہ ڈالتے ہوئے تصویر کو دیکھا — پہلی نظر ان کی سرسری تھی — پھر وہ قدرے چونکے —

"ارے! یہ تو واقعی بڑی پیاری بچی ہے"

"تو گویا آج تک میرے کہنے پر آپ کو یقین ہی نہیں آیا تھا — ؟"

وہ علین ان کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے شکایتی انداز میں بولیں۔

"خواتین کی عادت ہوتی ہے نا کہ ہر بات ذرا مبالغے سے کرتی ہیں"

نگاہ ان کی ابھی تک تصویر ہی پر ٹکی تھی — "داد دیتے ہیں بھئی تمہاری نگاہِ انتخاب کی بیگم — !" وہ تعریفی نگاہوں سے ساجدہ بیگم کی طرف دیکھ کر بولے — "سچ جانو مجھے یقین نہیں تھا" انھوں نے پھر نگاہیں تصویر پر گاڑ دیں اور اسے ہر ہر زاویئے سے دیکھنے لگے۔

وہ چپ چاپ بیٹھیں انتہائی دلچسپی سے انہیں اس انداز میں تصویر دیکھتے ہوئے تکتی رہیں اور ان کی زبان سے ادا ہونے والے تعریفی کلمات سنتی رہیں — بڑی بے ساختگی اور پورے خلوص سے وہ تعریفیں کئے جا رہے تھے۔

پھر شاید ان میں صبر کا مزید یارا نہیں رہ گیا تھا۔ فخریہ لہجے میں بولیں —

"میں نے اپنے آثم کے لیے ایسے ہی تو اسے نہیں مانگ لیا تھا۔ پہلی بار جب میں نے اسے دیکھا یہ دو سال کی تھی۔ نیلی نیلی آنکھیں — لال لال رخسار اور چاندنی جیسا چمکیلا چمکیلا سا رنگ — لال رخساروں، نیلی آنکھوں اور چمکیلے چمکیلے سے چہرے کے گرد بکھرے سنہرے ریشمی بالوں سے ایسے خوشنما سی لگ رہی تھی جیسے باربی

کے بعد ڈھلے دھلائے آسمان پر دھنک خوشنما لگتی ہے۔"

"واہ واہ بیگم! خوشنمائی کو کیا نام دیا ہے۔ دھنک۔۔ دھنک۔!"

"ہاں۔" وہ ان کی تعریف سے مزید خوش ہوتے ہوئے جلدی سے بولیں۔

"میں نے ہی اس کا نام دھنک رکھا تھا۔ کاشف اسے گڑیا کہتا تھا۔ گھر کے باقی لوگ بھی گڑیا ہی کہہ دیا کرتے تھے۔ اور اس کی ماں کہتی تھی فی الحال اس کا نام گڑیا ہی چلتا رہے۔ جب سکول میں داخل ہوگی تو جو نام پسند کرے گی، رکھ دیں گے۔ مگر شام کو جلیل بھائی گھر آئے تو میرا رکھا ہوا دھنک نام اتنا پسند آیا کہ اسی وقت مٹھائی منگوا کر پورے محلے میں تقسیم کی۔" ساجدہ بیگم یکایک افسردہ ہوگئیں۔ "ہائے ہائے! کتنے ارمان تھے باپ کو بیٹی کے۔ لڑکا بھی حالانکہ ایک ہی تھا مگر جو لاڈ پیار اس کے کرتے تھے۔ کچھ پوچھیں نہیں۔"

"بیٹی تو ہوتی ہی ایسی چیز ہے۔" ابا میاں اپنی محرومی پر جیسے کراہ اٹھے۔ "ہم بھی ساری زندگی بیٹی کو ترستے رہے۔"

"بس! اللہ کی قدرت ہے نا۔ کسی کو دی نہیں اور کسی کو دی تو۔ اس کے ارمان دیکھنے کو وقت نہ دیا۔ مولیٰ بے نیاز ہے۔"

"امی بیگم۔! امی بیگم۔!!" صنم کمرہ کمرہ پھر کر انہیں ہی ڈھونڈھ رہی تھی انہوں نے چونک کر جلدی سے اپنی آنکھوں کی نمی خشک کی۔

"ارے! آپ یہاں ہیں۔ اور ابا میاں آپ بھی۔ یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے۔؟" وہ سیدھی ان کے پاس ہی چلی آئی۔

"لو۔ ہماری بیٹی تو آگئی۔ ہم خواہ مخواہ ہی اداس ہو رہے تھے۔"

"وہ۔ ادھر ممی نے مجھے بلا لیا تھا۔ ہر وقت مجھ سے کام ہی کراتی رہتی

ہیں ابا میاں۔" اس نے اپنی ماں کی شکایت لگائی۔

"کام کرنا اچھا ہوتا ہے بیٹے۔!"

وہ ہمیشہ ان کی کرسی کے بازو پر چڑھ کر بیٹھا کرتی تھی۔ لپک کر تشریف فرما ہونے ہی لگی تھی کہ کچھ سوچ کر وہیں تھم گئی۔

"ارے! کتنی پیاری ہے۔ مجھے بھی دکھائیے نا۔ خراب نہیں کروں گی ابا میاں۔ اب میں بڑی ہوگئی ہوئی ہوں۔" وہ اپنی اوڑھنی کو درست کرتے ہوئے جھک کر تصویر دیکھنے لگی۔ ابا میاں ہنس پڑے۔

"میں کب کہہ رہا ہوں خراب کر دو گی۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھ کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"ہائے! کتنی خوبصورت لڑکی ہے۔ کون ہے یہ امی بیگم۔؟"

"بس۔!" وہ زیر لب مسکرا دیں۔

"آپ بتائیے ابا میاں۔!"

"یہ بھی ہماری بیٹی ہی ہے بیٹے! تم جیسی۔!"

"میں بھی آپ کی بیٹی۔ یہ بھی آپ کی بیٹی۔ مطلب یہ کہ میری بہن ہوئی۔"

"ہاں۔"

"تو پھر یہ تصویر میں لے لوں۔؟ مجھے بڑی اچھی لگی ہے اپنی بہن۔!"

"ارے نہیں نہیں۔" ساجدہ بیگم نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے جھپٹ لینے کے انداز میں تصویر پکڑی۔ ابا میاں ان کی اس حرکت پر مسکرا پڑے مگر زبان سے کچھ نہ بولے۔

"تم ابھی چھوٹی ہو۔ میں سنبھال کر رکھتی ہوں۔ بڑی ہو جاؤ گی تو پھر دوں گی۔"

"پکا وعدہ — ؟"

"بالکل پکا اور بیٹی جاؤ تو ذرا اُمی کے کمرے سے البم اُٹھا لاؤ ـ"

"امی بیگم کے تعمیل حکم کے لیے وہ جلدی سے اُٹھ بھاگی ـ

"اُمی کتنے بجے تک آجائے گا — ؟" ابامیاں نے بیگم سے پوچھا ـ

"پانچ بجے کا کہہ کر گیا تھا مگر مجھے یقین ہے پہنچے گا نہیں — دوست مل کر پکنک منانے گئے ہیں — ہنسی مذاق، کھیل کود میں وقت کا احساس کسے رہیگا؟"

"لیجئے امی بیگم!" صنم نے ہانپتے ہُوئے البم ان کے ہاتھ میں تھما دیا

دھنک کی تصویر وہ کسی مناسب جگہ پر لگانے کے لیے ایک ایک ورق الٹنے لگیں ـ

"ارے! یہ تو سارا ہی بھرا ہُوا ہے — جاؤ صنو بیٹی! دوسرا لاؤ ـ"

صنم اوڑھنی درست کرتے ہُوئے دوسرا البم لینے بھاگ گئی ـ

"سارا ہی البم صنم کی تصویروں سے بھرا پڑا ہے ـ" امی بیگم نے مسکراتے ہوئے ابامیاں کی طرف دیکھا ـ

"بے چارے کے پاس لے دے کے اک یہی تو ہے ـ انجم اور ارم سے اس کی کبھی بنی نہیں ـ"

"ویسے خدا نے بہن کی کمی صنم کی صورت میں اس کی خوب پوری کردی ہُوئی ہے ـ"

"لیجیے امی بیگم! یہ دوسرا البم ـ" وہ پہلے سے بھی زیادہ ہانپ رہی تھی —

ساجدہ بیگم نے وہ البم لے کر کھولا — پھر اس کا بھی ورق الٹنے لگیں ـ

"ارے! یہ بھی سارے کا سارا بھرا ہُوا ہے ـ" وہ بڑے زور سے ہنستے ہُوئے بولیں ـ "دھنک کی تصویر کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں ہے ـ"

"لگتا ہے صاحبزادے پڑھائی وغیرہ کی طرف ذرا دھیان کم ہی دیتے ہیں ـ"

ابامیاں کی آواز میں قدرے تشویش تھی ـ

"نہیں ابامیاں! اُمی پڑھتا رہتا ہے ـ" صنم پاس سے اس کی حمایت میں جلدی سے بولی ـ

"بیٹی! تمہارا بڑا بھائی ہے ـ اور اب تو قد کاٹھ سے بھی بہت جوان لگتا ہے ماشاء اللہ — اسے بھائی جان کہا کرو ـ"

"امی بیگم! میں بھی تو بڑی ہوگئی ہوں ـ اُمی جتنی ہی بڑی ہوں گی —"

وہ جلدی سے اپنا قد انہیں دکھانے کے لیے تن کر سیدھی کھڑی ہوگئی ـ

"ہاں بھئی ہاں ـ ہماری بیٹی بھی اب بڑی ہوتی جارہی ہے ـ" ابامیاں نے مسکراتے ہُوئے پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھا ـ

"اور ابامیاں! اسی لیے تو میری ممی اب مجھے ادھر نہیں آنے دیتیں ـ"

"کیوں — ؟" ساجدہ بیگم نے قدرے چونک کر اور جیسے کچھ بُرا مناتے ہُوئے پوچھا ـ

"اس لیے امی بیگم! کہ اب وہ مجھ سے چھوٹیوں کے کام کراتی رہتی ہیں ـ"

ابامیاں اس کی بات سن کر زور سے ہنس پڑے ـ

"امی بیگم! آپ مجھ سے کام کرایا کریں نا — تاکہ پھر میں ادھر ہی رہا کروں ادھر میرا دل نہیں لگتا اور اب مجھے کام وغیرہ کی عادت پڑنی چاہیے — میں اب بڑی ہوگئی ہوں نا اس لیے ـ"

"ضرور کرایا کروں گی ـ تو ہماری بیٹی بھی تو ہے ـ"

"میری بیٹی بڑی اچھی ہے ـ" ابامیاں بڑے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگے ـ

"صنم بیٹی! یہ دونوں البم واپس آنم کے کمرے میں رکھ آو۔"

"یہ تصویر ان میں کیوں نہیں لگائی امی بیگم۔؟"

"بیٹی جگہ ہی نہیں ہے۔"

"ان میں سے کوئی سی اُتار کر اس کی جگہ میری بہن کی لگا دیں۔ یہ سب سے زیادہ اچھی ہے۔"

"نہیں۔ ابھی رہنے دو۔" کچھ سوچتے ہوئے وہ بولیں۔ "جاؤ تم یہ واپس رکھ آؤ۔"

صنم دونوں البم اُٹھا کر آنم کے کمرے میں رکھنے کے لیے چل دی۔

"اس وقت دونوں البم صنم کی تصویروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ شادی ہو جائے گی تو ان میں سے ایک بھی دکھائی نہیں دے گی۔ ان سب کی جگہ دھنک کی تصویریں لے لیں گی۔" امی بیگم نے مسکرا کر شوہر کی طرف دیکھا۔

"بھئی خوبصورت بیوی چیز ہی ایسی ٹھنڈی میٹھی اور سہانی سے ہوتی ہے۔" ابامیاں بڑے انداز سے بیگم کے حسین چہرے کو دیکھتے ہوئے بولے۔ "اب ہمیں سے پوچھو۔ ہمیں کس کس کا پتہ ہے۔ ہماری زندگی کے البم میں سے بھی باقی سبھی کی تصویریں نکل گئیں۔ ہماری بہنیں تھیں۔ بھائی اور بھاوجیں تھیں۔ آج کسی کا پتہ ہی نہیں کون کہاں ہے اور کون کہاں۔ اور اک وقت تھا کہ کسی ایک کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔" پھر اُنہوں نے اک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بیوی کی طرف دیکھا۔

"اور آج۔ بس اک تم ہو اور اک ہم ہیں۔ اسی طرح اگر آنم کا البم دوسروں کی تصویروں سے خالی ہو کر دھنک کی تصویروں سے بھر جائے گا تو کونسی ایسی

انہونی بات ہو جائے گی۔"

"چلیے بیٹھیے۔" ساجدہ بیگم مسکراتے ہوئے اور قدرے لجاتے ہوئے دھنک کی تصویر سنبھال کر رکھنے کے لیے اپنے کمرے کی طرف چلیں۔ لیکن۔ کسی سوچ کے تحت اُلٹے قدموں واپس آ گئیں۔

"جلیل بھائی کے انتقال پر میں ان کے ہاں گئی تھی۔ اس وقت دھنک آٹھ سال کی تھی۔ نازک سی، چھوٹی سی۔"

"اور اب اتنی بڑی ہو گئی۔ کتنی بری بات ہوئی۔" ابامیاں شوخی سے مسکرا دیئے۔

"ہائے ہائے! کیوں بُری بات ہوئی۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اب اتنی بڑی کو دیکھنے کو دل چاہ رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں چند دن کے لیے چلی جاؤں۔"

"مرضی کی مالک ہو لیکن اگر ہمارا ساتھ چاہتی ہو تو آنے والی عید کا پروگرام بنا لو۔ اگلے مہینے کاروباری سلسلہ میں مجھے کوئٹہ جانا ہے۔"

"مجھے یہاں سے آنم چڑھا دے گا۔ سارا بائیس گھنٹے کا تو سفر ہے۔"

"واہ رے شوق اور واہ ری بے تابی۔ بائیس گھنٹے کا یوں تذکرہ ہو رہا ہے جیسے بائیس گھنٹے نہیں بائیس منٹ ہوں۔ ہم اگر کہیں اتنے لمبے سفر کے لیے ساتھ لے جانا چاہتے تو سو سو عارضے بیان ہونا شروع ہو جاتے۔"

"اے ہٹیے بھی۔" ساجدہ بیگم زیر لب مسکراتے ہوئے بولیں۔ "جیسے پہلے کبھی آپ کے ساتھ سفر نہیں کیا۔ آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں۔" پھر قدرے توقف بعد مدھم سے لہجے میں کہنے لگیں۔ "دراصل اس کی تصویر دیکھنے کے بعد اب اُسے بھی دیکھنے کو دل بڑا ہی بے تاب ہو گیا ہے۔"

"سچی بات — اس کی تصویر دیکھ کر تو دل میرا بھی یہی کچھ چاہنے لگا ہے۔ مگر یہ کاروباری مصروفیات — !" وہ اک آہ بھر کر بولے "انسان اپنے عزیز و اقارب سے بھی دور ہو جاتا ہے۔"

ساجدہ بیگم چند لمحے کھڑی غور سے ان کے سنجیدہ چہرے کو دیکھتی رہیں پھر ان کے قریب ہو کر کہنے لگیں۔ "اگر واقعی آپ پوری سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں کہ اسے دیکھنے کو دل چاہ رہا ہے تو —"

"کمال ہے بھئی — کمال ہے — آنم صرف تمہارا ہی تو بیٹا نہیں — میرا بھی ہے۔ اور میرے دل میں بھی ویسے ہی اس کے لیے ارمان ہیں اور ویسے ہی جذبات جیسے تمہارے — بلکہ دھنک کا جہاں تک معاملہ ہے اس میں بیگم میرے حقوق زیادہ ہوں گے —"

"وہ کیوں — ؟ وہ کیوں — ؟" وہ چنخ کر بولیں۔

"یہ بات مصدقہ ہے کہ ساس بہو کی نسبت سسر اور بہو میں زیادہ پیار ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ طے پایا کہ دھنک ہماری بیٹی ہے —"

"اچھا اچھا — آپ ہی کی سہی —" ساجدہ بیگم ہنس پڑیں —

"پھر عید کا پروگرام پکّا ہے نا — ؟ میں جانے کی تیاری شروع کر دوں ؟"

"کیا — ؟" ابا میاں تقریباً چیخ پڑے۔ "پانچ چھ مہینے پہلے ہی جانے کی تیاری شروع کر دو گی —"

"اس کے دو چار جوڑے کپڑوں کے بناؤں گی — سینے سلانے اور اوپر کچھ کام دام کرنے میں بھی کافی وقت لگ جائے گا — پھر اور بھی ڈھیر ساری چیزیں اس کے لیے خریدوں گی — ایک ہی ایک میری بہو ہے — بیٹی بھی کوئی نہیں۔

ہمیشہ دل میں ارمان ہی رہتا ہے کہ ایسے کوئی کپڑے سیوں اوپر سلمہ ستارے کا کام کراؤں۔ رنگا رنگ کی اوڑھنیوں کو گوٹے لپے سے سجاؤں مگر —"

"بس بیگم ! بھلا اب ایسا حسرت بھرا انداز کیوں اختیار کر رہی ہو" ابا میاں نے ان کی بات کاٹ دی۔

"ہماری دھنک بٹیا سلامت رہے — پورے کر لو سارے ارمان"!

"اسی لیے تو کہہ رہی تھی کہ . . ." بات کرتے کرتے نگاہ پھر تصویر پہ جا پڑی آنکھوں میں انوکھی سی چمک لیے جلدی سے بولیں —

"خراب ہی نہ ہو جائے — اسے تو جا کر پہلے سنبھالوں — کتنی پیاری ہے میری بہو — !"

"بیٹی کہا کرو —"

ابا میاں کی بات پر وہ مسکراتے ہوئے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں —

○

ہوسٹل کا کمرہ تو اس نے بس برائے نام ہی لیا ہوا تھا — کالج کے اوقات کے بعد رات گیارہ بارہ بجے تک شہزاد کاشف کے پاس ہی رہتا — کاشف کی امّی کے ہاتھوں کا بنایا ہوا کھانا اور دھنک کے ہاتھ کی چائے اس کے منہ کو لگ گئی تھی وہ گھر میں قدم رکھتا تو دھنک بڑبڑانے لگ جاتی — اس کا موڈ بگڑ جاتا — اسے گھر میں ہر وقت شہزاد کا گھسے رہنا ذرا پسند نہ تھا — اس کی تو آزادی ہی ختم ہو کر رہ گئی ہوئی تھی — وہ تو جیسے سدا کی قید بھگت رہی تھی۔

امی اور کاشف کے احساس دلاتے دلاتے۔ خود اس کے اپنے آپ میں آنے والی تبدیلیوں نے اور دل اور دماغ میں جنم لینے والے نرالے نرالے اور سہانے سہانے سے احساسات وجذبات نے پوری طرح اسے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ اب ذہنی اور جسمانی لحاظ سے جوان ہو چکی تھی۔

اس کا قد اس کے کاشی جی کے کان تک پہنچ گیا تھا جو سال ڈیڑھ سال پہلے ان کے کندھے سے بہت نیچا تھا۔ ان دنوں کاشف کبھی بونی اور کبھی ٹھنگنی کہہ کر اسے چھیڑا کرتا تھا۔ کتنا دق آیا کرتا تھا اسے ــــ!

اور اس دن اس نے شکر کیا جب کاشی جی اسے بونی کہتے کہتے یکدم ہی ٹھٹھک گئے تھے پھر اک لمحہ توقف کرنے کے بعد کچھ سوچ کر بولے "کچھ اور کہنا پڑے گا اب تو ــ بونی یا ٹھنگنی اب ٹھیک نہیں لگتا۔" کتنی ہی دیر وہ سوچتے رہے۔ پھر گھور کر اسے دیکھتے ہوئے اور بلند آواز میں بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے

"اس گڑیا کی بچی نے قد بھی تو اتنا مناسب نکالا ہے تاکہ کوئی بات بن ہی نہیں رہی اب بھلا کیا کہہ کر چھیڑوں اسے ــ" دھنک جواب میں ہنس کر رہ گئی ــــ لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ ہنسی صرف وقتی تھی۔ کاشف اسے چھیڑے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا قد کا معاملہ باقی نہیں رہ گیا تھا تو اس نے ایک آدھ دن میں ہی کوئی اور بات یقیناً سوچ لینا تھی کہ اسے اپنی بہن، اپنی گڑیا کے ساتھ اتنا ہی پیار تھا اور یہ چھیڑ چھاڑ اسی ڈھیروں ڈھیر پیار کا تقاضہ تھی۔

مگر ــــ شہزاد کا وجود اسی لئے اسے بہت کھٹکتا تھا۔ ہر وقت کی کاشف کی وہ پیار بھری چھیڑ چھاڑ بھی ختم ہو کر رہ گئی تھی ــ اور خود اس کا آزادی سے اپنے ہی گھر کے کمرے کمرے میں گھومنا بند تھا۔ اوڑھنی سر سے اتار کر اور

کمر میں کس کر سہولت سے گھر کے کام کاج بھی وہ نہیں کر سکتی تھی۔ ستم بالائے ستم پھر ہر وقت چائے کا آرڈر اسے ستا ڈالتا تھا۔

چائے بھی تو وہ کاشف سے کہہ کر خاص طور پر دھنک سے بنوایا کرتا تھا۔

ان کے گھر میں گیس بھی نہیں تھی۔ سارے محلے میں گیس کے چولہے لگے مگر وہ اشد ضرورت ہونے کے باوجود نہ لگوا سکے کہ آمدن کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور اس پر کافی خرچ آتا تھا۔

مٹی کے تیل کے چولہے پر چائے بنانا پڑتی تھی ــــ غصے میں آ کر دھنک نے کئی بار جان بوجھ کر چائے کو دھواں لگا دیا ــــ خود اس نے چکھی۔ خاصی بدذائقہ چائے تھی۔ امی سے جھڑکیاں ملیں ــــ پھوہڑ اور بدسلیقہ کے خطاب وصول کئے مگر بات نہ بنی ــ شہزاد کو پھر بھی اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے مزہ ہی دیتی رہی۔

"گڑیا!" کاشف کی آواز پر وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

"جی کاشی جی ــ!"

"دانو! چائے کی فرمائش ہے ــ" ساتھ کاشف شوخی سے مسکرا بھی رہا تھا۔

"وہ تو کاشی جی! آپ کی آواز سے ہی معلوم ہو گیا تھا" وہ جلدی سے باورچی خانے میں چلی گئی۔

دو چار سال پہلے فرصت ہی فرصت تھی تو سوچیں کوئی نہ تھیں اور اب ــــ بہت ڈھیر ساری سوچوں کے بوجھ سے دماغ ہر وقت بوجھل سا ہوا رہتا تھا۔ مگر وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ دو گھڑی کو کچھ سوچ کر اسے ہلکا کر لیا جاتا ــــ

دوپہر سکول سے آتی ــــ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر ذرا سا سستانے

کے بہانے سوچنے کو لیٹتی تو کاشی جی شہزاد کے ساتھ گھر میں آداخل ہوتے۔ امی کھانا بنانے لگ جاتیں —— وہ برتن وغیرہ نکالتی — ٹرے تیار کرتی — پھر کھانا ختم ہوتے ہی چائے کی فرمائش آجاتی —

چائے بنا کر دینے کے بعد فارغ ہو کر کمرے میں آتی تو پانچ بج چکے ہوتے پھر سکول کے کام اور امتحان کی تیاری کو وقت دیتی — اب تو یہ بھی بڑا ضروری ہو گیا تھا۔ بچپن میں تو ایسا کوئی احساس ہی نہ تھا — پڑھتی پڑھتی — نہ پڑھتی تو اسے کوئی پرواہ ہی نہ تھی — اتنا ہی تھا نا کہ فیل ہو جاتی —— لیکن دماغ اچھا تھا کبھی فیل ہوئی نہیں۔

اور اب تو یہ احساس شدت سے تھا کہ نہ پڑھا۔ خدانخواستہ فیل ہو گئی تو سسرال والے کیا کہیں گے —؟ اب تو عزت اور بے عزتی کے فرق کا بھی شعور آگیا تھا —

سسرال والوں کے خیال کے علاوہ جو اک آثم کا وجود تھا فہم و ادراک کی سرحد پہ پہنچتے ہی اس نے اک عجیب سا روپ دھار لیا تھا۔ اس نے اسے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ مگر چشم تصور اب اسے ہمہ وقت اپنے ارد گرد ہی پانے لگی تھی — دل میں ہر وقت اس کا خیال جاگزین رہتا — وہ اس کی عادات و مزاج سے بالکل ناآشنا تھی مگر جانے کیسے اور کب —— دماغ نے اسے اک عظیم ترین ہستی متصور کر کے، بڑی آن بان کے ساتھ دل کی چوکھٹ میں سجا لیا تھا —

اور اس اپنے ان دیکھے دیوتا کی پجارن یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے دیوتا کے کانوں تک اس کی کوئی غلط بات پہنچے — جس طرح وہ اسے مکمل اور اعلیٰ

ترین انسان سمجھتی تھی اسی طرح وہ خود ہر صفت کے ساتھ مزین ہو کر اس کے روبرو پیش ہونا چاہتی تھی —

وہ گھر کا ہر کام کرنے کی کوشش کرتی — وہ سلائی، کڑھائی اور بنائی وغیرہ میں لگی رہتی — وہ پڑھائی بڑے دھیان اور توجہ سے کرتی — اور یوں دن بھر مصروف رہنے کے بعد اپنے سب کاموں سے فارغ ہو کر رات گئے جب وہ پھر اسی کے سہانے اور من موہنے خیالات میں ڈوب جانے کے لئے بستر پر لیٹتی تو شہزاد صاحب کو رات کے گیارہ بجے چائے پینے کا دورہ پڑ جاتا —

"اس نے تو ہمیں تباہ و برباد کر کے چھوڑنا ہے —" وہ بآواز بلند بڑبڑاتے ہوئے چائے کا پانی چولھے پر چڑھا رہی تھی —

"ہائیں ہائیں! یہ کیا کہہ رہی ہو —؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں امی —! یہ ہر وقت کی چائے پر بھلا خرچ کوئی نہیں اٹھتا —؟"

"بیوقوفوں جیسی باتیں مت کیا کرو — اگر خرچ آتا ہے۔ تو وہ کسر بھی نکال دیتا ہے۔ کبھی کاشف کے لئے کوئی چیز اور کبھی تیرے لئے — کچھ نہ کچھ لئے ہی گھر میں داخل ہوتا ہے۔ سمجھو اپنی روٹی پانی کا خرچہ وہ دے دیتا ہے —"

"اور ہم جیسے اس کے غلام ہیں نا — ہم چیزیں نہیں لیتے — وہ اپنے ہوسٹل میں ہی رہا کرے —"

"بالشت بھر کی لڑکی کو باتیں کتنی بنانا آگئی ہیں —"

"کون بالشت بھر کی —؟ یہ گڑیا —" کاشف اندر آگیا —

ہنستے ہوئے امیّ سے کہنے لگا "آپ سے تو اونچی نکل گئی ہے امیّ ۔!"

"وہ تبھی عقل ٹخنوں میں چلی گئی ہے ۔" امیّ جلے تپے لہجے میں بولیں ۔

"ہُوا کیا آخر ۔۔؟"

"کاشی جی ۔۔!" امیّ کے کچھ بتانے سے پہلے ہی وہ بھائی کے آگے فریاد کرنے لگی "شہزاد کو کہہ دیں ۔۔ اپنے ہوسٹل میں رہا کرے ۔"

"کیوں ۔۔؟ کیوں میری گڑیا رانو ۔۔؟"

"یہ ہر وقت چائے بنواتا رہتا ہے ۔"

"دیکھو تو ذرا اس کی تمیز ۔۔ بڑے بھائی کے دوست کا نام کیسے بدتمیزی سے لے رہی ہے ۔"

"نہیں امیّ ! بدتمیزی نہیں ۔" کاشف ، اور گڑیا کی طرف داری میں نہ بولتا "میرا بھی تو نام ہی لیتی ہے ۔"

"بے شک نام لیتی ہے مگر تمیز سے جی اور آپ کہہ کر بات تو کرتی ہے اس کے ساتھ تو اسے خدا واسطے کا بیَر ہے ۔ ذرا بھی اس کی عزت نہیں کرتی ۔"

"میں نے اسے کبھی کچھ کہا ہے امیّ ۔ میں نے تو خود اس کے ساتھ کبھی بات ہی نہیں کی ۔"

"یہی تو مزید بدتمیزی ہے ۔ اوّل تو خود ہی اسے کبھی اس نے مخاطب نہیں کیا ۔ نہ سلام نہ دعا ۔ اور کبھی کبھار اگر تم موجود نہ ہو کاشی ! پھر اسے کوئی اشد ضرورت پڑ بھی جائے تو یہ مِس صاحبہ جواب ہی نہیں دیتی ۔ جانے خود کو کیا سمجھتی ہے ۔؟"

"کوئی بات نہیں امیّ ! ابھی ناسمجھ ہے ۔ دنیا داری نہیں جانتی ۔"

"کاشی جی ۔۔!" وہ بسوری ۔ کاشف مسکرا پڑا ۔ بھائی کو مسکراتے دیکھ

کر وہ بھی ہنسنے لگی ۔

"ہاں ہاں کہو ۔ کیا کہنے لگی تھیں ۔۔؟"

"مجھے آپ کا یہ شہزاد ذرا اچھا نہیں لگتا ۔" دل کی بات بڑی سچائی سے زبان پر لے آئی ۔

"تو نہ لگے ۔" بڑی سہولت سے کاشف نے جیسے بات ختم کر دی ۔

"ہمیں اس سے کیا لینا دینا ہے ۔ ایک دو سال میں پڑھائی ختم ہو جائے گی تو وہ اپنے گھر چلا جائے گا ۔"

"وہ تو کہتا ہے ۔ ایل ایل بی کر کے یہیں کراچی میں ہی وکالت شروع کرے گا ۔" امیّ نے بے دھیانی میں بات کی ۔

"دیکھ لیجئے ۔ ساری عمر کے لئے وہ بس کراچی کا ہو گیا ۔"

"تو پھر کیا ہے ۔ گڑیا ۔! وہ اگر کراچی کا ہو گیا ۔"

کاشف نے بڑے پیار سے اس کے خوبصورت اور معصوم چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اسے تسلیّ دی ۔ "دو چار سال تک تم خود ہی کراچی چھوڑ جاؤ گی ۔ تمہارا اصل گھر تو لاہور میں ہی ہو گا ۔"

"پھر ہم اسے بھی لاہور بھیج دیں گے ۔ سُنا ہے وکالت وہاں بھی بہت چلتی ہے ۔ کراچی سے بھی زیادہ ۔" امیّ کو شاید اس کی نوک جھونک کا بہت مزہ آ رہا تھا ۔ شوخی بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولیں ۔

"کب ۔۔ یہ کراچی زیادہ بڑا ہے ۔ مہربانی کر کے اسے یہیں رکھیں ۔" دھنک اپنی ہی رو میں کہتی چلی گئی ۔۔ امی اور کاشف دونوں ہی ہنس پڑے ۔۔ وہ چونکی ۔۔ پھر اسے احساس ہُوا کہ اس نے کیا کہہ دیا تھا ۔

"ادں — ہم نہیں کاشی جی سے بولتے —" چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے اُس نے پرلی دیوار کی طرف رُخ پھیرلیا۔

"اچھا مت بولو — مگر جلدی سے چائے تو بنا دو — ورنہ ابھی وہ فقیر چائے چائے کی صدا لگاتا ہوا یہیں آگھسے گا —"

"نہیں نہیں — میں بنا کر وہیں بھیجتی ہوں —" وہ جلد جلد چائے دانی میں چائے کی پتیاں ڈالنے لگی —

"بہت دن ہوگئے امی —! اس کی سسرال سے کوئی خط نہیں آیا"

"اچھا یاد دلایا — آج ہی خط آیا ہے — بتانا بھول ہی گئی تھی —"

"لو بھئی گڑیا —! مرچیں تھوک دو — گڑ کی بھیلی آگئی —"

"کاشی جی! آپ بڑے شریر ہیں —" وہ لال گلابی ہوگئی —

"کاشف بیٹے! ایک بڑی ضروری بات کرنا تھی —"

"جی امی! فرمائیے —"

"باہر آجاؤ — دھنک بیٹی! برتن تم سمیٹ لینا — دھو تو دیئے ہیں سارے ذرا خشک کرکے رکھ دینا —"

"اب سارے کام ہوجائیں گے امی! فکر نہ کریں —" کاشف آنکھوں کے گوشوں سے اسے دیکھتے ہوئے امی کے ساتھ ساتھ باورچی خانے سے باہر نکل گیا۔

برآمدے میں اپنے نماز والے چھوٹے تخت پر بیٹھتے ہوئے امی نے کاشف کا ہاتھ تھام کر اسے بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔

"ہفتے عشرے تک دھنک کی ساس اور سسر ہمارے ہاں آرہے ہیں —"

"بسم اللہ — سو بار آئیں —"

"یوں سمجھو کہ سمدھی بن کر پہلی بار آرہے ہیں —"

"ارے بھئی کاشف! ابھی تک چائے نہیں بنی —؟" شہزاد کاشف کے کمرے سے نکل آیا "یہ امی سے کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے —؟ کیا کوئی رازداری ہے —؟ کچھ احساس ہوتے ہی وہ اُلٹے قدموں واپس جانے لگا۔

"آجاؤ —" امی جلدی سے بولیں "تم سے کیا پردہ —؟" پھر وہ کاشف سے مخاطب ہوگئیں "میں کہہ رہی تھی بیٹی کی سسرال ہے — ان کی حیثیت کے مطابق ہمیں ان کا استقبال کرنا چاہیے —"

"ان کی حیثیت کے مطابق —؟" ماں اور بیٹے دونوں ہی کے چہروں پر فکر و تردّد کی گہری پرچھائیاں تھیں — شہزاد دونوں کے چہروں کو بغور دیکھتے ہوئے ان کے پاس ہی آبیٹھا —

"لیکن امی! ہم تو اپنی ہی حیثیت کے مطابق ان کا استقبال کرسکیں گے"

"اگر اپنی بھی حیثیت کے مطابق کریں تو تمہیں معلوم ہے کہ انھیں ہماری کس حیثیت کا علم ہے —؟ جو تمہارے ابا کے وقت تھی —"

"آپ کی اور ان کی اتنی خط و کتابت ہے — کیا آپ نے کبھی اشارۃً بھی انہیں کچھ نہیں بتایا —؟"

"نہیں بیٹے —! آج کل کے زمانہ میں اتنا اچھا لڑکی کا رشتہ ملنا کوئی آسان ہے —!!"

"اگر وہ ظاہری شان و شوکت کو ترجیح دینے والے لوگ ہیں تو پھر ہمارا اور ان کا میل ذرا . . . ."

"نہ نہ بیٹے!" امی نے کاشف کی بات پوری سُنی بھی نہیں — ایسی کوئی بات

مُنہ سے نہ نکالنا — ہمارے ہاں منگنی نکاح کے برابر ہوتی ہے — اور یہ منگنی تو بچپن کی ہے — اس سے بھی مضبوط تر — !"

" پھر انہیں ہماری ہر حیثیت قبول ہونی چاہیے امی — !"

" انہیں تو قبول ہو گی ہی — مگر ہمارا بھی کوئی وقار ہے، کوئی عزت ہے — میں تو تمہاری کمائی کی آس پر تھی — آج ایسی حیثیت ہے کل ہی انشاء اللہ بدل جائیگی — بس تمہاری نوکری لگنے کی دیر ہے — پھر اس وقتی مسئلے سے ہمیشہ کے لیے چھوٹے کیوں نہیں — واسطہ بیٹی کی سسرال سے ہے نا —" پھر امی تشویش بھرے لہجے میں بولیں —" پتہ نہیں کیوں اُنہوں نے اچانک ہی آنے کا پروگرام بنا لیا ہے —"

" اچانک کی کیا بات ہے — ؟ ان کی امانت ہمارے پاس ہے — وہ یہاں ہر وقت ہی آنے کا حق رکھتے ہیں —"

" یہ تو تم نے ٹھیک ہی کہا — میں کہتی تھی صرف پانچ سو روپے کا کہیں سے بندوبست ہو جاتا نا —"

" اکٹھا پانچ سو — ؟ کس لیے — ؟"

" بیٹے ! کچھ گھر کا نک سک درست ہو جاتا اور سو ڈیڑھ سو ان دو چار دنوں کے خرچ اخراجات کے لیے رکھ لیتی —"

" ان کی خاطر تواضع تو اچھی طرح کرنی ہی چاہیے مگر یہ گھر پر خرچ کرنے کا کونسا موقع ہے — ؟"

" گھر کی حالت ہی تو سارے بھید کھولتی ہے کاشی ! بستروں کی چادریں ہیں تو وہ پھٹی ہوئیں — ضرورت کے لیے پورے برتن نہیں ہیں — صوفوں کی حالت علیحدہ خراب ہے — دو دو فٹ گہرے گڑھے پڑے ہوئے ہیں — پردوں کے

رنگ بھی بے رنگ ہو چکے ہیں —"

" امی — !" کاشف گھبرا کر بولا — یہ سب کچھ سوچنے لگیں تو دو چار سو تو کیا کم از کم ہزار روپیہ اُٹھ جائے گا —"

" ہزار کیوں — ؟ بہت قیمتی چیزیں تو لینا نہیں چاہئیں — صرف سفید پوشی کا بھرم رکھنا ہے —"

" مگر امی ! اتنی رقم — ؟" وہ سوچوں میں کھو گیا — پھر پریشانی بھرے لہجے میں دھیرے سے بولا —" کرایہ داروں سے پوچھ لیں — کچھ پیشگی اگر وہ دے دیں —"

وہ تو اسی مہینے کے شروع میں اگلے دو ماہ کا پیشگی لے چکی — پراپرٹی ٹیکس اور ہاؤس ٹیکس دینا تھے — پانی کا بھی دو سال کا اکٹھا ہوا تھا — نلکا کٹ جاتا تو — ؟"

" ان حالات میں بھی امی ! آپ ...."

" یار ! چھوڑو بھی بحث —" شہزاد پاس سے بولا —" امی ! آپ فکر نہ کریں — کل ایک ہزار روپیہ آپ کو مل جائے گا —"

" ایک ہزار روپیہ — ؟ نہیں نہیں —" کاشف کا جیسے دم گھٹ گیا تھا کھینچ کر لمبا سا سانس لیتے ہوئے بولا —

" ابھی میں تمہاری پچھلی رقمیں بھی نہیں لوٹا سکا —"

" کونسی — ؟"

" وہ جو الیف — اے کے داخلے کی فیس تم نے دی تھی — اور پھر اس کے بعد بی — اے کا داخلہ اور کتابوں وغیرہ —"

" جانے بھی دو یار — ! کیوں خلوص کو روپوں سے تولتے ہو — بھول جاؤ

ان زخموں کو ۔۔"

"نہیں شہزاد! ایسی بات پھر نہ کہنا ۔۔ وہ میں نے قرض لیا تھا۔"

"لیکن میں نے تمہیں کوئی قرض ورض نہیں دیا ۔ میں خود کو اس گھر کا اک فرد ہی سمجھتا ہوں۔" وہ امی کے قریب ہو کر سر جھکاتے ہوئے بولا "کیوں امی؟ میں آپ کا بیٹا نہیں ۔۔؟"

"کیوں نہیں ۔۔؟" امی جلدی سے شہزاد کے جھکے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔ "تم کاشف سے پہلے۔"

"تو اسے کہہ دیجئے ۔۔ ایسی باتیں نہ کیا کرے ۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"

"نہیں نہیں ۔۔" امی جلدی سے بولیں "تمہیں تکلیف پہنچانے کے لیے یہ ایسی باتیں نہیں کرتا ۔ بس ذرا احساس زیادہ ہے نا۔"

"میں پہلے ہی کہتا تھا کہ بی۔اے کر کے کیا ہو جائے گا مجھے ابھی سے نوکری کر لینی چاہیے۔" کاشف بڑبڑایا۔

"پھر وہی احمقوں والی بات ۔۔ ڈگری پاس ہو تو کام دے ہی جاتی ہے۔" شہزاد اسے سمجھانے کے انداز میں بولا پھر موضوعِ سخن بدلنے کی خاطر زور سے ہانک لگائی "چائے ۔۔ ایک پیالی چائے کا سوال ہے ۔۔؟"

"میں جا کر دیکھتا ہوں۔" کاشف کھویا کھویا سا اٹھ کر باورچی خانے میں چلا گیا۔

"گڑیا! ابھی چائے نہیں بنی ۔۔؟" وہ نیچے چوکی پہ چپ چاپ گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی

"اے گڑیا ۔۔!" کاشف اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گیا ۔ وہ پھر بھی نہیں بولی تو بڑے پیار سے، بہت ہولے سے اس نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔

"ارے تو تو رو رہی ہے ۔۔" وہ یکدم گھبرا اٹھا "بتا نا ۔ کیا ہوا ۔؟" گلابی مائل سفید سفید اس کے رخساروں پہ بہتے اس کے آنسوؤں اور تیزی سے اٹھتی گرتی اس کی لمبی لمبی پلکوں کو کاشف بڑے غور سے تک رہا تھا۔ "بتاتی نہیں کیا ہوا ہے ۔۔؟"

"کاشی جی ۔۔!" دھنک نے اک طویل سی سسکی لیتے ہوئے کاشف کے کندھے کے ساتھ پیشانی ٹیک دی ۔ "آپ شہزاد سے کچھ نہ لیں ۔ کاشی جی! اس سے کچھ نہ لیں۔" وہ سسک سسک کر کہے گئی ۔ "اس سے کسی قسم کی مدد لینا مجھے اچھا نہیں لگتا ۔ ہم کوئی گداگر ہیں کاشی جی ۔۔!" کاشف سے وہ ہر بات بلا جھجک کر لیا کرتی تھی ۔۔ دل کی ہر بات ۔۔! وہ روئے گئی ۔ "بس! ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے ہم اسی سے گزارہ کر لیں گے کاشی جی! وہ لوگ آ رہے ہیں تو بہتر ہے اپنی آنکھوں سے ہماری اصل حقیقت دیکھ لیں ۔ اگر ہماری یہ حیثیت انہیں قبول ہوئی تو پھر ٹھیک ہے ورنہ۔"

"ورنہ کیا ۔۔؟" کاشف گویا اسے بہلانے کے لیے ہنستے ہوئے شوخ سے لہجے میں بولا ۔ "آ تم کو گھر بیٹھے ہی طلاق ۔۔؟"

دھنک کا جھکا ہوا سر اٹھا ۔ سارا وجود کپکپایا ۔ مگر صرف ایک لمحہ کے لیے ۔ دوبارہ سر جھکاتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولی "ہاں ۔۔! پھر یہ رشتہ ختم کر دیجئے گا۔"

"بیوقوف ۔۔!" کاشف نے اس کا سر سینے کے ساتھ لگا لیا ۔ "آئندہ لمحہ بھر کے لیے بھی ایسا خیال دل میں نہ لانا۔" پھر وہ گھمبیر سی آواز میں بولا ۔ "اگر آنے والے مہمانوں کے لیے امی کچھ کرنا چاہتی تھیں تو یہ صرف تمہارے کاشی جی کی

عزت کے لیے ہے۔سمجھیں ۔۔؟ اور دوسری بات ۔۔اگر شہزاد سے ہم کچھ لے رہے ہیں تو صرف قرض ۔۔ مدد نہیں ۔۔بھیک نہیں ۔۔تیرا بھیا بھی تیرے ہی جیسا غیرت والا ہے گڑیا! امتحان کے فوراً بعد نوکری کر لوں گا ۔۔گھر میں بے شک فاقے رہیں مگر پہلی تنخواہوں سے انشاءاللہ اس کا قرض اتاروں گا۔ لو اب ہنس دو فٹا فٹ ۔۔" کاشف نے پھر اس کی ٹھوڑی تھامتے ہوئے اس کا چہرہ اونچا کیا۔ "ہنسو بھی ۔۔"

"اور شبنم میں بھیگا پھول کھلا تو اس کی خوبصورتی قابل دید تھی۔ کاشف کی نگاہیں جھک گئیں ۔۔"نظر ہی نہ لگ جائے میری گڑیا کو ۔۔۔!" دل نے سوچا

"شاباش! لو اب چائے بنا دو ۔۔" کاشف نے اپنی ہتھیلیوں سے اس کے بھیگے رخسار صاف کئے ۔۔

"چائے تو بنا کر یہ رکھی ہوئی ہے ۔۔"

"ارے! تو پھر رونا کس بات کا تھا ۔۔؟" کاشف خوش دلی سے بولا۔ بڑے پیار سے اس کے سر پہ اک چپت لگائی اور پھر چائے کے برتنوں والا ٹرے اٹھا کر گنگناتے ہوئے باورچی خانے سے باہر نکل گیا۔

"لاکھوں کروڑوں میں، اربوں میں کھربوں میں، میری اک بہنا ہے ۔۔"

دھنک کے چہرے پہ بڑی خوبصورت سی مسکراہٹ پھیل گئی ۔۔

○

"عید پہ کراچی جائیں گے ۔۔" "اچانک کاروبار کے سلسلے میں مجھے پشاور جانا پڑ گیا ہے۔ اب عید کے بعد چلے جائیں گے ۔۔" "اس مہینے بھی نہیں جا سکوں گا ۔۔ اگلے

مہینے کا پروگرام بنا لو ۔۔"

یوں کرتے کرتے ابا میاں نے پورا ایک سال گزار دیا تھا ۔۔تب ۔۔ایک دن ساجدہ بیگم نے ان سے خوب جھگڑا کیا ۔۔ تھوڑے سے آنسو بھی اس سلسلے میں بہا دیئے ۔۔ اور بیگم کے آنسو ۔۔جیسے ان کے دل پر ٹپک رہے تھے ۔۔آخر باقی سارے پروگرام کینسل کر کے انہوں نے اگلے ہفتے کا پکا وعدہ کر لیا۔

کاروباری مصروفیات میں کھو کر وہ تو شاید ان سے کیا یہ وعدہ بھی توڑ دیتے کیونکہ بیوی سے کیا ہر وعدہ وہ پورے حقوق سے توڑ دیا کرتے تھے۔ مگر اب یہ وعدہ نہیں ٹوٹ سکتا تھا ۔۔ ساجدہ بیگم ان کے مزاج سے واقف تھیں۔ اس بار انہوں نے بڑی ہوشیاری دکھائی ۔۔ دھنک کی امی کو اپنے پہنچنے کے متعلق نہ صرف یہ کہ خط ہی لکھ دیا بلکہ دن اور وقت بھی بتا دیا ۔۔ یوں ابا میاں اس وعدے کے پابند ہو گئے ۔۔ ساجدہ بیگم کی تیاری تو پہلے ہی تھی کچھ اور بھی جلد جلد کرنے لگیں ۔۔اور صنم ان کے جانے کا سوچ سوچ کر ابھی سے اداس ہوئی جا رہی تھی ۔۔ وہ چپ چاپ آ کر ان کے پاس بیٹھ گئی ۔

رنگا رنگ کپڑوں کا ڈھیر لگائے وہ بیٹھی کچھ سی رہی تھیں ۔صنم کو دیکھتے ہی مسکرانے لگیں ۔۔"اچھا ہوا میری بیٹی آ گئی ۔۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ پرسوں تک یہ سارا کام کیسے ختم ہوگا ۔۔"

"جو میرے کرنے والا ہے وہ میں کئے دیتی ہوں امی بیگم ۔۔!"

"خود غرضی کا زمانہ ہے بیٹی! اسی لیے تو زیادہ جذبے سے یاد کر رہی تھی ۔۔" امی بیگم نے پیار سے اور شرارت سے چشمے کے اوپر سے اسے دیکھا۔

"زمانہ خود غرض ہو جائے مگر میری امی بیگم نہیں ہو سکتیں ۔۔ اس کا مجھے پورا

یقین ہے۔"

"خدا تمہارا بھلا کرے بیٹی! ایسا اعتماد اپنی امی بیگم پر رکھتی ہو۔ اللہ قائم رکھے ۔۔۔ اور لو یہ سوئی پکڑو ۔۔۔ اس سفید دوپٹے پر لپہ لگانا شروع کر دو ۔۔۔ آتا ہے نا ۔۔۔؟"

"ہاں ہاں ۔۔۔ ابھی پچھلی عید پہ انجو اور رادی کی اوڑھنیوں پر لگایا تھا ۔۔۔ دیکھا نہیں تھا آپ نے ۔۔۔؟"

"وہ تمہیں نے لگایا تھا ۔۔۔؟" امی بیگم نے غیر یقینی انداز میں اسے دیکھا۔

"سچی امی بیگم ۔۔۔ خدا کی قسم ۔۔۔!"

"پھر ۔۔۔ پھر خدا کی قسم ۔۔۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ بات بات پر قسمیں کھانے والا انسان جھوٹا لگتا ہے ۔۔۔"

"اوہ! معاف کر دیجیے ۔۔۔ یاد ہی نہیں رہتا۔" صنم نادم سی ہو کر جلد جلد لپہ لگانے لگی "بڑا پیارا دوپٹہ ہے۔ ملائم اور باریک سا ۔۔۔ امی بیگم! اس کپڑے کو کیا کہتے ہیں ۔۔۔؟"

"شیفون ۔۔۔"

"ہاں ہاں ۔۔۔ شیفون ۔۔۔ بھول ہی جاتی ہوں۔"

"ساری زندگی واسطہ پڑتا ہے ۔۔۔ ہر کپڑے کا نام خود ہی یاد ہو جائیگا۔"

"یہ قرمزی سوٹ بھی دھنک کا ہی ہے ۔۔۔؟"

"ہاں ۔۔۔"

"اس کے گورے رنگ پر بہت اُٹھے گا۔"

"بہوت ۔۔۔" امی بیگم نے بہت کو اتنا لمبا کر کے کہا کہ صنم اسے دیکھے بغیر ہی جیسے اس کے رنگ روپ سے متاثر ہو گئی۔

"میرا بڑا دل چاہتا ہے اسے دیکھنے کو۔"

"دیکھ لینا۔"

"مگر کب ۔۔۔؟"

"بس! دو تین سال تک ۔۔۔"

"وہ یہاں آئے گی ۔۔۔؟"

"ہاں ۔۔۔" امی بیگم کے چہرے پر خوبصورت سی مسکراہٹیں پھیل گئیں۔

"دو تین سال تک ۔۔۔ اتنی دیر سے کیوں ۔۔۔؟ آپ اپنے ساتھ ہی اسے لیتی آئیے نا۔"

"نہیں بیٹی! ابھی وقت نہیں۔" ان کے ذومعنی فقرے کو صنم سمجھ تو نہ سکی مگر اس نے دوبارہ وضاحت سے اس کے معنی پوچھے بھی نہیں ۔ یہ اس کی عادت تھی۔ کبھی کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتی تھی اور نہ ہی کسی بات کی جستجو کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی ۔۔۔ سر جھکا کر جلد جلد سوئی چلانے لگی۔

"ارے! یہاں تو سلائی کا سکول کھلا ہوا ہے۔" آثم مسکراتے ہوئے داخل ہوا۔ "آداب امی بیگم! اور ۔۔۔ صنم کے لیے ۔۔۔" جھک کر اس کے سر پہ اک چپت لگاتے ہوئے بولا "یہ ۔۔۔!"

"دیکھ لیجیے امی بیگم! آتے ہی مجھے مارنے لگے۔"

"اثمی! انسان بن ۔۔۔"

"بن گیا جی۔" وہ ماں کے گھٹنے کے ساتھ گھٹنا ملا کر بیٹھتے ہوئے بولا ۔۔۔ "اور حکم ۔۔۔؟" نگاہیں، سر جھکائے بیٹھی تیزی سے سوئی چلاتی ہوئی صنم پہ ٹکی تھیں۔

"کھانا کھانا ہے ۔۔۔؟"

"میری ماں یہاں ہے ۔۔۔ کالج میں میری کوئی ماں نہیں بیٹھی ہوئی جو مجھے

کھانا کھلا دے گی ۔"

" بڑا ارمان ہے کالج میں بھی اک ماں رکھنے کا ۔"

" ہے تو ۔" ماں کے مذاق پہ وہ بھی شوخ ہو گیا ۔

" تو پھر باپ سے کہو ۔"

" باپ اس ماں کی زلفوں کی گرہوں سے نکلے تو ۔ ۔ ۔ !"

" بکواسی ۔ !" امی بیگم نے سُرخ ہوتے ہُوئے اور اس کی کمر پہ پیار سے ہاتھ پھیرتے ہُوئے کپڑا نیچے رکھ دیا ۔

" کیوں ۔ ؟ امی بیگم ! کام کیوں چھوڑ دیا ۔ ؟"

" تمہارے لیے کھانا نہ نکالوں ۔ ؟"

" اور وہ گلابو بی بی کہاں گئی ۔ ؟" آثم نے ان کا بازو تھام لیا ۔

" اس کی لڑکی بیمار تھی اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہے ۔"

" گلابو تو امی بیگم ! آپ نے بس نام کی رکھی ہُوئی ہے ۔"

" نہ بیٹے ! ایسے نہ کہو ۔ بیماری بیماری ہر انسان کے ساتھ ہوتی ہے ۔" وہ اُٹھ کھڑی ہُوئیں ۔

" تو یہ صنم کس مرض کی دوا آپ کے پاس بیٹھی ہے ۔ یوں تو خود کو آپ کی بیٹی کہتی ہے ۔ اور ماں کو کام کرتے دیکھ کر جوان بیٹی کو شرم نہیں آتی ۔ ؟"

" وہ ۔ وہ ۔ مجھے امی بیگم نے کہا ہی نہیں ۔ ورنہ میں کیا انکار کر دیتی ؟"

صنم نے گھبرا کر ، قدرے شرمندہ سی ہوتے ہُوئے جلدی سے سوئی دوپٹے پہ ٹانکی اور اسے نیچے رکھ دیا ۔

" کیا امی بیگم ہی ضرور کہتیں ۔ تمہیں خود کو علم نہیں تھا کہ صبح کا ناشتہ کر کے گیا

ہوا ہوں اور اب کیا وقت ہے ۔ ؟"

صنم اُٹھتے اُٹھتے ہولے سے بولی ۔" میں نے بھی بس صبح کا ناشتہ ہی کیا ہُوا ہے ۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ ذرا پیٹو زیادہ ہو ۔"

" دیکھ صنم ! اب میں بھی بڑا ہو گیا ہوں اور تم بھی ۔ مجھ سے عزت سے بات کیا کرو"

" ہاں بیٹی ! بڑا بھائی ہے ۔" امی بیگم کی بات پر آثم نے چونکتے ہُوئے دونوں کو باری باری دیکھا ۔ امی بیگم تو پھر سر جھکا کر مصروف ہو چکی تھیں اور صنم نے شاید سُنا ہی نہ تھا ۔ رُخ پھیرے باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی ۔

آثم کا لال بھبھوکا چہرہ چند لمحوں بعد آپ ہی آپ متوازن ہو گیا ۔

" یہ اتنے ڈھیر سارے کپڑے کس کے لیے بن رہے ہیں امی بیگم ۔ ؟"

" کیسے ہیں ۔ ؟"

" بڑے پیارے ۔ بے حد خوشنما ۔ ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت رنگ ہے ۔ لیکن ہیں کس کے لیے ۔ ؟ آپ تو اس عمر میں ایسے گوٹے کناری والے پہننے سے رہیں ۔"

امی بیگم نے مسکراتے ہُوئے گول مول سا جواب دیا ۔" تیری شادی پر ایسے ہی جھلمل جھلمل کرتے پہنوں گی ۔"

" وعدہ ۔ ؟" آثم نے شوخی سے ایک آنکھ دباتے ہُوئے ہاتھ پھیلا دیا ۔

" بالکل ۔ پکا وعدہ ۔ ایک ہی ایک میری اولاد ہو ۔ سارے ارمان تجھی پہ تو پورے کروں گی ۔"

" لیکن میرا سوال تو وہیں کا وہیں رہ گیا ۔ حل ہوا ہی نہیں ۔"

" کونسا ۔ ؟"

"کہ یہ کس کے ہیں جو آپ اتنے ذوق وشوق سے بنا رہی ہیں۔ کتنے ہی دنوں سے میں آپ کو اس مصروفیت میں کھویا دیکھ رہا ہوں۔"

"اور پوچھنے کی فرصت آج ملی۔۔۔؟" امی بیگم نے شاکی انداز میں کہا۔

آتم خجل سا ہو کر رہ گیا۔ "میرا خیال ہے آج بھی خواہ مخواہ ہی پوچھا۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"جواب جو نہیں ملا۔" پھر آتم جلدی سے ہنس کر بولا۔ "اسی لیے پہلے بھی نہیں پوچھتا تھا۔"

"بڑے چالاک ہو۔" امی بیگم مسکرا پڑیں۔

"آداب عرض ہے۔۔!" اس نے بڑے پیارے انداز میں پیشانی جھکائی

امی بیگم اس کی اس ادا پہ نہال سی ہو گئیں۔

"پرسوں میں اور تمہارے ابّا میاں کراچی جا رہے ہیں۔"

"وہ تو مجھے بہت دنوں سے معلوم ہے۔"

"یہ کپڑے دھنک کے ہیں۔"

"یہ اتنے سارے۔ چار پانچ سوٹ ہوں گے۔" آتم متحیر سا ہوتے ہوئے بولا

"ہاں۔" امی بیگم کے لہجے میں تفاخر تھا۔ "سبھی اس کے ہیں۔"

"میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آیا کہ دھنک کی ماں کے ساتھ آپ کی اتنی گہری دوستی کیوں ہے۔؟ ہر تیسرے دن خط آ رہا ہے۔ ہر دوسرے دن خط جا رہا ہے۔ اپنی حقیقی بہنوں سے آپ کا اتنا میل جول نہیں رہا جتنا اس منہ بولی بہن کے ساتھ ہے۔"

امی بیگم آتم کی بلند آواز میں بڑبڑاہٹ سنتی رہیں اور مسکراتی رہیں۔ پھر

بڑے انداز سے بولیں۔ "بس! اپنی اپنی طبیعت ہے۔ میری ان کے ساتھ ذرا زیادہ بنتی ہے۔"

"ذرا زیادہ نہیں۔ بہت زیادہ۔" آتم قدرے تند لہجے میں بولا۔

"ہاں بہت زیادہ کہہ لو۔"

"اور اب یہ اتنے ڈھیر سارے اور اتنے خوبصورت کپڑے بھی ان کی بیٹی دھنک کے لیے۔" جانے کیوں اسے غصّہ آئے جا رہا تھا۔ "صنم ہر وقت آپ کے پاس ہوتی ہے۔ بیٹی بیٹی کہتے آپ کا منہ سوکھتا ہے مگر کبھی اس کے لیے ایسے کپڑے بنائے ہیں۔۔۔؟ ان لوگوں نے تو جیسے آپ پر کوئی جادو کر دیا ہوا ہے۔"

"محبّت سب سے بڑا جادو ہوتا ہے بیٹے۔۔۔!"

"اور باقی لوگ تو جیسے دشمنی کرتے ہیں۔"

"اے صنو بیٹا! جلدی سے کھانا لا دے اسے۔ مجھ ہی سے لڑے جا رہا ہے۔" امی بیگم ہنستے ہوئے بولیں۔

"امی بیگم! دونوں سالن بڑے سخت ٹھنڈے برف ہو رہے تھے۔ سردی بھی تو اتنی ہے۔ جلدی گرم ہی نہیں ہو پاتے۔ بس ابھی لائی۔"

"پھر۔۔؟ آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔" وہ پھر ان سے اُلجھا۔ "صنم کے لیے کیوں نہیں بنائیں۔۔؟"

"پچھلی عید پہ بنائے نہیں تھے۔۔؟"

"صرف ایک سوٹ۔۔ وہ بھی یوں گوٹے لپے والا نہیں۔ نہ ہی کپڑا ایسا قیمتی تھا۔" اس نے عجیب طرح کا منہ بنایا۔

امی بیگم کی بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔ "تو تو پاگل ہو گیا ہے۔ چھ سات سال

بعد ان کے گھر جا رہی ہُوں ۔ کیا خالی ہاتھ چلی جاؤں ۔۔؟"

"ایک آدھ کافی تھا۔"

"اب تجھے کیا بتاؤں ۔ ۔؟ خواہ مخواہ ہی مجھ سے جھگڑے جا رہا ہے ۔ جاؤ ہاتھ منہ دھو کر آؤ ۔ کھانا گرم ہو چلا ہوگا ۔"

امی بیگم کی منطق بھی ہمیشہ نرالی ہی ہُوا کرتی تھی ۔ وہ اُلجھتا، جھنجھلاتا اور غصّے سے کھولتا ہُوا اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"صنو سے کہیئے گا میرے کمرے میں ہی کھانا دے دے ۔" وہ دھپ دھپ پاؤں مارتا اپنے کمرے میں چلا گیا ۔

ہاتھ منہ دھوتے ہُوئے بھی اسے خالہ نصرت اور دھنک پر غصّہ ہی آ تا رہا ۔ کچھ ایسا امی بیگم کو اُنھوں نے اپنے جال میں پھنسایا تھا کہ نہ انھیں اپنے ارد گرد بسنے والوں کے حق حقوق کا خیال رہ گیا تھا اور نہ کسی کی پرواہ ۔۔ !

ہر عید بقر عید پر صنم کو محض چوڑیوں، ربنوں اور ایسی ہی ناکارہ اور چھوٹی موٹی چیزوں پر ٹرخا دیا جاتا اور وہاں دھنک کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں پارسل کی جاتی تھیں ۔ قیمتی سے قیمتی چیزیں خرید خرید کر بھیجی جاتی تھیں جانے انھیں کیا ہو گیا تھا ۔؟ حق دار کا حق مار مار کر دوسری کو دیئے جا رہی تھیں ۔

"انی بھیا ! کھانا آ گیا ۔"

وہ ابھی غسل خانے میں ہی تھا ۔ صنم کی آواز اس کے کان میں پڑی ۔ وہ پہلے ہی غصّے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا ۔ اُوپر سے صنم کے منہ سے بھیا کا لفظ سُنا ۔ غصّے کا پارہ کئی درجے اور بلند ہو گیا ۔۔ تولیے سے ابھی اچھی طرح ہاتھ منہ پونچھے بھی نہیں تھے ۔۔ سٹینڈ پر واپس پھینک جلدی سے باہر آ گیا ۔ صنم میز پر کھانا رکھ رہی تھی ۔

"کیا کہہ رہی تھیں ۔۔؟" وہ عین اس کے سامنے آ کھڑا ہُوا ۔ آنم کی سُرخ انگارہ آنکھیں دیکھ کر وہ کانپی ۔

"میں نے ہزار بار تمہیں منع کیا ہے کہ مجھے بھائی یا بھیا مت کہا کرو ۔ غصّے میں وہ پاگل ہو رہا تھا ۔ اپنا ہوش نہیں تھا تو اس کا کس طرح رہتا ۔ چٹاخ سے ایک تھپڑ اس کے پھول سے رخسار پر جڑ دیا ۔ صنم کو شاید اتنے سخت سلوک کی کی توقع نہیں تھی ۔۔ آندھی کی زد میں آئے درخت کی طرح ڈولی ۔ اور پھر گرنے ہی لگی تھی کہ آنم کو جیسے ہوش آ گیا ۔ جلدی سے بڑھ کر اُس نے گرتی گرتی کو بازوؤں پر روک لیا ۔

وہ رخسار پر ہاتھ رکھتے ہُوئے سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی ۔۔ وہ دبلی پتلی کمزور سی لڑکی ۔۔ آنم کو اب احساس ہُوا کہ اُس نے کس ظالمانہ طریقے سے اور کتنی زور سے اسے تھپّڑ مارا تھا ۔ امّی بیگم کا غصّہ بھی شاید اس معصوم اور بے گناہ پر اُتارنے کی کوشش کی تھی ۔ کتنی زیادتی تھی اس کی ۔۔ یکایک ڈھیر سارے پچھتاوے من میں اُتر گئے ۔ اُس نے بے اختیار ہوتے ہُوئے صنم کو سینے کے ساتھ لگا لیا ۔

"مجھے معاف کر دو صنو ۔۔ ! مجھے معاف کر دو ۔"

وہ اس کے سینے کے ساتھ لگی سسکیاں بھر بھر کر روئے گئی ۔ اس کا سارا وجود کپکپا رہا تھا ۔

"بس ! اب چپ بھی کر جاؤ نا ۔۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے ۔"

"اور جو تھپڑ مارا تھا اس کی تکلیف نہیں ہُوئی تھی ؟ اب رونے کی ہونے لگی ہے ۔۔" وہ چیخ کر بولی ۔

"وہ تو غصّہ آگیا تھا — پہلے امی بیگم پر آیا ہُوا تھا۔ اُوپر سے تم نے بھیّا کہہ دیا۔ کتنی بار تمہیں سمجھایا ہے کہ تم مجھے بھیا مت کہا کرو۔"

"تم کتنے ہو نہ کہوں — امی بیگم کہتی ہیں عزت کیا کرو — آخر میں پھر کردں کیا؟ کس کا کہاں مانوں اور کس کا نہ —" وہ رونے گئی — بہت چھوٹے بچوں کی طرح بلک بلک کر اور ہچکیاں لے لے کر۔

"ایک تو یہ امی بیگم ہر وقت میرا نکاح توڑنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔" آتم جھنجھلا کر بولا۔

"کیا — ؟" سب سسکیاں، ہچکیاں یکایک تھم گئیں۔ چہرے پر سے ہاتھ ہٹاتے ہُوئے صنم تعجب بھرے لہجے میں بولی "تمہارا نکاح توڑتی ہیں — ؟ کونسا؟ تمہارا نکاح ہو چکا ہے — ؟"

"ہاں —" آتم مسکرا پڑا۔ اتنی خوبصورت اس کی مسکراہٹ تھی۔ صنم اس کے چہرے کی طرف دیکھے ہی گئی۔

"کس کے ساتھ — ؟" تعجب اور بھی بڑھ گیا۔

"تمہارے ساتھ۔"

"میرے ساتھ — ؟" پہلے صنم سٹپٹائی — پھر اس کے چہرے پر عجیب سی گھبراہٹ پھیلی — پھر یکدم سُرخ ہوگیا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

"کب — ؟" شرم میں ڈوبی اس کی کپکپاتی آواز اُبھری "کب تمہارے ساتھ میرا نکاح ہُوا ہے — ؟"

مختلف رنگ بدلنے والا اس کے چہرے کا نظارہ بڑا مسحور کن تھا۔ پلکوں پر آنسو موتیوں کی جھالروں کی طرح ٹکے تھے۔ رخسار شرم سے گلنار ہو رہے

تھے۔ گلابی ہونٹوں پر بڑی خوبصورت سی کپکپاہٹ تھی۔ وہ ایک ٹک اسے تکے ہی گیا۔

"بتاؤ نا — کب تمہارے ساتھ میرا نکاح ہُوا ہے — ؟"

"بھئی یہ دل کے معاملے ہیں — سمجھ کے معاملے ہیں — میرے دل نے تمہیں قبول کر لیا ہے۔ میری سمجھ تمہیں اپنا اور بالکل اپنا مان چکی ہے۔ ایک آدھ سال کی اور بات ہے۔ تم بھی سب کچھ سمجھنے لگوگی۔ پھر تم بھی اس کا اعتراف کرنے لگوگی انشاء اللہ — کہ تم صرف میری ہو — اور یہی شادی ہوتی ہے اور یہی نکاح ہوتا ہے۔"

وہ سامنے کھڑی بڑے دھیان اور توجہ سے اس کی بات سُن رہی تھی۔

"اور ایک بار پھر تنبیہہ کر دوں — آئندہ مجھے بھائی مت کہنا۔ اگر پھر کبھی ایسا لفظ زبان سے نکالا تو اس سے بھی زیادہ بُری طرح پیش آؤں گا۔" آتم صنم کے کچھ شرم میں اور کچھ گھبراہٹ میں ڈوبے سراپا کو دیکھتے ہُوئے کھانا کھانے کے لیے کرسی پر بیٹھ گیا۔

ابھی کھانا نہیں کھانے لگا تھا۔ یکایک ذہن کے دریچے میں جانے کیا در آیا۔ مسکراتے ہُوئے بولا۔

"یاد ہے صنو! تم دلہن بنا کرتی تھیں اور میں دولہا۔ اور وہ ہمارے ساتھ والے جو قریشی صاحب تھے نا — ان کے تینوں بچے باری باری ہمیں یعنی دولہا اور دلہن کو ٹھیکریاں رونمائی میں دیا کرتے تھے۔"

"ہاں — یاد ہے۔" وہ بھی زور سے ہنس پڑی۔

"میں تو سمجھتا ہوں اسی وقت ہماری شادی ہوگئی تھی۔"

"خواہ مخواہ ہی ۔" وہ منمنائی ۔ لیکن اب اس کی آواز میں تندی کے بجائے شرمیلی شرمیلی سی نرمی تھی ۔

"خواہ مخواہ کا کیا مطلب ۔ میں نے تو دل میں پکا سمجھ لیا ہوا ہے ۔"

"ایسے ہی ۔" وہ باہر کی طرف بھاگی ۔

"صنو! سنو تو ۔" آثم کی آواز تو ہمیشہ ہی اس کے پاؤں کی زنجیر بن جایا کرتی تھی ۔ یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی ۔ وہ اس کا اثمی تھا ۔ وہ وہیں تھم گئی ۔ آثم اُٹھ کر اس کے قریب چلا آیا ۔ "کیا تمہیں سچ مچ کی میری دلہن بننا پسند نہیں ۔ ؟"

وہ چپ چاپ کھڑی رہی ۔ یہ اثمی آج کیسی باتیں کئے جا رہا تھا ۔ مگر ایسا تو اُس نے بھی کئی بار سوچا تھا ۔ اپنے آپ ہی ۔ انجانے میں ہی ۔

اس لیے ۔ کہ اسے امی بیگم اور ابا میاں بہت اچھے لگتے تھے ۔ اسے اثمی سے بہت پیار تھا ۔ وہ ان سب کے بغیر اک پل نہیں رہ سکتی تھی ۔ اور اب ہی ۔ کچھ ہی عرصہ پہلے اسے معلوم ہوا تھا کہ جب ایک لڑکی دلہن بنتی ہے اس کی شادی ہوتی ہے تو پھر وہ اپنا گھر چھوڑ کر اپنے دولہا کے گھر چلی جاتی ہے ۔

تب ۔ اُس نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ وہ اثمی سے شادی کرے گی ۔ تاکہ اپنے گھر سے رخصت ہو کر ابا میاں اور امی بیگم کے گھر آ جائے ۔ اس سوچ کے ساتھ ہی وہ بلا جھجک جلدی سے بولی ۔ "ہاں ۔ میں تمہاری دلہن بنوں گی اثمی ۔ پھر میں اسی گھر میں رہنے لگوں گی نا ۔ تمہارے ساتھ ۔ ابا میاں اور امی بیگم کے ساتھ ۔ شکر کروں گی پھر اپنے گھر نہیں جانا پڑے گا ۔ ہیں نا ۔ ؟"

"ہاں ۔" آثم نے اس کے کندن کی طرح دمکتے چہرے اور چمکتی آنکھوں میں غور سے دیکھا ۔ "مگر ابھی یہ بات کسی کو بتانا نہیں ۔"

"نہیں بتاؤں گی ۔"

"بس تو پھر لاؤ ہاتھ ۔ ہماری بات پکی ہو گئی ۔"

"بالکل ۔" وہ صرف زبان سے بولی ۔

"پھر لاؤ ہاتھ ملاؤ نا ۔"

"نہیں ۔"

"کیوں ۔ ؟"

"مجھے شرم آتی ہے ۔"

"ارے! مجھ سے شرم ۔ اپنے اثمی سے ۔" آثم نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے ۔

"چھوڑ دو اثمی! مجھے کچھ ہوتا ہے ۔" یکایک وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی ۔

"پگلی ۔ ! میری اپنی صنم ۔ !" ڈھیروں ڈھیر جذبوں سے سرشار وہ کھانا کھانے بیٹھ گیا ۔ مگر ۔ اب تو اسے ذرا بھوک نہیں تھی ۔

اُٹھ کر بستر پہ جا لیٹا ۔ اور تصورات و خیالات کے سہارے وہ اپنی بچپن کی ساتھی منی سی صنم کے ساتھ جانے کن وادیوں کی سیر کو نکل گیا ۔

○

وہ دو سال کی تھی جب آثم کا نام اس کے کانوں نے سنا تھا ۔ شروع شروع میں دوسرے چوتھے دن گھر میں اس کا تذکرہ ہو جاتا ۔ پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد تقریباً ہر روز ہی اس کا ذکر ہونے لگا ۔

وہ پہلے بالکل ناسمجھ بچی تھی ۔ کچھ بھی نہیں جانتی تھی ۔ بس اک نام تھا، جیسے دوسری چیزوں کے ہوتے ہیں ۔ اسی طرح آثم کسی بھی چیز کا نام ہو سکتا تھا ۔ پھر اسے تھوڑی سی سمجھ آئی ۔ تب اسے معلوم ہوا کہ آثم ایک انسان کا نام تھا ۔

ایک آدھ سال اور گزرا ـــ اب اسے گھر میں ہونے والی باتوں سے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ آثم کے ساتھ اس کا کوئی تعلّق ضرور تھا ـ مگر کیا ـــ ؟ یہ وہ نہیں جانتی تھی ـــ باربار سُننے پر اس کے ننھے سے ذہن نے اس کے کاشی جی جیسا ایک تعلّق متصوّر کرلیا ـ

پھر کچھ وقت اور گزرا ـــ شعور نے اک منزل اور طے کی ـ اب خود بخود ہی وہ یہ سمجھ گئی تھی کہ آثم کے ساتھ اس کا رشتہ کاشف جیسا نہیں تھا ـ تب ـــ اسی وقت سے آثم کے معنی بدل گئے ـــ اور اس کے بعد روز بروز، اک اک لمحے کے ساتھ آثم اس کی زندگی کا، اس کی ہستی کا جیسے اک اہم جزو بنتا گیا ـ

چودہ سال کی عمر عشق و عاشقی کے لیے بہت چھوٹی ہوتی ہے مگر آثم کے ساتھ ذہنی طور پر اس کی وابستگی کی عمر پورے بارہ سال تھی ـــ اور بارہ سال کسی بھی جذبے کو پختہ کرنے کے لیے بہت بہت کافی ہوتے ہیں ـ

یوں ان بارہ سالوں کا نقش اتنا گہرا تھا کہ مٹانے کے لیے صدیاں بھی ناکافی تھیں ـــ وہ کورے کاغذ پہ بنا کوئی نقش نہ تھا وہ تو گیلی مٹی کا نقش تھا ـــ اس کو مٹانے کے لیے تو اس کی پوری ہستی کو نابود کیا جاتا تو ہی مٹ سکتا تھا ـ

وہ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اسی کے خیالوں میں کھوئی رہتی ـ کوئی کام کرتی، تب اسی کی سوچیں ذہن میں ہوتیں ـــ اس نے اسے کبھی دیکھا نہیں تھا ـ سوائے تصویروں کے ـ مگر وہ [illegible] تھا اس کے قریب تھی جیسے اپنے خدا کے ہو ـــ اور ـــ اس اتنے گہرے تعلق کو امی بیگم اور ابامیاں کی آمد کچھ اور گہرا، ان جذبوں کو کچھ اور شدید کر گئی جو آثم کے لیے اس کے دل میں تھے ـ

اتنے ڈھیر سارے اور اتنے خوبصورت خوبصورت کپڑے اور دوسرے

چھوٹے موٹے بے شمار تحائف وہ اس کے لیے لائے تھے کہ دھنک نے ہوش سنبھالنے کے بعد یہ اتنا سب کچھ اکٹھا کبھی نہ دیکھا تھا، نہ پایا تھا ـــ ماں اور بھائی سے بہت پیار اس نے زندگی کے ان چودہ سالوں میں کرایا مگر امی بیگم اور ابامیاں کے اس چھ روزہ پیار کی لذت اور مدہوشی کچھ ایسی تھی کہ وہ ان چودہ سالوں پر بھی حاوی ہوتا محسوس ہورہا تھا ـ

امی بیگم اسے ہر روز اپنا لایا ہوا ایک نیا جوڑا پہنا کر، سولہ سنگھار کر کے گھنٹوں سامنے بٹھائے اسے دیکھتی رہتیں ـ پھر ابامیاں کو بلاتیں ـــ اس کا ہر دن انوکھا نظر آنے والا روپ انھیں بھی دکھاتیں ـ تب اس کی تعریفیں کر کر کے دونوں ہی کے منہ سوکھ جاتے ـ اور یہ سب کچھ اسے عجیب سی لذتیں اور خمار سا بخش دیتا ـــ دل میں مچلنے والی جوانی کی اُمنگیں اور ترنگیں نئے نئے احساسات و جذبات سے روشناس کراتیں ـــ اس کا تن من بہک بہک اُٹھتا ـــ

یوں ـــ آثم کے والدین کے اخلاق، پیار اور توجہ نے اس کے نقش کو کچھ اور گہرا کر دیا ـــ اس کے تعلق کو مضبوط تر بنا دیا ـ وہ اتنے گہرے پانی میں ڈوب گئی کہ جہاں سے اب اس کا اُبھرنا نہ صرف یہ کہ مشکل تھا بلکہ ناممکن تھا اور وہ خوش تھی ـــ بے حد خوش ـ !!

کاشف نے امی بیگم اور ابامیاں کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی ـ جس طرح وہ لوگ اس کی بہن پہ سے صدقے قربان ہو رہے تھے اور جس جس انداز میں اس کی قدر کر رہے تھے ایسے تو کوئی نہ کر سکتا تھا ـ ایسا سسرال اس کی بہن کو اور کوئی نہ مل سکتا تھا ـ اس کا اندازہ اب ہی کاشف کو ہوا ـ

شہزاد ٹھٹھے کے ایک بہت بڑے زمیندار کا بیٹا تھا ـ اس کا باپ زمینوں

اور کوٹھیوں کے علاوہ ایک چھوڑ دو دو کاروں کا مالک بھی تھا۔ کاشف نے خود کہہ کر کبھی شہزاد سے کوئی مدد یا بطور قرض ہی کوئی رقم نہ لی تھی۔ وہ اتنا غیرت مند اور خوددار تھا۔ مگر۔۔۔ امی بیگم اور ابا میاں کے اخلاق اور دھنک سے کی جانے والی محبت نے اسے اتنا متاثر کیا کہ ان کی خاطر پہلی بار شہزاد کے سامنے اس نے گویا دستِ سوال دراز کیا۔

شہزاد تو پہلے ہی کاشف کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا اور یہ ابا سے گاڑی لانے والا معاملہ تو بے حد معمولی تھا۔۔۔ وہ اسی روز جا کر اپنی ایک گاڑی لے آیا تھا۔۔۔ پھر دونوں نے سارے کراچی کی ابا میاں اور امی بیگم کو سیر کرا ڈالی۔

دھنک نے کراچی میں رہ کر بھی کبھی منوڑہ، کلفٹن یا ہاکس بے وغیرہ نہ دیکھا تھا۔ کمسنی میں شاید کبھی گئی ہو مگر اسے یاد نہ تھا۔۔۔ اور ہوش سنبھالتے ہی اس نے یتیمی دیکھی۔۔۔ کھانے دانے کی ہی فکر ہر وقت پڑی رہتی تھی کوئی سیر و تفریح کیسے ہوتی؟

اور اب۔۔۔ امی بیگم اور ابا میاں نے تو اس کی صدیوں پیاسی روح تک کو جیسے سیراب کر ڈالا تھا۔ ہر جگہ اسے ساتھ لے کر گئے۔ گوٹے لپے والے کپڑے پہنا کر دلہن بنا لیتے اور ساتھ ساتھ لیے پھرتے۔

کاشف نے ایک دو بار ماں کے سامنے دبے دبے سے الفاظ میں اس کے یوں اس انداز میں ساتھ جانے پر اعتراض بھی کیا کہ شہزاد کی موجودگی میں اسے یہ کچھ مناسب نہیں لگتا تھا۔۔۔ مگر امی نے یہ کہہ کر اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا کہ ان کا اب اس پر کوئی حق نہ تھا۔ حقدار جو تھے انہیں اگر کوئی اعتراض نہ تھا تو وہ کچھ کہنے والے کون ہوتے تھے۔۔۔؟

یوں بھی۔۔۔ امی نے آخر میں نرمی سے اسے سمجھایا۔۔۔ شہزاد ان کے لیے اب کونسا غیر رہ گیا تھا۔ ہر مشکل کے وقت وہ ان کے کام آتا تھا۔۔۔ اور یہ بھی تو وہ جانتا تھا کہ وہ کن لوگوں کے ساتھ بن ٹھن کر جاتی تھی۔ غیروں کے ساتھ تو خدانخواستہ نہیں جاتی تھی نا۔ پھر اس کے بعد کاشف نے کوئی بات نہیں کی۔

اسی طرح ان کی خاطر مدارت میں ایک ایک لمحہ گزارا۔

کتنے سہانے وہ دن گزرے تھے۔ دھنک کو تو وہ وقت بھول ہی نہیں رہا تھا۔ جاتے جاتے امی بیگم اور ابا میاں نے اتنے خلوص اور محبت سے اسے سینے کے ساتھ لگا کر بھینچا تھا کہ اب تک جیسے اس کے دماغ میں ان کے بازوؤں اور سینوں کے لمس کا احساس اور جسم میں حرارت موجود تھی۔

امی بیگم آتم کی بہت ڈھیر ساری تصویریں ساتھ لے کر آئی تھیں۔ بچپن سے لے کر جوانی تک کی۔۔۔ کسی میں وہ کھیل رہا تھا۔ کسی میں پڑھ رہا تھا۔ دو تین تصویریں اس کی سکاؤٹوں والے لباس میں تھیں۔ کچھ کرکٹ کھیلتے ہوئے کی اتری ہوئی تھیں اور اس کی جوانی کی تصویروں پر تو نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔ کیسا بلند و بالا اور خوبرو تھا وہ۔۔۔ بالکل ایسے، جیسے کسی ملک کا شہزادہ تھا۔ ملک نہ سہی مگر وہ اس کی داستانِ حیات کا اک انوکھے سے روپ والا شہزادہ تو تھا ہی۔۔۔!!

جاتے جاتے امی بیگم آتم کی سب تصویریں اسے دے گئی تھیں اور اس کی خود لے گئی تھیں۔۔۔ کہ ان پر آتم کا حق تھا اور ان پر دھنک کا۔۔۔! کیسے عجیب سے جذبے سینے میں اتر گئے تھے جب انہوں نے ایسی بات کی تھی۔۔۔ وہ شرمائی لجائی بھی تھی مگر اندر اٹھنے والے طوفانوں میں جیسے سکون سا آ گیا تھا۔

ان کے سامنے تو وہ آتم کی کوئی بھی تصویر نظر بھر کر دیکھ نہ سکی تھی۔ پھر ان کے جانے کے بعد۔۔۔ جب مدہوشیوں کو ہوش آیا تو دل کے اندر جیسے ہزاروں اداسیاں اتر گئیں۔۔۔ تب۔۔۔ وہ اسی بے کل دل کو بہلانے کے لیے وہ ساری تصویریں لیے

بیٹھی دیکھ رہی تھی — ایک ایک کو جانے کتنی کتنی بار دیکھ چکی تھی اور پھر — اب پھر دیکھ رہی تھی —

"گڑیا — !" کاشف کی آواز پر وہ چونکی — گھبرائی — اور پھر خجل سی ہوتے ہوئے دونوں ہاتھ اپنی گود میں چھپا کر اس نے نگاہیں اُٹھائیں —

کاشف سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا — "کیا کر رہی تھیں — ؟"

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں —" فق چہرے اور اپنی بے حد خوبصورت مگر بھیلی بھیلی آنکھوں سے وہ کاشف کو دیکھے گئی —

"مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ کیا کر رہی تھیں — ؟" کاشف کی شوخ نگاہوں نے اس کے گھبراہٹ زدہ چہرے کا طواف کیا —

"میں دیکھ تو نہیں رہی تھی — سچی کاشی جی ! میں دیکھ بالکل نہیں رہی تھی۔ امی بیگم نے کہا تھا البم میں لگا دو — بس وہی سوچ رہی تھی کہ کونسے البم میں لگاؤں —"

"اپنی تصویریں — ؟"

"اپنی — ؟" اس نے حیرت سے کاشف کو دیکھا "نہیں اپنی تو نہیں —"

"پھر کس کی — ؟"

"وہ — وہ —" دھنک بُری طرح سٹپٹا گئی — کاشی جی نے تو شاید کچھ بھی نہیں دیکھا تھا — اور وہ کتنی احمق تھی — اپنا راز خود ہی کھول بیٹھی تھی — اور اب — دکھائے بنا کوئی اور چارہ بھی نہ رہا —

"یہ —" ساری تصویریں پلنگ پر پھینکتے ہوئے اُس نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا — کاشف زور زور سے قہقہے لگانے لگا —

"بیوقوف ! — اس میں اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت تھی۔ بھئی تمہاری چیز ہے

جو جی چاہے کرو —" کاشف اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور پھر ایک ایک تصویر اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگا — "گڑیا ! تمہارا دولہا ہے تو خاصا ہینڈسم — خدا کرے اخلاق کا بھی ایسا ہی ہو —"

"بڑا اچھا ہے کاشی جی — !" وہ یکدم گھٹنوں میں سے سر نکالتے ہوئے بے دھیانی سے بولی — "امی بیگم نے بتایا تھا —" اور پھر وہ چونک پڑی — کاشف کے چھوٹتے قہقہے نے اسے احساس دلا دیا کہ وہ کیا بات کر رہی تھی — کس کے متعلق کر رہی تھی اور کس کے ساتھ کر رہی تھی — ؟؟ وہ بے حد شرمندہ ہو گئی — گھبرا کر کاشف کے ساتھ ہی لپٹتے ہوئے بولی — "مجھے نہیں پتہ کون کیسا ہے اور کون کیسا نہیں — ؟"

"پھر کیسے پتہ ہے — ؟" کاشف مسکرا کر اس کے سر کو سہلانے لگا —

"میں نہیں جانتی —"

"کیوں نہیں جانتیں — ؟" کاشف کی آواز میں سنجیدگی بھر گئی — "تمہیں جاننا چاہیے گڑیا ! تمہیں ساری زندگی اس کے ساتھ گزارنی ہے — تمہیں اس کی عادات و اطوار کا اچھی طرح علم ہونا چاہیے — تاکہ — جب تم اس کی زندگی میں داخل ہو تو تمہیں اس کو سمجھنے اور پھر اسی انداز اور اسی ڈھب سے اس کے قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلنے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے — خدا تمہیں اس زندگی میں بڑی خوشیاں دے میری گڑیا ! بہت ڈھیر ساری — اتنی — جتنی اس گھر میں تمہیں محرومیاں ملی ہیں"

"نہیں نہیں — ایسا مت کہیے کاشی جی ! مجھے اس گھر میں آپ جیسا بھائی پانے کے بعد کوئی محرومی کبھی محسوس نہیں ہوئی — آپ شاید میرے ان جذبوں سے واقف نہیں ہیں جو آپ کے لیے میرے دل میں ہیں —"

"واقف ہوں گڑیا! بہت اچھی طرح — مگر دانو! اب وقت آچلا ہے۔ یہ سب جذبے ختم کرنے کی کوشش کرو۔ نکال دو ہم سب کو دل سے۔ یوں — کہ جب آتم کے گھر جاؤ تو تمہارے دل میں وہی سب ہوں۔ صرف وہی — تب تمہاری زندگی خوشی اور سکون سے گزرے گی۔"

دھنک نے سر اُٹھایا۔ کاشف کی آنکھوں میں شاید نمی تھی۔ جلدی سے اُس نے اس سے چھپانے کی خاطر رُخ پھیر لیا۔

"کاشی جی — !" وہ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی۔ گھٹنوں میں چہرہ گھسیڑ کر رونے لگی۔

"ارے! ارے!" کاشف یکایک ہنس پڑا "معلوم ہو گیا ہو گا نا کہ میں چائے کا کہنے کے لیے آیا تھا۔" پھر وہ جھک کر بڑے رازدارانہ انداز میں اس کے کان میں بولا "ایک خوشی کی خبر بھی ہے گڑیا — !"

"جی — اوہ کیا — ؟" دھنک کے آنسو تھم گئے۔ جلدی سے آنکھیں اور رخسار پلو سے صاف کرتے ہوئے اُس نے سر اُٹھایا۔ نگاہوں میں وہ خوشی کی خبر معلوم کرنے کی بے تابی تھی۔

"امی ادھر کرایہ داروں کی طرف گئی ہوئی ہیں اور شہزاد بھوک سے تڑپ رہا ہے۔ اس لیے روٹی تمہیں پکانا ہو گی۔"

"ہائے اللہ!" مسکراتے ہوئے وہ کاشف کی طرف لپکی "یہ خوشی کی خبر ہے کاشی جی — ؟ شاید وہ اس سے جھگڑا کرنے کے لیے بڑھی تھی۔ کاشف اُٹھ کر جلدی سے باہر نکل گیا۔

O

"میرا تو جی چاہتا ہے چند دن کے لیے پھر اپنی دھنک کے پاس چلی جاؤں۔"

"سدا کے لیے اس گھر میں آ لے۔ پھر پوچھوں گا۔" ابا میاں نے مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا "رات دن ساس بہو میں وہ چخ چخ ہوا کرے گی کہ پھر ایک دوسرے کی صورت سے بھی بیزار ہوں گی۔"

"ہائے ہائے! آپ نے مجھے اتنا ہی جھگڑالو سمجھ رکھا ہے۔ آپ سے آج تک کتنی لڑائیاں لڑی ہیں؟ کتنے جھگڑے کیے ہیں؟ ذرا ایمانداری سے بتائیے گا۔"

"بیگم! میرا اور تمہارا رشتہ ساس بہو کا نہیں ہے۔"

ساجدہ بیگم خجل سی ہو کر چپ ہو گئیں۔ کتنی غلط مثال دے بیٹھی تھیں۔

ایک ہی اولاد خدا نے دی تھی۔ وہ بھی بیٹا، بیٹی ہوتی تو گھر کی رونق بڑھتی۔ بیٹے کو باہر کے ہی کام پڑے رہتے۔ کبھی لائبریری میں پڑھنے چلے جانا تو کبھی میچ کھیلنے۔ اپنے کالج کی کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا وہ — اس سے پہلے سکاؤٹ تھا۔ تب کہیں نہ کہیں آنا جانا ہی رہتا۔ سکول اور کالج میں لڑکیاں تو سال چھ مہینے بعد پکنک منانے کہیں چلی جایا کرتی تھیں۔ مگر ان لڑکوں کا تو ہر ہفتے، دو ہفتے کے بعد کوئی نہ کوئی پروگرام بنتا رہتا۔

صنم کا بچپن زیادہ تر اسی گھر میں گزرا تھا مگر اب جب سے وہ بھی سیانی ہوئی تھی، چھوٹے موٹے کام کرنے کے قابل ہوئی تھی اس کی ماں کو اس کے کاموں کی خاطر بیٹی کی جوانی کا خیال آنے لگا تھا کہ اب اسے گھر میں رہنا چاہیے تھا۔ وہ ماں کی حکم عدولی کر نہیں سکتی تھی۔ پڑھائی سے فارغ ہو کر چھوٹی بہنوں کے کاموں میں لگ جاتی۔

یوں — امی بیگم اور ابا میاں پھر تنہا رہ گئے تھے۔ ابا میاں جوانی کے زمانے سے ہی بڑے زندہ دل اور بذلہ سنج تھے۔ بچوں کے بچپن کی انگلی پکڑ کر اور ان کے ساتھ ہنس کھیل کر انھیں جوانی کی سرحد پر لا کھڑا کرنے کے بعد اپنی تنہائیوں سے ذرا پریشان نہ ہوئے تھے۔ صنم یا آثم، کوئی بھی پاس نہ ہوتا تو اپنی بیوی سے ہی ہنسی مذاق اور دل لگی میں دل بہلائے رکھتے۔

"ویسے ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھیے جناب!" بیوی کی آواز پر مسکراتے ہوئے فوراً بولے۔ "سو پوچھیے۔ ہزار پوچھیے۔ لاکھ پوچھیے۔ ہماری زندگی کا اور مقصد ہی کیا ہے۔"

"اب آثم کے اس رشتے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" ساجدہ بیگم زیرِلب مسکرا رہی تھیں۔

"اپنی تعریف کرانا چاہتی ہو — ؟" عینک کے اوپر سے وہ بیگم کو دیکھ کر ہنسے۔

"نہیں نہیں —" ساجدہ بیگم بھی ہنس پڑیں۔ "ویسے اس میں میری تعریف کی کیا بات ہے۔ انسانوں کو بنانے والا خدا ہے۔"

"شکل و صورت میں تو خیر دھنک کا کوئی ثانی نہیں ہوگا۔ یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے۔" ابا میاں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "لیکن مجھے خوشی یہ ہے کہ اس گھر کے سارے ہی لوگ بڑے اچھے ہیں۔ دھنک کی ماں اور اس سے بھی زیادہ اس کا بھائی۔ بڑے ہی خلوص والے لوگ ہیں۔"

"اور اپنی دھنک کا مزاج۔"

"بھئی ابھی بچی ہے نا — ابھی کیا بگڑے گا — البتہ۔" وہ پھر مسکرائے۔

"تم اس کی بے تحاشا تعریفیں کر کر کے بگاڑ ضرور دو گی۔"

"میں کیا اس کے ساتھ بندھی بیٹھی رہتی ہوں۔ وہاں چار دن کے لیے گئی۔ مجھے

وہ بہت پیاری لگی — میں نے تعریف کر دی۔" وہ قدرے بُرا منا گئیں — شوہر کی زیرِلب مسکراہٹ کو دیکھا پرکھا ہی نہیں "اب میرے منہ سے کبھی اس کا نام بھی نہیں نکلے گا"

ابا میاں ہنس کر اخبار کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جانتے تھے بیگم کی خفگی ہمیشہ عارضی ہوتی تھی — کافی خوبصورت تھیں نا — اور حسن کو دلبری کی ادائیں سکھانا نہیں پڑتیں۔ وہ خود بخود سیکھ جاتا ہے۔

ساجدہ بیگم جلد جلد رات کے لیے سبزی بنانے لگیں۔ گلابو کی بیٹی کو پھر دورہ پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے کوارٹر میں تھی۔ سبزی بناتے ہوئے ساتھ ساتھ نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ یکایک مسکراہٹ کی ایک خوبصورت سی لہر ہونٹوں پر لہرائی۔ نگاہ اٹھا کر شوہر کی جانب دیکھا۔

"ایک تو یہ ہر وقت اخبار میں ہی گم رہتے ہیں۔" اتنی بلند آواز میں بڑبڑائیں کہ وہ بخوبی سُن لیں۔

"کہیئے کہیئے — یہ رکھ دیا۔" ان کے بھی کان بیگم ہی کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ اخبار نیچے گھٹنوں پہ رکھتے ہوئے اُنہوں نے نگاہیں ساجدہ بیگم کے چہرے پر مرکوز کر دیں — ارے! دہاں تو بڑی دلنواز سی سرخیاں پھیل رہی تھیں۔ "فرمایئے —" بڑی دلچسپی سے پوچھنے لگے۔

"اپنی دھنک۔ ۔ ۔"

"ابھی تو تم نے کہا تھا کہ اس کا نام اب کبھی تمہارے منہ سے نہیں نکلے گا۔" ابا میاں پھر شوخی سے مسکرائے۔

"خواہ مخواہ ہی۔" اب ساجدہ بیگم سچ مچ بگڑ اُٹھیں۔ "اس کا نام خدا رہتی دنیا تک قائم رکھے۔ کیوں نہ نکالوں گی منہ سے۔ میں تو سو بار ہزار بار اس کا نام لوں گی۔"

ابا میاں زور سے ہنس پڑے۔ انہیں ہنستے دیکھا تو ان کے بھی خفگی بھرے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ "میں یہ کہہ رہی تھی کہ کام کاج میں بھی ابھی سے بہت ہوشیار ہو چکی ہے۔ اس دن شامی کباب اور پسندے کتنے مزے کے بنائے تھے۔"

"ہاں۔ بڑی سلیقہ شعار بچی ہے۔ صورت سیرت دونوں میں لاثانی۔"

"اے۔ اب اس کی صورت کی آپ کیوں تعریف کرنے لگے؟"

"بھئی ہماری تو بیٹی ہے۔ ہمارا حق ہے۔"

"اور جیسے میری نہیں۔"

"تم دونوں کا ساس بہو کا رشتہ ہے۔" ابا میاں نے پھر شرارت کی۔

"بھاڑ میں جائے یہ ساس بہو کا رشتہ۔ ہر وقت اسی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ میں تو اسے بیٹی سمجھ کر اس گھر میں لاؤں گی۔"

"اچھا کرو گی۔" اور اب وہ یکایک سنجیدہ ہو گئے۔

"ابّا میاں۔!" دیوار کی پرلی طرف سے صنم کی آواز اُبھری۔ "میں یہاں سے چھلانگ لگا کر آ جاؤں۔؟"

"نہ نہ میری بیٹی! موچ ووچ آ جائے گی۔ ادھر سے آؤ۔"

"اب اس کے سامنے دھنک کی کوئی بات نہ کیجئے گا۔" ساجدہ بیگم آہستہ سے بولیں۔

"کیوں۔؟"

"بات نکل جائے گی۔"

"مجھے آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ اس رشتے کو تم نے اتنے راز میں کیوں رکھا ہوا ہے؟"

"امّی کی خاطر!"

"امّی کے رشتے کی بات اور اسی سے پوشیدہ۔!! بھلا یہ کیا تک ہے؟"

"تعلیم مکمل کر لے ورنہ دھیان اور طرف لگ جاتا ہے۔" وہ بڑے انداز سے مسکرا دیں۔ "فوٹوگرافی کا اسے شوق بہت ہے اور دھنک اپنی ہستی میں قدرت کا پورا حسن سمیٹے ہے ماشاءاللہ۔ بس پھر پڑھائی وڑھائی ساری ختم اور وہ اپنے شوق کی تکمیل میں ہی لگ جائے گا۔"

"بیگم۔ تم واقعی بہت عقلمند ہو۔ ہماری بھی منگنی بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔"

"ہاں یاد ہے سب کچھ۔ تبھی جوان ہوتے ہی شادی کی پڑ گئی تھی۔ چچا ابا نے کتنا چاہا کہ زیادہ نہیں تو کم از کم بی اے ہی کر لیں مگر۔" ساجدہ بیگم شرما کر خاموش سی ہو گئیں۔

"ہاں ہاں۔ بھئی مجھے اعتراف ہے۔ تمہارے زہد شکن حسن نے ہی مجھے جلد سے جلد تمہیں اپنا بنا لینے کی ترغیب دی تھی۔ تم مجھ سے پردہ کیوں نہیں کرتی تھیں بھلا۔؟"

"ہائے ہائے! ایک گھر میں رہے، اکٹھے کھیل کر جواں ہوئے تو پردہ کیسے کرتی۔ اور بھی تو ماموں، چچا اور پھوپھیوں وغیرہ کی اولادیں تھیں۔ کسی کا بھی تو کسی سے پردہ نہ تھا۔ اک میں اکیلی کرتی اچھّی لگتی۔؟"

"بس پھر۔ تبھی یہ ساری گڑبڑ ہوئی۔ دوسروں کے ہوش و حواس لوٹ لینے والے اپنے حسن کا تمہیں اندازہ نہیں ہو گا نا۔"

"ہٹیئے بھی۔" ساجدہ بیگم بڑے محبوبانہ انداز میں شرمائیں۔

"اور وہ دیکھئے صنم آ رہی ہے۔ اب ایسی کوئی بات نہ کیجئے گا۔"

"آداب ابّا میاں۔! ایک تو اتنا لمبا چکر لگا کر آنا پڑا ہے۔" وہ لمبے لمبے

سانس لیتے ہُوئے ساجدہ بیگم کے پاس بیٹھ گئی۔

"وہ دن اچھے تھے نا جب تم بے حد منی سی تھیں۔ تمہاری ممی تمہیں دیوار پر چڑھا دیتی تھیں اور ادھر سے میں سنبھال لیتی تھی۔"

صنم بڑے پیارے انداز میں ہنس پڑی۔ "سچ مچ وہ دن بڑے ہی اچھے تھے اور اب تو امی بیگم! گھر کے کام ہی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ لائیے سبزی میں بنا دوں۔؟"

"ابھی کاموں کا رونا رو رہی تھیں اور اب یہ کرنے کو کہہ رہی ہو۔"

"یہ تو اپنا کام ہے نا۔!"

"اور وہ پرایا تھا۔؟"

"سچی امی بیگم! ایمان سے کہہ رہی ہوں۔ یہاں کتنے بھی کام کر لوں۔ ذرا تھکن محسوس نہیں ہوتی اور ادھر توجی ہی نہیں لگتا۔"

"نہ میری بیٹی! وہ تیرا اپنا گھر ہے۔"

"میں کب کہتی ہوں پرایا ہے۔ لیکن دل کی بات ہے نا۔ مجھے تو یہی اپنا لگتا ہے۔"

"ہاں بیٹے! دل کی بات ہے۔ اب جیسی تو ہمیں لگتی ہے ویسی تیری اور کوئی بہن نہیں لگتی۔" پاس سے ابّا میاں بولے۔

"واہ! کوئی اور کیوں میرے جیسی لگے۔ میں تو آپ کی بیٹی ہُوئی۔۔ اکیلی آپ کی بیٹی۔ اور کوئی نہیں۔"

"ہاں بھئی ہاں۔ بیٹی تو ہماری بس تمہیں ہو۔ پھر میری بیٹی مجھے چائے بنا کر پلائے گی نا۔؟"

"ہائے ابّا میاں! آپ کو چائے بنا کر پلانے سے مجھے انکار ہوگا۔" وہ یکایک اُٹھ کر شتم پشتم باورچی خانے کی طرف بھاگی۔

"بڑے نصیبوں والی ہے۔ اپنے ماں باپ سے زیادہ ہم سے محبّت کرتی ہے۔"

"پروردگار بے نیاز ہے۔ اپنی کوئی زندہ نہ بچی تو اردگرد سے ایسی بیٹیاں دے دیں جو اپنوں سے بڑھ کر ہیں۔"

"ایک تو میں ہُوئی ابّا میاں۔۔ اس کے علاوہ اور آپ کس بیٹی کا ذکر کر رہے تھے۔" وہ چائے کے پانی کی کیتلی لگا کر واپس آتے ہُوئے بولی۔

"دوسری دھنک۔" ابّا میاں نے ابھی کچھ نہیں کہا تھا۔ ساجدہ بیگم جلدی سے بول پڑیں۔

"ہاں۔ وہ میری بہن ہے۔" وہ پاس نہیں تھی نا۔ اس لیے اس کے نام پر صنم کے دل میں کوئی حسد یا جلن کا جذبہ نہ اُبھرتا تھا۔ "کبھی مجھے بھی اس کے پاس لے چلیں نا۔ مجھے آپ کی اس بیٹی سے ملنے کا بڑا شوق ہے۔ یا پھر اسے یہاں بلائیں۔"

"وہ تو ابھی یہاں نہیں آسکتی۔"

"کیوں۔؟"

"کراچی دُور بہت ہے۔"

"تو پھر مجھے وہاں لے چلیں۔"

"لاہور کراچی سے بہت دُور ہے۔ تم چلتے چلتے تھک جاؤ گی۔" ابّا میاں شوخی سے بولے۔

"آپ تو ریل گاڑی پہ گئے تھے۔ میں بھی اسی طرح جاؤں گی۔ پھر تو نہیں تھکوں گی نا۔"

"نہیں۔ اچھا یہ بتاؤ تمہیں جیب خرچ کتنا ملتا ہے۔؟"

"دس روپے ڈیڈی دیتے ہیں۔ دس آپ اور پانچ دس امی سے لے لیا کرتی ہوں۔"

"اوئے ہوئے! اتنے ڈھیر سارے — کیا کرتی ہو ان سب کا؟"

"خرچ کر دیتی ہوں سارے کے سارے۔"

"مگر کہاں —؟"

"بس! کبھی کسی سہیلی کو کوئی تحفہ دے دیا تو کبھی کچھ لے کر کھا لیا۔"

"کیا تمہاری ممی تمہیں روٹی نہیں دیتیں —؟" اب ابا میاں اس سے دل لگی کرنے لگے —

"دیتی ہیں۔" وہ زور سے ہنس پڑی۔ امی بیگم بھی دونوں کی باتیں سُن سُن کر مسکرائے جا رہی تھیں۔ "لڑکیوں کے ساتھ مل کر ابا میاں! خرچ ہو ہی جاتے ہیں۔"

"تو بس پھر — کھانے پینے کا خرچ کم کر کے تھوڑے تھوڑے ہر مہینے جمع کرنا شروع کر دو۔"

"کس لیے —؟"

"کراچی تک کے کرائے کے لیے — اپنی بہن سے ملنے نہیں جانا۔؟"

"بیٹی اپنے خرچ پہ کراچی جائے گی۔" امی بیگم نے پاس سے طعنہ مارا۔ "وہ بھی کس کے ساتھ —"

"بھئی یہ ہم باپ بیٹی کا معاملہ ہے — تم بیچ میں مت بولو۔"

"صنم! بیٹی پانی کھول رہا ہو گا۔"

"ارے! ابا میاں کی باتیں اتنی مزیدار ہوتی ہیں۔ ان میں لگ کر اور سب کچھ ہی بھول جاتی ہوں۔" وہ تیزی سے بھاگ گئی۔

"شکر ہے پروردگار تیرا — کیسی پیاری پیاری نعمتیں تو نے انسانوں کے لیے بنائی ہیں۔"

"کونسی —؟"

"یہ اپنی بیٹیاں — ایک وہ تھی — چھ دن وہاں رہے۔ واپس آیا ہوں تو ہر دم یاد آتی رہتی ہے۔ اک یہ ہے تو گھر کی رونق بنی ہوئی ہے — مستعار ہی سہی۔ اللہ میاں نے دل تو لگا ہی دیا ہوا ہے۔"

"ہاں شکر ہے —"

"یہ اثمی ابھی تک نہیں آیا —؟" اُنھوں نے قدرے فکر سے گھڑی دیکھی۔

"آ گیا ابا میاں! آپ کا اثمی آ گیا — آداب —!"

"جیتے رہو — آج کا کونسا بہانہ ہے —؟" وہ خوش دلی سے بولے۔

"بہانہ نہیں ابا میاں! سچ مچ کرکٹ کا میچ تھا۔" وہ سر جھکا کر ماں کے پاس جا بیٹھا۔

"اور پڑھائی —؟"

"وہ بھی ہو رہی ہے۔" وہ جھکے جھکے سر سے بولا۔ "آپ کو شوق ہے نا کہ انگریزی میں ایم۔ اے کروں۔ وہ انشاء اللہ میں آپ کو کر کے دکھا دوں گا — یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔" وہ پھر ماں کی طرف مڑا۔ "امی بیگم! کوئی کھانا وغیرہ —؟"

"صنم چائے بنا رہی ہے۔ کھانے کا تو اب وقت نہیں۔ اسے کہو تمہارے لیے گاجر کا حلوہ گرم کر دے۔"

"گلابو حسبِ معمول پھر غائب ہو گی۔"

"نہیں بیٹے! کسی کی مجبوری کو باتیں نہیں بنایا کرتے۔ اس کی بیٹی بڑی بیمار ہے۔"

وہ باورچی خانے میں جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ماں اور باپ دونوں ہی کی نگاہیں اس کے اونچے لمبے قد کی طرف اُٹھ گئیں — دونوں ہی کی نظروں میں بیٹے کی پُرکشش شخصیت کی تعریف تھی اور خُدا کے ہزاروں احسانوں کا اعتراف!

پہلے تیز تیز قدم اس نے اُٹھائے تھے مگر پھر باورچی خانے تک پہنچتے پہنچتے اس کے قدموں کی آواز تھم گئی۔ وہ آہستہ آہستہ اور دبے دبے پاؤں اندر گھسا۔ صنم دروازے کی طرف پشت کئے چولہے کے پاس کھڑی کچھ کر رہی تھی۔ آثم نے پیچھے سے جا کر اس کی آنکھیں بند کر دیں۔

"ہائے!" صنم نے آواز دبا کر ہلکی سی چیخ ماری۔ "مجھے ڈرا ہی دیا آثم —!" اس نے آثم کے ہاتھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔

"ارے! تمہیں بغیر دیکھے ہی کیسے معلوم ہُوا کہ یہ میں ہوں۔؟"

"تمہارا تو سایہ بھی دیکھ کر پہچان جاؤں آثم! اور یہ تو تمہارا لمس اور خوشبو — ارے!" وہ اپنی بات پر خود ہی چونکی "تمہارے خیال میں میں اتنی بیوقوف ہوں۔؟"

"اس سے بھی بہت زیادہ —" آثم نے اس کی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر اس کے گلے میں بازو ڈال دیئے — پھر اس کے کان کے اندر مُنہ گھسیڑتے ہُوئے بولا — "جلدی جلدی حلوا گرم کر دو — بڑی بھوک لگی ہے۔"

"ہائے! میں مر گئی — میرا کان —"

"کہاں گیا —؟"

"تمہارے منہ میں —"

"پھر وہی بدتمیزی —" آثم نے اس کا کان کھینچا۔ "اپنے ہونے والے اُس کے ساتھ تم کر کے بات نہیں کرتے —"

"تو تم نہیں مجھے تم کہتے — میں بھی تو تمہاری وہی ہونے والی ہوں۔"

ذرا سا شرما کر اُس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"واہ واہ! اب تو میری صنم رانی باقاعدہ شرمانے لگی ہے۔ ماشاءاللہ —!

چشم بد دُور —!"

وہ اور بھی سُرخ ہو گئی "بتاؤ نا — تم مجھے تم کیوں کہتے ہو؟"

"تم چھوٹی ہو اور میں بڑا ہُوں۔"

"تم بڑے ہو تمہیں بھائی جان نہ ..." اس نے تو شرارت کی تھی — مگر اس کا فقرہ ابھی پُورا بھی نہیں ہُوا تھا۔ آثم نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے "کہو کہو۔" اسے سچ مچ غصّہ آگیا۔

"نہیں کہتی کچھ بھی۔"

"کچھ بھی نہیں؟" اس کا سہما وجود دیکھ کر غصّے کی جگہ پیار نے لے لی —

"بالکل کچھ بھی نہیں —؟" آواز میں پیار کی گھلاوٹ تھی۔

"ہائے اللہ! حلوا تو گرم کرنے دو۔" صنم نے سر جھٹک کر اپنے بال چھڑا لیے۔

"اب تمہاری بھوک کہاں گئی —؟"

"تمہیں دیکھ لیتا ہوں تو بس! سب بھوکیں وغیرہ ختم ہو جاتی ہیں۔"

"پھر حلوا نہ گرم کروں؟" وہ شرارت سے مُسکرائی۔

"نہ کرو — تمہیں دیکھے بغیر یقیناً مر جاؤں گا مگر حلوے کے بغیر انشاءاللہ زندہ رہوں گا۔" پھر یکایک اسے کچھ یاد آیا "ارے! یہ دیکھو تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔" جیب میں ہاتھ ڈالتے ہُوئے وہ بولا "بوجھو —؟"

"ٹافیاں —"

"اتنی بڑی ہو گئی ہو — بیوقوف! ابھی بھی ٹافیاں ہی لاؤں گا۔"

"تو پھر بتا دو —"

"آنکھیں بند کر کے ہاتھ آگے کرو۔"

صنم نے جلدی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیا۔

"کیسے بھک منگوں کی طرح ہاتھ پھیلائے کھڑی ہو۔"

"تمہیں خدا سمجھے اثمی۔۔ !" آثم کی بات پر جزبز ہوتے ہوئے صنم نے جلدی سے پھیلا ہاتھ پرے ہٹا کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر آثم کی طرف سے رُخ پھیر کر وہ جلد جلد حلوا گرم کرنے لگی۔

آثم نے بند مٹھی کھولی۔ نازک نازک سے سفید موتیوں کی اک بڑی خوبصورت مالا اس کے ہاتھ میں تھی۔ صنم ادھر رُخ پھیرے جھکی کھڑی تھی۔۔ آثم نے چپکے سے، پیچھے سے اس کے گلے میں ڈال دی۔

"ارے !" صنم سیدھی ہوگئی۔ "ہائے ! کتنی پیاری ہے۔" اس کی آنکھوں میں مالا کی خوبصورتی سے زیادہ خوبصورت جذبوں کی جوت جاگی۔

"وہ تمہارا نیلا سوٹ ہے نا۔" آثم نے اسے بازوؤں میں لے کر مدھم سی سرگوشی کی۔ "وہ جب پہنوگی تو پھر یہ مالا بھی پہننا۔ بڑی خوبصورت لگوگی۔"

"تمہیں کیسے معلوم کہ نیلے سوٹ پر پہننے سے خوبصورت لگوں گی۔" صنم کے عارض حیا سے سُرخ ہو اُٹھے۔

"میرے ایک دوست کا بھائی اور بھابی کالج آئے تھے۔ بھابی نے نیلا سوٹ پہنا ہوا تھا اور گلے میں ایسی ہی مالا۔ بڑی اچھی لگ رہی تھی اور تم تو اس بھابی سے بہت زیادہ خوبصورت ہو۔ اس سے بھی زیادہ اچھی لگوگی۔"

آثم نے اس کی اتنی ڈھیر ساری تعریف کر دی تھی۔ جیسے اس سے اس کا بوجھ اُٹھایا نہ گیا۔ "چلو باہر۔ ابّا میاں کے لیے چائے بنائی ہے سب پئیں گے۔" لمبے لمبے، غیر ہموار سانس لیتے ہوئے وہ بولی۔ "۔ اسے آثم لیے باہر چلی تو اسے ہوش آیا۔ حلوا

تو چولھے پر پڑا ہوا تھا۔ وہ ادھر لپکی۔ "ہائے میں مرگئی۔ یہ تو جل ہی گیا۔" آثم زور سے ہنس پڑا۔

"تم جو رومانس لڑانے لگ گئی تھیں۔ جلتا نہ تو اور کیا ہوتا ؟"

"ہائے اثمی ! تم کتنے خراب ہو۔" اس نے بڑھ کر دو تین مکّے اس کی چھاتی پر جڑ دیئے۔ "میں رومانس لڑا رہی تھی ؟ ۔ میں ؟"

آثم ہنستا ہی گیا۔ اس کے مکے کھا کر بھی وہ پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا گیا۔ کتنی اچھی لگ رہی تھی وہ، اس رنگ میں، اس روپ میں، اس عالم میں ۔۔ !!!

حلوا چولھے پر سے اُتار کر پرے پھینک وہ جانے کیا کیا بڑبڑاتی ہوئی ٹرالی لے کر باہر کی طرف چل دی۔

"ارے ! ارے !" وہ اس کے پیچھے لپکا۔ "یہ ہار تو اُتار لو ۔ اور انجم ارم کو بھی نہ بتانا کہ میں نے دیا ہے ۔ وہ بڑی لُتریاں ہیں۔ جھٹ ادھر کی بات اُدھر لگا دیتی ہیں اور اُدھر کی لے کر اِدھر۔"

آثم نے خود ہی اس کے گلے سے مالا اُتار کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔

"ابّا میاں اور امی بیگم بے شک دیکھ لیں ۔ ؟" وہ اپنی فطری معصومیت سے پوچھنے لگی۔

"نہ نہ ۔ انہیں بھی نہیں دیکھنی چاہیے ۔ لاؤ ابھی میں جیب میں ڈال لیتا ہوں۔ اپنے گھر جانے لگوگی تو یاد سے میرے کمرے میں سے لے لینا۔"

"اچھا۔" اُس نے عجیب سی نگاہ سے آثم کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی تھی۔

"یہ کیسی رازداریاں تم نے مجھے سکھا دی ہیں ؟"

جواب میں وہ یوں مُسکرا دیا کہ جیسے کہہ رہا تھا۔

"ان معاملوں میں ایسا ہی ہوتا ہے میری صنم — ! یہ دل کے معاملے ہیں —— چور دروازوں سے چپکے سے داخل ہوتے ہیں — یوں — کہ دل والوں کو بھی خبر نہیں ہوتی —— اور پھر ایسی ایسی لذت بخش چوریاں کرنا دل خود بخود ہی سیکھ جاتا ہے ۔ میرا تو اس میں کوئی قصور نہیں میری بچپن کی ساتھی —!! میرا تو اس میں کوئی قصور نہیں —— میری ہمدم !!!

○

زندگی کی گاڑی کھینچنا اتنا سہل کام تو نہ تھا جتنا وہ سمجھا کرتا تھا ۔ ابا کی موت پر وہ بہت رویا تھا مگر صرف اس لیے کہ وہ اس کا باپ تھا ۔ ابا اسے بہت اچھے لگا کرتے تھے ۔ اسے ان سے بہت محبت تھی — وہ گھر آجائے تو ان کی موجودگی میں سارا وقت وہ سہما سہما بھی رہتا مگر پھر بھی ابا کی ہمیشہ کی جدائی نے اسے اتنا غم دیا ، اسے اتنا دکھی کیا کہ وہ کئی دن تک کچھ اور سوچ ہی نہ سکا ۔

وقت ہر غم پر مرہم بن کر چپک جاتا ہے — کچھ دن گزرے جب ذرا غم کم ہوا تو اس نے اپنے اردگرد دیکھا —— گھر کو —— گھر والوں کو —— گو وہ صرف بارہ تیرہ سال کا تھا اس وقت — مگر اس نے محسوس کیا جیسے یکدم وہ اک بلند و بالا مرد بن گیا تھا — اب اس گھر کی ساری ذمہ داری اس پر تھی —— اپنی ماں کا اور ننھی سی بہن کا محافظ اب وہ تھا ۔

لوگ آتے تھے —— اس کی ماں کے ساتھ تعزیت کرتے ہوئے ہر کوئی یہی کہتا تھا کہ اسے غم نہیں کرنا چاہیئے تھا ۔ اسے دکھی نہیں ہونا چاہیے تھا ۔ اس کے کاشف

کی خدا عمر دراز کرے ۔ صرف پانچ سات سال کی تو بات تھی ۔ پھر اُس نے ماں بہن کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لینا تھیں ۔

اور — تبھی سے وہ پورے لمبے قد کا جوان مرد بن کر سوچنے لگا تھا ۔ صرف پانچ سات سال کی تو بات تھی —— آٹھویں میں پڑھ رہا تھا —— تعلیم مکمل کرتے ہی اُس نے کسی نوکری پہ لگ جانا تھا اور بس ۔

پھر ابا کی طرح صبح دفتر جانا ۔ سہ پہر کو گھر آ کر امی کے پاس اک آرام کرسی پر بیٹھ کر کبھی ریڈیو سننا اور کبھی گڑیا کے ساتھ کھیلنا —— اور پھر مہینے بعد تنخواہ لا کر امی کے ہاتھ پہ دھر دینا ۔ بس — ! یہ کوئی مشکل منزل تو نہ تھی —— وہ سنبھال لے گا انشاءاللہ ساری ذمہ داریاں ۔ !!

مگر — مگر —— اس وقت اسے یہ تو اندازہ ہی نہ تھا کہ کمائی کے لیے ایک مرد کو کتنی تگ و دو کرنا پڑتی ہے اور کون کونسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں —— اور پھر سب سے بڑی بات — گڑیا نے اتنا ہی تو نہیں رہ جانا تھا ۔ اس نے جوان ہونا تھا ۔ اک جوان بیٹی کی ذمہ داری اتنی کٹھن نہیں ہوتی جتنی جوان بہن کی —— اور جوان بہن بھی کیسی —— ؟ گڑیا جیسی —— !!

بے حد متناسب قد اور خوبصورت ترین جسم والی اس کی بہن کو پروردگار نے صورت بھی ایسی دی تھی کہ ہر کوئی اسے دیکھ کر ایک بار ٹھٹھک ضرور جاتا تھا ۔ سپید سپید ، گلابی گلابی اور چمکیلی چمکیلی سی اس کی رنگت کے ساتھ ناک نقشہ اتنا تیکھا اور انوکھا سا تھا کہ دوسروں کی نگاہیں بار بار اس پر اٹھتیں —— بھائی ہو کر بھی اس کا جی چاہتا قدرت کی اس بے مثال صناعی کو سامنے بٹھا گھنٹوں دیکھتا رہے ۔ مگر وہ اس کا بھائی تھا ۔

اسے تو ہر وقت اس کا فکر ہی لگا رہتا۔ اس کی شکل و صورت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کاشف کا ارادہ اسے میٹرک کے بعد مزید تعلیم دلانے کا نہ تھا مگر اس کے سسرال والوں کا خیال تھا کہ جب تک اس کی شادی نہیں ہوتی۔ اس کا گھر میں بیکار بیٹھنے کا تُک ہی کوئی نہ تھا۔ یوں بھی علم جتنا بھی حاصل ہو جائے کوئی بُری بات تو نہ تھی۔

گو انھوں نے سرسری سا لکھا تھا مگر ماں کے بار بار احساس دلانے پر اب کاشف کے اپنے دل میں بھی یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ گڑیا تھی ہی انہیں کی۔ اس کا ہر کام انہیں کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیئے تھا۔ اس کا ہر قدم انھیں کی مرضی سے اُٹھنا چاہیے تھا۔

گڑیا کی جوانی اور حسن کی تابندگی کے ساتھ ساتھ ان کی مالی حالت بھی مانع تھی کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرتی۔ مگر۔۔ انھیں اسے کالج میں داخل کرنا ہی پڑا۔ کاشف کو بی۔ اے کیئے سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ مزید تعلیم کا خیال اس نے نوکری کے لیے ترک کر دیا ہوا تھا مگر نوکری تھی کہ اتنا وقت گزرنے پر اور کئی دفتروں وغیرہ کی خاک چھاننے کے باوجود بھی ابھی تک اس کی من موہنی شکل دیکھنا نصیب نہ ہوئی تھی۔

گڑیا کے کالج میں داخلے کے لیے پھر شہزاد نے ہی قرض دیا تھا۔ اب تو اس کا قرض بھی بہت ہو گیا تھا۔ اس پریشانی کے علاوہ گڑیا کی حفاظت اک بے حد مشکل ذمہ داری تھی۔

کاشف کی ہدایت کے مطابق کالج جانے کے لیے وہ ہمیشہ سُوتی لباس پہنتی موٹی سی ململ کا دوپٹہ بڑی بوڑھیوں کی طرح اچھی طرح اپنے اردگرد لپیٹتی۔۔ نگاہیں ہر وقت قدموں میں جھکائے رکھتی لیکن پھر بھی۔۔ اتنی حفاظتی تدابیر کے باوجود وہ خزانہ ہر نگاہ کو دکھائی دے جاتا جس کا چوکیدار قدرت نے کاشف کو بنا ڈالا تھا۔

اور یہ سب سے کٹھن ذمہ داری تھی۔۔ وہ بائیس تئیس سال کا جوان مرد تھا۔

بڑے حوصلے اور ہمت والا تھا۔ مگر یہ ذمہ داری تو اس کی ہمتیں توڑ توڑ رہی تھی۔۔ حوصلے چور چور کئے دے رہی تھی۔

کئی بار علیحدگی میں اس نے ماں سے گڑیا کی جلد از جلد شادی کرنے کے متعلق بات چیت بھی کی۔۔ اس گڑیا کی شادی کی۔۔ جس کی جُدائی اک پل کے لیے بھی اسے گوارا نہ تھی۔ مگر اب وہ۔۔ وہی کاشف تھا۔۔ ہر آنے والے دن سے پہلے پہلے وہ اسے اپنے گھر سے رخصت کر دینا چاہتا تھا۔

لیکن۔۔ لیکن۔۔ یہ بھی تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے وداع کرنے کے لیے اس کے پاس تو سوائے قرض کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ گو اس کے سسرال والے بڑے اچھے لوگ تھے۔۔ ذرا سا ان کی طرف سے اشارہ بھی ہوتا تو وہ اک دودھ کی پیالی پر اسے بیاہ لے جاتے مگر اس کی اپنی بھی کوئی غیرت تھی۔ کوئی عزت تھی۔۔ بہن، اور وہ بھی گڑیا جیسی اس کی بہن، جو اسے بے حد عزیز تھی۔ بھائی کے در سے خالی ہاتھ رخصت ہو جاتی۔ یہ تو ممکن ہی نہ تھا۔۔ وہ اپنی گڑیا کے اس مان کو کبھی، کبھی بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا جو بہنیں بھائیوں کی ذات سے وابستہ کر لیتی ہیں۔

یوں۔۔ زندگی کی گاڑی کھینچنا اتنا سہل تو نہ تھا جتنا وہ سمجھا کرتا تھا۔ فکر۔ پریشانیاں بے بسی۔ مجبوریاں۔۔!!!

"کاشف۔۔!" شہزاد کی آواز پر وہ چونکا۔

"آجاؤ بھئی۔"

"یہ اکیلے چپ چاپ بیٹھے کیا کر رہے ہو؟" شہزاد غور سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"اپنے مقدر کی تاریک لکیروں کو دیکھ رہا ہوں۔" وہ زہر خند سے بولا۔

"تو پھر غور سے دیکھو۔ شاید آج کوئی روشن دکھائی دے جائے۔"

"اپنے ایسے نصیب کہاں۔؟"

"مایوسی گناہ ہے۔ پھیلاؤ ذرا ہاتھ۔"

"چھوڑو یار! کیوں مذاق کرتے ہو۔؟"

"دکھاؤ تو ذرا اپنا ہاتھ۔"

"محاورے والا دکھا دوں۔؟" کاشف مسکرایا۔

"دوست ہو۔ وہ دکھا ہی نہیں سکو گے۔"

شہزاد بڑے وثوق سے بولا۔ کاشف ہنس دیا۔

"دکھاؤ نا۔" شہزاد نے پھر اصرار کیا۔

"تمہیں ہاتھ کی لکیریں پڑھنا آتی ہیں۔؟"

"آتی ہی ہیں تو کہہ رہا ہوں نا۔"

کاشف نے مسکراتے ہوئے مگر بہت بے دلی سے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ دیکھو۔ یہ لکیر زحل سے ہو کر شمس کی طرف آ رہی ہے۔ بلکہ آ گئی۔ سمجھو آج ہی نوکری مل جائے گی۔"

"بکواس۔" کاشف نے ہاتھ کھینچ لیا۔ "ایسے ہی تک بندی کر رہے ہو۔"

"نہیں نہیں۔ ٹھہرو۔ دکھاؤ۔ یار پھر دکھاؤ۔"

کاشف نے تیوری چڑھا کر اسے دیکھتے ہوئے دوبارہ ہاتھ پھیلا دیا۔

"یہ دیکھو۔ مل گئی نوکری۔" شہزاد نے ایک لفافہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" کاشف چونکا۔

"کھولو۔ پڑھو۔"

"کیا ہے آخر۔؟"

"مجھ سے کیا پوچھے جا رہے ہو۔ تمہیں پڑھنا نہیں آتا کیا؟"

کاشف لرزتے ہاتھوں سے وہ لفافہ کھولنے لگا۔ عجلت میں، گھبراہٹ میں اس سے لفافے میں سے کاغذ نہیں نکالا جا رہا تھا۔

"کہہ نہیں رہا تھا کہ مشتری اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ عطارد کے گلے سے مل رہی ہے۔" کاشف پڑھ رہا تھا اور شہزاد بڑبڑائے جا رہا تھا۔ "اور جب عطارد۔۔"

"عطارد کے بچے!" کاشف یکدم اُٹھ کر شہزاد کے گلے سے لپٹ گیا۔

"یہ کیا ہوا۔؟ کیسے ہوا۔؟ یہیں سے تو پہلے مجھے کورا جواب مل گیا تھا۔"

"یہاں کا منیجر میرا ایک پرانا دوست ہے۔ یہ تو مجھے آج ہی معلوم ہوا۔ بس میں نے اسے گریباں سے پکڑ لیا۔ کہا۔ جب تک میرے کاشف کو نوکری نہیں دو گے یہاں سے ہلنے نہ دوں گا۔"

"اوہ! شہزاد! تم کتنے اچھے ہو۔ کتنے عظیم ہو۔ میری زندگی میں اگر تم۔۔۔"

"چلو یار! چھوڑو یہ قصہ۔" شہزاد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ بتاؤ چائے وائے مل سکتی ہے؟"

"ہاں ہاں۔ آج نہیں ملے گی۔؟ آج تو تمہیں بقلم خود بنا کر پلاؤں۔ ایک نہیں کئی پیالیاں پلاؤں گا۔ مزید خواہش کرو گے تو چائے میں نہلا بھی دوں گا۔" کاشف ہنستا، مسکراتا اُٹھ کر بھاگا۔

"کہاں چلے۔؟" پیچھے سے شہزاد نے پوچھا۔

"امی کو تو خبر کر دوں۔"

"یوں ۔۔۔؟ ارے بندۂ خدا یوں خالی ہاتھوں اور ایسے سوکھے مُنہ کے ساتھ ۔۔۔ ایسی خوشی والی خبریں تو میٹھی میٹھی چیزیں ہاتھ میں لے کر سُنایا کرتے ہیں۔"

کاشف اس کا مطلب سمجھ گیا۔ یکدم چہرے پہ افسردگی کی ردا تن گئی۔ "یار اپنی جیب تو بالکل خالی ہے اور امّی سے ایک ٹیڈی پیسہ بھی مانگتے ہُوئے شرم آتی ہے۔"

"ان سے کیوں مانگو گے ۔ یہ لو ۔۔" شہزاد نے جیب سے اِک دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اوہ! نہیں ۔۔۔ پہلے ہی مجھ پہ بڑا بوجھ ہے۔"

"بکواس نہیں یار!"

"نہیں شہزاد! میٹھی چائے سے ہی منہ میٹھا کرلیں گے۔"

"یہ کیا بیہودگی ہے ۔۔۔ جاؤ نا ۔۔۔ مجھے بھوک بھی بہت لگی ہے۔"

"امّی سے کہوں کھانا بنا دیں ۔۔؟"

"نہیں ۔۔۔ آج کی بُھوک صرف مٹھائی سے مِٹے گی۔"

"بڑے ہی کمینے ہو یار ۔۔!" کاشف اب بھی کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔

"اور تم بڑے ہی ڈھیٹ ہو یار!" شہزاد کا لہجہ شاکی ہو گیا۔

"میری اتنی سی بات بھی تم نہیں مان سکتے ۔۔؟"

کاشف جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ ان کا گھر بازار کے سرے پر ہی تو تھا ۔ ہر چیز وہاں مل جاتی تھی۔ دو منٹ میں ہی کاشف مٹھائی لے آیا۔ مٹھائی دیکھتے ہی شہزاد نے بلند آواز میں پکار پکار کر امی کو وہیں بُلا لیا، پھر مٹھائی کا ڈبّہ ان کے ہاتھوں میں تھما کر جب انہیں کاشف کو ملازمت مل جانے کی خبر سُنائی گئی تو کتنے ہی لمحے جیسے انہیں یقین نہ آیا۔

اور جب یقین آیا تو اُنھوں نے شہزاد کو لاکھوں کروڑوں دعائیں دے ڈالیں۔ ان کے لیے تو وہ سچ مچ رحمت کا فرشتہ بن چکا تھا۔ ہر مشکل وقت میں کام آتا تھا۔ ان کی ہر پریشانی کا سدّباب کرتا تھا ۔۔ امی سے لپٹ لپٹ کر دونوں شور مچا رہے تھے ۔۔

شور شرابے کی آوازیں سُنیں تو دھنک سے رہا نہ گیا۔ وہ بھی کاشف کے کمرے میں چلی آئی ۔ حالانکہ شہزاد کی موجودگی میں اب وہ کبھی ادھر نہیں آیا کرتی تھی۔ کسی دوسرے نے منع بھی نہیں کیا تھا۔ مگر اسے خود کو ہی یہ احساس پُوری شدّت سے تھا کہ وہ اب جوان تھی اور اس کی جوانی آثم کی امانت تھی۔ بڑی دیانت داری سے وہ اس امانت کی حفاظت کر رہی تھی۔

"کیا ہُوا کاشی جی ۔۔؟" اتنا شور کیوں مچا ہُوا ہے؟" وہ دروازے میں ہی کھڑی پُوچھ رہی تھی۔

کاشف کی ہنسی کو یکایک بریک لگ گئے۔ نگاہ اُٹھائی ۔۔۔ بڑی اچھی طرح اُس نے دوپٹہ اوڑھا ہُوا تھا مگر گہرے فیروزی رنگ کے دوپٹے کے ہالے نے اس کے چاند ایسے تابناک چہرے کو اور بھی جگمگا دیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی نگاہ شہزاد کی طرف اُٹھ گئی۔ جانے یہ کاشف کی دانستہ حرکت تھی یا گڑیا کے معاملے میں وہ چوکس ہی اتنا رہتا تھا۔

اتفاق ہی تھا شاید ۔۔۔ شہزاد کی نگاہیں اس وقت دھنک کے خوشنما پیکر پر ہی جمی تھیں۔ کسی اندرونی سوچ سے بے کل سا ہوتے ہُوئے کاشف جلدی سے اُٹھا اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ہُوئے گڑیا کے پاس جا پہنچا۔

"مجھے نوکری مل گئی ہے۔" بڑی عجلت سے یہ خبر سُناتے ہُوئے اُس نے گڑیا کا

بازو تھاما اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"سچی مچی مل گئی ہے ۔۔؟ مذاق تو نہیں کر رہے ۔۔؟" وہ بے یقینی سے کاشف کے چہرے کو گھور رہی تھی۔

"تو اور کیا جھوٹ بولوں گا ۔۔؟"

اتنی خوشی کی بات تھی ۔۔ مگر یہ کاشف کے انداز میں تلخی سی کیوں تھی ۔۔؟ دھنک نے حیرت سے بھائی کی طرف دیکھا ۔۔ وہ اسے گھورے جا رہا تھا۔

"کیا ہُوا کاشی جی ۔۔؟"

"تم ادھر کیوں گئی تھیں ۔۔؟"

"شور کی آواز آئی تو میں نے کہا پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے ۔ لیکن آپ مجھے کیوں ایسے گھور رہے ہیں ؟"

"اوہ! کچھ نہیں ۔۔" کاشف کو جیسے ہوش سا آ گیا ۔۔ واقعی اس میں دھنک کا کیا قصور تھا ۔ جلدی سے بات بنائی ۔۔ "گڑیا! چائے بنوانا تھی ۔۔"

"ابھی ایک منٹ میں بن جاتی ہے ۔۔" دھنک نے مسکرا کر چٹکی بجائی اور باورچی خانے میں چلی گئی ۔ چولھا جلا کر چائے کا پانی اُوپر رکھتے ہُوئے پیچھے مُڑی ۔۔ نگاہ باورچی خانے کے دروازے میں جا پڑی ۔ کاشف وہاں چپ چاپ کسی سوچ میں ڈوبا کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے کاشی جی ۔۔؟ آپ کو نوکری ملنے کی خوشی نہیں ہُوئی ؟"

"ہُوئی ہے ۔ بہت ہُوئی ہے ۔۔ اب میں جلد از جلد اپنی گڑیا کی شادی کروں گا۔"

"ہائے اللہ!" اُس نے ہاتھوں میں چہرہ چھپاتے ہُوئے اپنی عادت کے مطابق کاشف کے سینے میں سر گھسیڑ لیا ۔۔ میں اپنے کاشی جی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"اور وہ جو تیرے بغیر تیرے ساس سُسر اداس ہوتے رہتے ہیں اور پھر تیرا آتم بھی تو ہے ۔ جو تیری راہیں دیکھ رہا ہو گا ۔" کاشف گڑیا کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہُوئے قدرے شوخ لہجے میں بولا ۔

"ہائے کاشی جی! اب چپ بھی کر جائیے نا ۔"

"دیکھ گڑیا!" پھر وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا ۔ "تو میری بہن ہے نا ۔ میری ایک بات مان ۔۔"

"جی ۔۔" اس نے سر اُٹھا کر بھائی کے چہرے پہ نگاہیں مرکوز کر دیں ۔

"جب شہزاد موجود ہُوا کرے تو تُو میرے کمرے میں نہ آیا کر ۔"

"میں نہیں آیا کرتی کاشی جی! صرف آج . . . !"

"وہ میں جانتا ہوں ۔۔ نہ قصور تیرا ہے ۔۔ نہ شہزاد کا ۔ وہ بہت اچھا میرا دوست ہے ۔۔ بے حد مخلص ۔ بہت شریف ۔۔ مگر تجھ پر کسی غیر کی نگاہ پڑے تو یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو پاتا ۔۔ تو ہمارے پاس کسی کی امانت ہے گڑیا ۔۔!"

"کاشی جی ۔۔!"

"ہاں گڑیا! ہم سب کا ہی فرض ہے کہ اس امانت کی حفاظت کریں ۔ تو بھی گڑیا! تو بھی میری بہنا ۔" کاشف نے اسے سینے کے ساتھ لگا لیا ۔ "میرا جی نہیں چاہتا کہ کبھی بھی تجھے اپنے سے جُدا کروں مگر تیرا اصل گھر وہی ہے ۔ اور ہمارے خُدا کا بھی یہی فرمان ہے ۔"

"یہ دونوں بہن بھائی گلے کیوں مل رہے ہیں ۔۔؟" امی کے شگفتہ چہرے پر مسکراہٹ بکھری تھی ۔

"نوکری کی خوشی میں عید مل رہے ہیں ۔" گڑیا شوخی سے بولی ۔

"نوکری کی خوشی میں عید" امی اور کاشف دونوں ہی ہنس پڑے۔

"لاکھوں کروڑوں میں، اربوں میں کھربوں میں، میری ایک بہنا ہے" کاشف گڑیا کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے ہوئے اور گنگناتے ہوئے باورچی خانے سے باہر نکلنے لگا۔ "مگر گڑیا۔!" جاتے جاتے جانے کیا یاد آیا۔ جلدی سے پلٹا۔

"جی کاشی جی۔!"

"چائے تیار ہوگئی تو مجھے آواز دے لینا۔ میں خود ہی آکر لے جاؤں گا"

"جی بہت اچھا۔ مگر کاشی جی! کیا ہمیں مٹھائی نہیں ملے گی؟"

"ارے! وہ تو ساری تمہاری ہے۔ ساری کی ساری۔ کیونکہ۔ لاکھوں کروڑوں میں، اربوں میں کھربوں میں، تو میری ایک بہنا ہے"

وہ بلند آواز میں گاتے ہوئے باہر نکل گیا۔

○

"چلو سب۔ ایک۔ دو۔ تین۔" وہ شرارت سے ایک ایک کو گن گن کر گاڑی کے اندر گھسائے جا رہا تھا۔ "توبہ توبہ۔ فیملی پلاننگ والوں کو پتہ چل جائے نا اگر کہ اس گھر میں اتنی ڈھیر ساری چیلیں ہیں تو وہ فٹافٹ آئیں اور سوائے ایک کے باقی سب کو اڑا جائیں"

"ایک کونسی۔؟" سب سے چھوٹی ترنم نے جلدی سے پوچھا۔

"سب سے بڑی والی۔ اور کونسی؟" آثم صنم کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

"کیوں بڑی والی۔ سب سے چھوٹی والی کیوں نہیں۔؟" ترنم کی ذہانت بولی۔

"چھوٹی والی کیوں نہیں۔؟" آثم نے منہ بگاڑ کر اس کی نقل اتاری۔

"اتنی ہی زندگی عزیز تھی تو کسی اور کے گھر چلی جاتیں نا۔ سب نے ادھر ہی منہ دھر لیا ہے۔ بیچارے ہمارے نیازی انکل۔! کتنی مشکل پڑے گی سب کو بیاہنے میں" ساتھ ساتھ وہ انہیں گاڑی میں ٹھیک ٹھیک طرح سے بٹھائے بھی جا رہا تھا۔ پچھلی سیٹ ان چاروں سے بھر گئی تو وہ صنم کی طرف مڑا۔

"چلو صنو! تم آگے بیٹھ جاؤ۔ پیچھے تو اب جگہ ہی نہیں رہی"

صنم اس کی چالاکی پہ بڑے پیارے انداز میں سر جھکا کر مسکراتے ہوئے اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔

"بھائی جان! آپ جو کہتے ہیں کہ ہم میں سے کچھ کسی اور کے گھر چلی جاتیں تو یہ بتائیے کس کے گھر جاتیں" وہ ابھی تک یہی سوچ رہی تھی۔

"کس کے گھر جاتیں۔؟" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے آثم سوچ سوچ کر بولا "مثلاً۔ ہمارے ہی گھر۔ وہاں ایسی کوئی چڑیل نہیں ہے"

"وہاں تو صنم آپی ہی چلی جاتیں۔ انھیں ہی آپ کا گھر اچھا لگتا ہے"

"اچھا۔؟" آثم نے شوخی سے دیدے پھاڑ کر پیچھے دیکھا۔

"ہم نہیں اپنی آپی کو جانے دیں گے" پونم کو صنم کے ساتھ دوسری بہنوں کی نسبت زیادہ پیار تھا۔

"کیوں؟" آثم گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے مسکرایا "کیا آپی کو ساری عمر گھر میں ہی بٹھا رکھنا ہے"

"بچوں کے ساتھ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" صنم مدھم سے لہجے میں بولی۔

"بھئی میری منی منی سی بہنیں ہیں۔ جیسی چاہوں گا باتیں کروں گا۔ تم کیوں ٹوکتی ہو؟"

"ہاں — ہم سب بھائی جان کی بہنیں ہیں۔" ترنم کھڑی ہو کر شمار کرنے لگی۔ "ایک دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ پوری پانچ —"

"ارے ارے ارے!" آثم بیٹھا کر عجلت سے بولا "ایک کم کر دو — چار ہیں ہماری بہنیں۔"

"چار — ؟ چار کیسے ہیں — گن کر دیکھ لیں پانچ ہیں۔"

ترنم نے ایک بار پھر، ایک ایک پر انگلی رکھ رکھ کر گنا۔

"ہیں بھائی جان! پوری پانچ ہیں — قسم سے بالکل پانچ ہیں۔"

انجم اور ارم بھی اب کافی باشعور تھیں — صنم کو خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں آثم کچھ اور نہ بول دے — وہ اب ذومعنی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی تھیں اور ترنم جو تھی معصومیت میں پوچھے ہی جا رہی تھی۔

"نمو! نمو وہ دیکھو کیا ہے — ؟" اس کا دھیان ہٹانے کے لیے صنم جلدی سے بول پڑی۔

"کہاں آپی — ؟"

"وہ دور — لو — گاڑی تو آگے گزر گئی۔ تم نے دیکھا ہی نہیں۔"

"شکریہ —! اس ننھی سی مصیبت سے نجات دلانے کا۔" آثم نے جھک کر صنم کے کان میں سرگوشی کی۔ "اور دوسرا شکریہ اس نیلے لباس پر سفید مالا پہن کر میرے اتنے قریب بیٹھنے کا — تمہاری مہک میرے ہوش و حواس اڑائے دے رہی ہے۔"

"آگے دیکھیے جناب —!" صنم شرمیلی سی ادا کے ساتھ بولی۔ "اور ہوش و حواس کو بھی قابو میں رکھیئے — کہیں سچ مچ ساری کی ساری چلیں اڑ کر اللہ میاں کے پاس پہنچ جائیں۔"

"ساری کی ساری جائیں گی تو ہم کب پیچھے رہ جائیں گے — ہم بھی صنم تیرے ساتھ ہی جائیں گے۔"

"کہاں جانا ہے بھائی جان — ؟ ترنم ان کی سیٹوں کے درمیان ٹھوڑی ٹکا کر کھڑی تھی — فقرے کا آخری حصہ سن کر پوچھنے لگی۔

"جہنم میں۔" آثم کو تاؤ آ گیا۔

"میں بھی چلوں گی —" وہ معصومیت سے بولی۔ انجم اور ارم زور زور سے ہنسنے لگیں —

"جہنم دوزخ کو کہتے ہیں نمو —!" ترنم سے بڑی پونم جلدی سے اس کی حمایت میں بولی۔ "تم وہاں نہ جانا۔ جل جاؤ گی۔"

"اور میں بے شک جل جاؤں۔" آثم نے گردن پیچھے گھماتے ہوئے گھور کر سب کو دیکھا۔

"خدا نہ کرے —" صنم بڑی جلدی سے مدھم سی آواز میں بولی — اور اس کی فوراً بڑبڑاہٹ بھی آثم کے کان میں اتر جایا کرتی تھی۔ اک بڑی والہانہ سی نگاہ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے آثم بھی اسی کے سے مدھم لہجے میں بولا۔ "شکریہ —!" اور پھر ننھی لڑکیوں سے مخاطب ہو گیا۔ "ساتھ سیریں کراؤں اور ساتھ جہنم میں جاؤں — ٹھہر جاؤ — جا کر تم سب کو راوی میں پھینک کر آتا ہوں۔"

"میں سمجھی تھی جہنم بہشت کو کہتے ہیں۔" ترنم نے اس کی دھمکی سے سہمتے ہوئے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔ سب کی ہنسی چھوٹ گئی — آثم بھی رخ پھیر کر مسکرانے لگا۔

"کہاں جانا ہے صنم — ؟" آثم نے چپکے سے صنم کا گود میں رکھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

"انجم اور ارم سے پوچھ لیں۔"

"چڑیا گھر — چڑیا گھر —" ترنم سے مشورہ بھی نہیں لیا گیا تھا مگر وہ اچھل اچھل کر

اپنی رائے کا اظہار کرنے لگی۔

"چڑیا گھر میں شاید ایک ساتھ اتنے پنجرے خالی نہ ہوں۔" آثم شوخی سے ہنسا۔

"پاگل! ہم تو کونز کھانے جا رہے ہیں۔" ارم نے منو کے سر پر اک ہلکی سی دھول جمائی۔

"کونز ــ ؟" منو نے ننی منی پلکیں جھپکتے ہوئے توتلی سی آواز میں پوچھا۔

"ہاں کونز ــ" آثم نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔" وہ جو پچھلے اتوار کو کھائی تھیں۔"

"جانتی ہے ــ" صنم مسکرائی ــ "اسی لیے تو آثمی! آج پھر مصیبت پڑی۔"

"مصیبت نہ کہو۔ بلکہ عین راحت۔" آثم نے صنم کا ہاتھ زور سے دبایا۔ پھر جھک کر ہولے سے بولا۔" اب تو مدتیں گزر جاتی ہیں اور اکیلے میں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

"اور یہ موقع ہے ؟"

"ابھی دیکھنا کیسے موقع نکالتا ہوں۔" اور اس نے گاڑی کا رخ باغِ جناح کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔

"ہمیں تو لبرٹی جانا تھا۔" انجم راستوں سے اچھی طرح واقف تھی۔

"آج باغِ جناح چلیں گے۔ ساتھ تھوڑی سی سیر بھی ہو جائے گی نا۔"

"ہاں ــ یہ ٹھیک ہے ــ" انجم اور ارم خوش ہو گئیں۔

"ارم! گلستانِ فاطمہ میں بھی چلیں گے۔"

"ہاں ــ اور میں تو پہاڑی پر بھی چڑھوں گی۔"

"سن رہی ہو۔" آثم ذرا صنم کی طرف جھکا۔ موقع مل جائے گا نا اکیلے میں بات کرنے کا۔" اس نے سرگوشی کی۔ شرمیلی سی مسکراہٹ صنم کے چہرے پر قوسِ قزح بن کر پھیل گئی۔

"بھائی جان! جب تک باغِ جناح آتا ہے جلدی سے ایک لطیفہ سنا دیجئے۔"

انجم نے فرمائش کی تو باقی سب بھی شور مچانے لگیں۔

"ہاں ہاں ــ لطیفہ لطیفہ۔"

"اوہ! پاگل لڑکیو! چپ کرو۔" آثم زور سے گرجا۔

"ہم نے ٹلنا بالکل نہیں۔" انجم بولی۔ ساتھ ہی باقی بہنوں کو اشارہ کر دیا۔ چاروں نے پھر یک آواز ہانک لگائی۔ "لطیفہ! لطیفہ ــ!!"

"اچھا اچھا ــ!" آخر آثم نے ہار مان لی۔" اکثریت ہمیشہ جیت جایا کرتی ہے۔ تمہارے والدین بڑے عقلمند ہیں۔"

"تو پھر پہلے ہی مقابلہ نہیں کرنا تھا نا۔"

"غلطی ہو گئی ــ صنم ذرا میرے کانوں کو ہاتھ لگانا۔"

صنم صرف ہنس کر رہ گئی۔

"لائیے لائیے ــ یہ خدمت میں کئے دیتی ہوں۔" ارم نے شرارت سے آثم کے کان پکڑ لیے۔

"پھر لطیفہ بھی سن لینا۔"

"اچھا نہیں نہیں۔" ارم نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیے۔ سنائیے پھر۔"

"آثمی! تم نے خود ہی انہیں لطیفوں کا چسکا ڈالا ہوا ہے۔ اب جہاں کہیں اکٹھی ہوتی ہیں لطیفے بازی شروع کر دیتی ہیں۔"

"بھائی جان! وعدہ پورا کیجئے۔" انجم قدرے رعب سے بولی۔

صنم نے پیچھے منہ پھیر کر سب کو گھور کر دیکھا۔ مگر ــ مرعوب ہونے کے بجائے سب نے ایک دوسرے کو اشارے کر کے پھر یک آواز شور مچا دیا۔" وعدہ کے مطابق ــ لطیفہ ــ لطیفہ ــ لطیفہ ــ"

"اچھا خاموش بھی تو ہو جاؤ۔"

"لیجئے جناب ہوگئے" انجم کے اشارے سے سبھی نے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ لیں۔

"یامولیٰ تیری پناہ! اب تو سُنانا ہی پڑے گا۔ کونسا سناؤں صنم؟"

"مجھے کیا پتہ" صنم قدرے بگڑے موڈ سے بولی۔

"اچھا پھر۔ خود ہی سوچوں" ایک ہاتھ سے سر کو کھُجلاتے ہُوئے اس نے کنکھیوں سے صنم کی طرف دیکھا۔ موڈ ٹھیک ہی بگڑا ہُوا تھا۔ دونوں نے سوچا تھا وہ چار دن آپس میں لگی رہیں گی اور یہ دونوں اپنے دل کی، اپنے جذبوں کی، اپنے پیار کی، ڈھیر ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔ مگر۔

"سنائیے بھی"

"ہاں یاد آگیا۔ ایک نیازی صاحب تھے"

"پھر ہمارے ڈیڈی کا اور ہمارا کوئی لطیفہ سُنانے لگے" ارم نے غل مچایا "یہ کیا بات ہُوئی۔ کوئی اور لطیفہ سُنائیے نا"

"بھئی اس لطیفے والے نیازی صاحب کوئی اور تھے۔ تم کیا سمجھتی ہو نیازی صاحب ساری دُنیا میں صرف ایک ہی ہستی کا نام ہے۔؟"

صنم مسکرائے جا رہی تھی۔ آثم کی طبیعت سے ان سے کہیں زیادہ واقف تھی۔

"اچھا بھائی جان سُنائیے پھر" اب پونم بولی "ایک دوسرے نیازی صاحب تھے۔ ہمارے ڈیڈی نہیں۔ پھر آگے کیا ہُوا۔؟"

"ان کے بہت ڈھیر سارے بچے تھے"

"اوں اوں۔ ہمارا لطیفہ۔ ہمارا لطیفہ" ارم بولی۔

"بھئی نہیں۔ دنیا میں ایک ہی نیازی صاحب تو نہیں جن کے ڈھیر سارے بچے ہیں۔ اور بھی بہت ہیں"

صنم بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہی تھی۔ آثم ہونٹوں میں سے پھسل پھسل آنے والی مسکراہٹ کو ضبط کرتے ہُوئے آنکھوں کے گوشوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ ساری محفل یہ سب کچھ اتنا پُرلطف اور سہانا تھا کہ گاڑی کی رفتار اُس نے بہت کم کی ہُوئی تھی۔ چلو تنہائی نہ سہی۔ صنم کا قرب تو اسے حاصل تھا۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا۔

"اچھا پھر سُنائیے نا" پونم پھر بے صبری سے بولی "ایک دوسرے نیازی صاحب اور ان کے ڈھیر سارے بچوں کا لطیفہ"

"ہاں۔ جس شہر میں وہ نیازی صاحب رہتے تھے۔ وہاں بہت زلزلے آتے تھے۔ نیازی صاحب کو بڑا فکر تھا کہ خدانخواستہ روز روز آنے والے زلزلوں سے اگر ان کا مکان گر جائے اور ڈھیر سارے بچوں میں سے کوئی ایک آدھ نیچے دب دبا کر فوت ہو جائے تو۔؟ یوں تو دنیا کی آبادی میں کمی واقع ہو جائے گی۔ بہت دن پریشان رہنے کے بعد آخر انہیں ایک حل سُوجھ گیا۔ کسی دوسرے شہر میں ان کا ایک دوست رہتا تھا۔ انہوں نے اس کے پاس اپنے بچے بھیج دیئے"

"پھر زلزلہ نہیں آیا وہاں۔؟" ارم پوچھنے لگی۔

"سنو تو۔ تمہاری بیچ میں ٹوکنے والی عادت بڑی خراب ہے" انجم نے اسے گھورا۔

"آپ سنائیے بھائی جان۔!" وہ اتنی دلچسپی لے رہی تھی۔

"چند دن گزرے۔ نیازی صاحب کے دوست کا خط آیا۔ پلیز! زلزلے یہاں بھیج دو اور بچے منگوالو۔"

صنم، انجم اور ارم تینوں ہنس ہنس کر دوہری ہونے لگیں "اتنے شریر تھے وہ بچے؟" انجم نے آنکھوں میں آیا پانی صاف کرتے ہُوئے کہا۔

"ہاں۔ کچھ ایسے ہی تھے۔"

"پھر بچے واپس آگئے۔؟" پونم اس لطیفے کا انجام سُننے کی منتظر بیٹھی تھی۔

"ہاں پونم۔" آثم نے ایک ٹھنڈی آہ بھری "بچے واپس آگئے اور اب میری

یہی درخواست ہے نیازی صاحب سے ۔!"

"اچھا ۔ !پھر ہمارا لطیفہ سنا دیا۔" ارم جنگ و جدل کے لیے آمادہ ہو رہی تھی کہ آثم نے ہنستے ہوئے جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی سفید جھنڈی دکھا دی۔

"لو بھئی! باغِ جناح آگیا ۔" ساتھ ہی گاڑی کو بریک لگ گئے۔ پیچھے سے ساری لڑکیاں نکل کر اِدھر اُدھر بھاگ گئیں۔

"کیوں ۔؟ کیا ہوا ۔؟" صنم چونک کر بولی۔ جانے کس دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔

"بھئی باغِ جناح آگیا ہے۔" آثم مسکرایا "کیا میرا قرب تمہیں واقعی ایسا مدہوش کر دیتا ہے کہ ۔۔"

"ہائے اللہ!" اس نے جلدی سے آثم کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا "کیسی باتیں کرتے ہو ۔" گالوں پر گلال لیے وہ جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

آثم نے جلد جلد گاڑی کو لاک کیا پھر اس کے قریب آکر ہولے سے پوچھنے لگا۔

"کدھر ۔؟"

"جہاں لے چلو ۔" حیا بھری خوبصورت سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولی۔

"تو آؤ پھر ۔" آثم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ارے! وہ لڑکیاں ۔"

"وہ تو اب تک پہاڑی کے اُوپر بھی پہنچ چکی ہوں گی ۔" آثم زور سے ہنس دیا۔

صنم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ واقعی چاروں ہی غائب تھیں۔

"صنم! ایک منٹ تم یہیں ٹھہرو ۔۔ میں ذرا آئس کریم کا آرڈر دے آؤں ورنہ وہ تو ہمیں کھا جائیں گی ۔"

بڑی سہانی اور چمکیلی سی سہ پہر تھی۔ سردی کا موسم ہونے کے باوجود بہت سارے لوگ اتوار کا دن تفریح میں گزارنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ آثم واپس آیا۔ صنم ادھر

ادھر دیکھ رہی تھی۔

"آج تو ساری خلقِ خدا یہیں آئی ہوئی ہے ۔"

"فکر کیوں کرتی ہو۔ ہم پھر بھی کوئی نہ کوئی گوشۂ تنہائی ڈھونڈ ہی لیں گے ۔"

"ہائے اللہ! میرے کہنے کا یہ مطلب تھوڑا تھا ۔"

"اور اگر یہی مطلب ہوتا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی میری صنم ۔!"

آثم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ کسی علیحدہ جگہ کے لیے دونوں کی متلاشی نگاہیں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں ۔ واقعی بہت سارے لوگ آئے ہوئے تھے۔ مگر اس وسیع و عریض باغ میں اک ننھا سا گوشۂ تنہائی تلاش کر لینا دو محبت بھرے دلوں کے لیے چنداں مشکل نہ تھا۔ ان کے ساتھ ان کے جذبوں کی پاکیزگی اور سچائی تھی۔

"یہ جگہ بڑی مناسب ہے ۔"

"ہاں ۔" ہری ہری گھاس پر بیٹھتے ہوئے صنم نے لمبے لمبے سانس لیے۔

"اچھا جی ۔" آثم صنم کے پہلو کے ساتھ پہلو ملا کر بیٹھ گیا "اب کوئی بات کرو۔ بڑی مشکل سے ان چڑیلوں سے چھٹکارا ملا ہے ۔"

اپنے شوق اور خوشی سے آئی تھی مگر اب ۔ صنم کے چہرے پر بڑی خوبصورت سی گھبراہٹ تھی۔

"کوئی بات کرو نا ۔" آثم نے جھک کر بڑے پیار سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"میں ۔؟"

"ہاں ہاں ۔" آثم زور سے ہنس دیا۔ کیا میرے ساتھ تمہارے علاوہ کوئی اور بھی ہے جس سے میں کہوں گا ۔"

"اوہ ۔ !مگر مجھے کوئی بات نہیں آتی ۔" شرمیلی شرمیلی گھبراہٹ کے ساتھ وہ بوکھلائی ہوئی سی بولی۔

"بچپن میں تو بہت کیا کرتی تھیں۔"

"تبھی ختم ہو گئیں۔"

"اب تو شروع ہوئی ہیں صنم میری جان — !" آثم نے اس کی کمر کے گرد بازو پھیلا لیا۔

"پلیز! یہاں رومانس نہیں آثمی — !" صنم نے ہولے سے اس کا بازو پرے ہٹا دیا۔

"وہ دیکھو — ادھر لوگ آ جا رہے ہیں اور ابھی سب لڑکیاں بھی آ جائیں گی۔"

"لوگ ہماری جستجو میں نہیں ہیں پگلی! اور لڑکیوں کو تو یہ جگہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے کئی گھنٹے لگیں گے — ویسے —" اس نے دوبارہ صنم کی کمر کے گرد بازو کا حصار بنا لیا۔

"یہ تو ہماری بچپن کی عادت ہے — یاد ہے نا — میں ہمیشہ تمہاری کمر میں یونہی بازو ڈال کر بیٹھا کرتا تھا۔"

"وہ اور زمانہ تھا۔ اب تو جس وقت سب موجود ہوتے ہیں تو تمہارے سامنے آنے سے بھی مجھے شرم آتی ہے۔"

"ایک تو تمہاری یہ شرم لے ڈوبے گی — سب نہیں جانتے کہ ہم دونوں بچپن کے ساتھی ہیں۔"

جانتے ہیں — لیکن —"

"ارے یار! لیکن ویکن چھوڑ —" آثم نے اس کے کندھے کے ساتھ سر بھی ٹکا لیا۔
میں تو بس اتنا جانتا ہوں تم میری صنم ہو — صرف میری — شعور کے جاگتے ہی میں نے تمہیں دیکھا ہے اور تمہیں ہی اپنی ملکیت سمجھا ہے — لوگ جو جی میں آئے سوچتے رہیں۔"
آثم نے آنکھیں موند لیں۔

صنم نے ذرا سی گردن موڑ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا — آنکھیں بند کئے، اس کے کندھے کے ساتھ سر لگائے، یوں چپ چاپ بیٹھا وہ کتنا وجیہہ اور شاندار لگ رہا تھا — صنم اس کے چہرے کی طرف تکے ہی گئی۔

"یوں بیٹھی کب تک مجھے تکتی رہو گی — کوئی بات کرو صنم!" اس کی آنکھیں اسی طرح بند تھیں۔

"ہائے اللہ!" صنم گھبرا گئی۔ "تمہاری تو آنکھیں بند ہیں پھر کیسے تمہیں پتہ چلا کہ میں تمہاری طرف دیکھ رہی تھی۔"

"محبت بھرے دل کی آنکھیں سدا بیدار اور روشن رہتی ہیں — تم میری نگاہوں کے سامنے نہ بھی موجود رہو تو تب بھی میری آنکھیں تمہیں دیکھتی رہتی ہیں — سینکڑے سالوں سے، کئی جنموں سے تم میری آنکھوں میں موجود ہو میری ننھی سی دوست — !"

آثم نے صنم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بڑے پیار سے اسے سہلانے لگا۔
"یقین کرو بڑا سکون آ رہا ہے — زبان سے بے شک تم کچھ نہ بولو — مگر تمہارا لمس، تمہارا قرب مجھے جو داستانیں سنا رہا ہے — سچے جذبوں کے جو اسرار کھول رہا ہے اس کی لذت، اس کا نشہ، کچھ میں ہی جانتا ہوں — میں تو بے اختیار ہوا جا رہا ہوں صنم — !"

"آثمی! آثمی وہ دیکھو کتنی خوبصورت لڑکی۔" یکایک سامنے کچھ فاصلے سے گزرنے والے ایک جوڑے پر اس کی نگاہ جا پڑی۔ "ذرا دیکھو تو —" صنم نے آثم کا سر ہلایا۔

"ہو گی — اس نے اسی طرح آنکھیں میچی رکھیں۔ "مگر میری صنم سے زیادہ نہیں۔"

"پھر تم نے حسن دیکھا ہی نہیں ہے۔" صنم مسکرائی۔

"دیکھا ہے — بہت دیکھا ہے۔"

"نہیں — دیکھا ہوتا تو اپنی صنم کو سب سے زیادہ خوبصورت نہ کہتے — امی بیگم سے کبھی دھنک کے متعلق سنو — ایسا حسن اسے قدرت نے دیا ہوا ہے کہ ...."

"ہوتی ہو گی —" آثم نے اس کی بات کاٹ دی — "میں کب انکار کرتا ہوں۔

بہت ہی خوبصورت ہوگی — بہت ہی زیادہ — لیکن صنم جانم! یہ تو اپنی اپنی نظر کی بات ہے۔ میری نگاہ میں تم اتنی خوبصورت ہو — اتنی — کہ جیسے دونوں جہانوں کا حُسن بس اک میری صنم کے پیکر میں سمٹ آیا ہے — نہ تم سا اس دنیا میں کوئی اور ہوگا اور نہ اللہ میاں کی جنت میں کوئی حور ہوگی —"

"توبہ توبہ —!" شرم سے گلنار ہو جانے والے اپنے گالوں پر صنم ہولے ہولے تھپڑ لگانے لگی "کیسی باتیں کرتے ہو —؟ اپنی باتوں میں اللہ میاں کی حوروں کو گھسیٹنے کا بھلا کیا مطلب —؟"

"مطلب یہ کہ —" آثم نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"ارے ارے! سب لڑکیاں آگئیں —" صنم نے گھبرا کر یکدم اس کے ہاتھ جھٹکے۔

"اوئے ہوئے! یہ سچ مچ چڑیلیں ہیں۔ میرا خیال تھا یہ جگہ ڈھونڈنے میں انہیں کافی دقت محسوس ہوگی — اور خاصا وقت بھی لگے گا"

"کونز — کہاں گئیں ہماری کونز —" سب آکر آثم سے لپٹ گئیں۔

"ارے ٹڈی دل! میں کون نہیں ہوں —" آثم انھیں پیچھے دھکیل رہا تھا۔ صنم ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔

"ارے! وہ دیکھو۔ وہ بیرا جانے کسے تلاش کر رہا ہے —"

"یہی ہے — لڑکیو! تمہارے ہی لیے آئس کریم لے کر آیا ہے —"

سب اسی طرف لپک پڑیں۔

"توبہ توبہ! اتنی ڈھیر ساری سالیاں۔ جیسے فصلوں کو ٹڈی دل تباہ و برباد کر دیتا ہے — یہی حال ان سالیوں کے ہاتھوں میری جیب کا ہوگا۔ انہیں آئس کریم کا چسکا پڑ چکا ہے —" آثم زیرِ لب مسکراتے ہوئے بڑبڑایا۔

"ابھی وقت ہے — سوچ لو آثمی!" صنم شوخی سے بولی۔

"سوچا ہوا ہے سب کچھ —" آثم کا لہجہ یکدم سنجیدہ ہوگیا۔ "رانجھے نے ہیر کے عشق میں اس کے باپ کی بھینسیں چرائیں۔ مہینوال نے سوہنی کی محبت میں اس کے گھر بھر کی چاکری کی تو کیا میں ان لڑکیوں کو ہر اتوار آئس کریم نہیں کھلا سکتا، تفریح کے لیے گاڑی میں لاد کر لا نہیں سکتا؟؟ یہ تو کافی باعزت جاب ہے میری صنم — !!"

"یہ آپ کے لیے آپی —!" انجم آئس کریم لے کر قریب آگئی۔

"اور میرا حصہ —؟" آثم جلدی سے بولا۔

"وہ لایا ہی اتنی ہے —"

"اور دیکھو تو — کیسے سب نے آپس میں تقسیم کر لیں۔ ایک صرف مجھے چھوڑ دیا ہے جیسے میں سوتیلا تھا —" آثم ہنس کر بیرے سے مخاطب ہوا۔

"کیوں بھئی؟ ایک کم کیوں لائے ہو؟"

"صاب! آپ نے اتنی ہی کہی تھیں —"

"ان کو گنتے گنتے میں گنتی بھی بھول جاتا ہوں —"

"آپ ہمیں ہر وقت نظر نہ لگایا کریں بھائی جان —!" انجم نے احتجاج کیا۔

"ایک اور منگوا لیں نا —" ارم نے مشورہ دیا۔

"نہیں — رہنے دو اب —"

"آثمی! تم یہ لے لو —" صنم نے اپنے والی اسے پیش کر دی

"نہیں نہیں تم کھاؤ۔ سمجھو میں نے کھا لی —"

"اور یوں پھر مجھ سے نہیں کھائی جا رہی ہے —"

"سچی —؟" آثم جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"نہیں جھوٹ —!" صنم کا منہ سوج گیا "تمہارا ہر جذبہ سچا ہے اور میرا ہر

جذبہ جھوٹا — !"

" اوہو ہو! تم تو ناراض ہی ہوگئیں — چلو آدھی آدھی کھالیں گے "

" اور منگوالیں نا — کنجوسی کیوں کر رہے ہیں ؟ اب آدھی آدھی بانٹ کر کھائیں گے "۔ انجم ان کے قریب آتے ہوئے بولی۔

" بانٹ کر کھانے سے محبت بڑھتی ہے " آثم کی آنکھیں چمکیں۔

" پہلے کیا کم ہے — ؟"

" ہے ہی کب ؟" ارم بھی ان کے قریب آگئی اور چپ چپ کھاتے ہوئے بولی۔

" ہر وقت تو لڑتے رہتے ہیں "

صنم اور آثم دونوں ہی ہنسنے لگے —

" ہمارے ہی سامنے لڑتے ہیں ارمی! اکیلے ہوں تو ان میں بڑی صلح رہتی ہے "

" ہاں پھر رہتی ہے — نہیں کیا — ؟" آثم نے مسکراتے ہوئے اس کے سر میں دھول جمائی " بڑوں کے متعلق زیادہ باتیں نہیں بنایا کرتے "

" بہت بڑے ہیں نا " ارم چالاکی سے بولی " آپی انجم سے تین سال اور مجھ سے چار ساڑھے چار سال بڑی ہوں گی — بس — !"

" ایک سال بھی بڑا ہونے سے پورے تین سو پینسٹھ دن ہو جاتے ہیں "

آثم نے تعداد کی زیادتی سے گویا انہیں مرعوب کرنا چاہا۔

" یعنی کہ —" ارم جلدی جلدی منہ ہی منہ میں تین سو پینسٹھ کے ساتھ چار کو ضرب دینے لگی —

" اس میں ایک لیپ کا سال بھی جمع کر لینا " انجم نے اس کا مذاق اڑایا۔

" ہائے ہائے! سارا بھلا دیا " ارم نے غصیلی نگاہ سے اسے دیکھا۔

" چلو بس کرو حساب کتاب — واپس چلیں بہت دیر ہوگئی — ممی سے جھڑکیاں پڑ جائیں گی " صنم نے تو شاید ذرا سی بھی نہیں کھائی تھی۔ آثم کے ہاتھ میں اپنی والی پگھلاتے ہوئے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی — وہ اسی طرح تھی۔ آثم دیکھ کر مسکرا پڑا۔

" مجھے تمہارے جذبوں کی صداقت کا پورا یقین ہے صنم۔ ابھی یہ کھالو "

" یہ دونوں تو جھگڑتے ہی رہیں گے — اور آئس کریم بیچاری پگھل پگھل کر برباد ہو رہی ہے " انجم نے چپکے سے آکر وہ بھی جھپٹ لی۔

" آپ دونوں ہی اس قابل نہیں ہیں " وہ جلدی جلدی کھانے لگی اور آثم اور صنم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس دیئے — بڑی خوبصورت سی دونوں کی آنکھوں میں چمک تھی۔

" اگلے اتوار کو مال پہ جا کر کھائیں گے — یہاں والی کا مزہ نہیں آیا " انجم جلد جلد منہ چلاتے ہوئے بولی۔

" تم تو ہر جگہ کی آئس کریم کھا کر آخر میں یہی کہتی ہو " ارم نے بڑی ندیدی نگاہوں سے اسے دوسری کھاتے ہوئے دیکھا اور بڑے تیکھے لہجے میں بولی " تاکہ اگلے اتوار پھر کھانے کو ملے "

" میں نے تم لوگوں کو آئس کریم کھلانے کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔ میرا سارا جیب خرچ چٹ کر جاتی ہیں "

" اگلے اتوار اپنے اپنے پیسے لے کر آئیں گے۔ بس آپ ہمیں گاڑی میں لفٹ دے دیں۔ ڈیڈی کو وقت نہیں ملتا "

" واہ واہ! یہ صرف لفٹ ہے —" آثم اور انجم جھگڑتے ہوئے کار تک پہنچے۔

" اب میں آگے بیٹھوں گی۔ بھائی جان! میں آگے بیٹھوں گی " انجم چلانے لگی۔

" ہاں — تاکہ راستہ بھر مجھ سے جھگڑتی رہو۔ چلو پیچھے اپنی جگہ پہ —" آثم نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے سب سے پہلے اسے ہی اندر دھکیلا۔

اُوں اُوں۔ کتنے چالاک ہیں۔ آپی کو ساتھ بٹھانا ہوگا نا۔"

"تو اور کسے بٹھاؤں گا۔ وہی تو بچپن سے میرے پاس بیٹھتی آئی ہے۔ تم باقی سب تو ہمارے گھر آیا ہی نہیں کرتی تھیں۔ اب آئس کریم کا چسکہ لگا ہے نا تو بھائی جان ہوگیا۔ خودغرض کہیں کی۔"

صنم چپ چاپ سب کچھ سنتی رہی اور مسکراتی رہی۔

"انجم نے دو کھالی تھیں اور ہمیں صرف ایک ملی تھی۔ اب ہم مال پر جا کر کھائیں گے نا۔"

"نہیں بھئی وہاں نہیں۔" آثم صنم کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "بیرے جب کسی خوبصورت سی لڑکی کو گاڑی میں بیٹھے دیکھ لیتے ہیں تو پھر سر اندر گھسیڑ گھسیڑ کر آرڈر لیتے ہیں۔"

"پچھلی بار کتنا مزہ آیا تھا۔" انجم قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

"کیا مزہ آیا تھا؟" آثم نے گاڑی چلاتے چلاتے گردن موڑ کر انجم کو گھورا۔

"وہی۔ جو ایک بیرا آپی کے ساتھ والی کھڑکی کے بالکل اندر سر گھسیڑ کر اور آپی کے گال کے ساتھ منہ لگا کر غور سے آپی کو دیکھتے ہوئے آرڈر لے رہا تھا۔"

"پھر بھائی جان نے باہر نکل کر اسے گریبان سے پکڑ لیا تھا۔ مجھے بھی معلوم ہے۔" ارم درمیان میں ہی بول پڑی۔ "بڑا مزہ آیا تھا۔ جب چٹاخ چٹاخ اسے دو پڑی تھیں۔ معافیاں مانگنے لگ گیا تھا۔"

"اس بیچارے کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگئی تھی۔" صنم نے افسوس سے کہا۔ "اس کے مینجر نے بھی اسے نکال دیا تھا۔"

"کیا زیادتی ہوگئی تھی۔؟" آثم نے تیوری چڑھا کر صنم کو گھورا۔

"اور وہ جو اتنے قریب سے، تقریباً تمہارے رخسار کے ساتھ رخسار ٹکرا کر تمہیں دیکھ رہا تھا اور آرڈر لے رہا تھا۔ بڑی اچھی حرکت کر رہا تھا نا۔"

"ہائے! اُمّی! تم تو مجھی سے الجھنے لگے۔"

"تم نے کیوں کہا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوگئی۔ میں تو اس دن لحاظ کر گیا تھا ورنہ میرا بس چلتا تو اسے قتل کر دیتا۔" پھر آثم کا لہجہ نرم اور آواز مدھم ہوگئی۔

"تمہاری طرف کسی اور کی نگاہ اُٹھے میں برداشت نہیں کر سکتا۔ تم صرف میری ہو صنم۔!" آثم نے صنم کا ہاتھ تھام کر دبا دیا۔

اس کے رخسار کانوں کی لوؤں تک تپ اُٹھے۔ اور آثم کے ان شدید ترین جذبوں کے بوجھ سے اس کی گردن جھک سی گئی۔ "اللہ میاں! میں اس قابل تو نہ تھی۔!" وہ سوچ رہی تھی۔ آثم کے متعلق۔ اس کی محبتوں، اس کی چاہتوں کے متعلق۔! اور خدا کا لاکھوں شکر کر رہی تھی کہ اُس نے اسے اتنے خوبصورت جذبوں سے نوازا تھا۔ ایسی خوبصورت زندگی تھی۔

آثم کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ بھنچا تھا اور وہ مخمور و مدہوش سی ہوئی جا رہی تھی۔

○

ایک ایک تصویر کو بڑے دھیان، بڑی توجہ اور بے حد پیار سے وہ البم میں لگا رہی تھی۔ اس کے کاشی جی کتنے اچھے تھے۔ اپنی پہلی تنخواہ پر اس کے لیے یہ خوبصورت سا البم لے آئے تھے۔ وہ تو شاید اس کے دل کی باتیں سُن لیا کرتے تھے۔! اسے دیتے ہوئے بڑی شوخی سے آنکھیں جھپکا کر بولے تھے "اِدھر اُدھر پڑی رہنے سے تمہارے منگیتر کی تصویریں خراب ہوجائیں گی۔ البم میں لگا لو۔"

حیا سے اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا تھا اور گردن نیچے جُھک گئی تھی۔ پھر بھی وہ کتنی ہی دیر اسے چھیڑتے رہے تھے۔ ان کی یہ چھوٹی چھوٹی شرارتیں، چھوٹی چھوٹی

باتیں کتنی من بھاؤنی تھیں۔ جی چاہتا کاش جی یونہی آثم کا نام لے لے کر اسے چھیڑتے رہیں، چھیڑتے رہیں، چھیڑتے ہی رہیں اور وہ اسی طرح شرماتی لجاتی رہے۔

آثم کے ایک نام نے ہی اس کی زندگی اتنی دل چسپ، اتنی رنگین، اور اتنی سہانی بنادی ہوئی تھی تو اس کے وجود، اس کی ہستی میں کونسی کشش، کیسا سحر نہ موجود ہوگا۔۔۔ اٹھتے بیٹھتے، کام کاج کرتے اس نے نہ صرف اسے اپنے خیالوں میں ہی پایا تھا بلکہ وہ تو اس کا کچھ اس قسم کا ساتھی بن چکا تھا، اسے اس کی ایسی قربت حاصل ہو چکی تھی کہ وہ تو اب اس کے ساتھ باتیں بھی کرتی تھی۔ اس کی سُننی بھی تھی ۔۔۔ بڑے راز و نیاز ہوتے تھے دونوں میں۔۔۔!!

وہ کھانا کھاتی تو آثم ساتھ کھاتا تھا۔ عین اس کے سامنے بیٹھ کر۔۔۔ کبھی کبھی بہت پیار سے وہ اپنے ہاتھ کے ساتھ اس کے منہ میں نوالے بھی ڈالتا تھا۔ وہ شرماتے لجاتے ہوئے نوالہ لے لیتی۔ پھر وہ اسے نوالے بنا بنا کھلاتی۔۔۔ آثم بڑا شریر تھا۔۔۔ وہ نوالہ لیتے ہوئے اس کی نازک نازک انگلیوں کو ہولے سے دانتوں میں دبا لیتا۔۔۔ تکلیف کے بجائے ایک ادائے دلبری کے ساتھ وہ اوئی کر کے ہاتھ پیچھے کھینچتی تو اس کی مصنوعی تکلیف سے بھی بے کل و بیقرار ہوتے ہوئے آثم جلدی سے اپنے بڑے بڑے اور مضبوط ہاتھوں میں اس کی انگلیاں تھام کر چوم لیتا۔

پھر وہ اس کے ساتھ سیر کو بھی جایا کرتی تھی۔ ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے اُنہوں نے کلفٹن کی، ہاکس بے کی، منوڑہ کی، بندر روڈ کی، غرض ہر جگہ کی سیر کر ڈالی تھی۔ آئیس کریم، کوکا کولا، چرغہ، تکے کباب، ہر لذت اُنہوں نے مل کر حاصل کی تھی۔ اپنے سے زیادہ دوسرے کو کھلا پلا کر سکون پایا تھا۔

پھر وہ اس کے ساتھ کئی دعوتوں میں گئی تھی۔ سج بن کر، اعلیٰ سے اعلیٰ لباس اور خوبصورت زیورات پہن کر۔ وہ اگر حسین تھی تو اس کا آثم اس سے کہیں زیادہ، کہیں زیادہ وجیہہ اور بانکا سجیلا تھا۔ ہر لباس دھنک نے اسے پہنا کر اپنے تصوّر کی آنکھ سے اسے بغور دیکھا تھا۔ وہ ہر ایک میں ہی اچھا لگتا تھا۔ اتنا اچھا۔ اتنا پرکشش اور باوقار، کہ ایسا دُنیا ساری میں کسی اور کا منگیتر نہیں ہو سکتا تھا۔

چوڑے چکلے سینے والا۔ بڑی بڑی مسکراتی آنکھوں اور کشادہ پیشانی والا مردانہ بھرے بھرے ہونٹوں پر خوبصورت انداز میں ترشی ہُوئی مونچھوں والا۔۔!!

وہ اک اک تصویر کو کتنی کتنی ہی دیر دیکھ دیکھ کر البم میں لگا رہی تھی اور اسی کی سوچوں میں گم تھی۔۔۔ امی بیگم جہاں آثم کی اتنی ڈھیر ساری تصویریں اسے دے گئی تھیں وہیں دھنک کی بہت ساری اپنے ساتھ لے بھی گئی تھیں۔۔۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اسی انداز میں، اسی توجہ اور پیار سے اس نے بھی اس کی تصویریں اپنے البم میں لگائی ہوں گی۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ اس کے ذہن میں، اس کے دل میں، اس کے پہلو میں وہ بھی اسی طرح ہمیشہ موجود رہتی ہوگی۔۔۔ کہ دونوں ہی ایک دوسرے کے بچپن کے ساتھی تھے۔۔۔ بچپن کے منگیتر تھے۔۔۔ ایک جیسی چاہت، ایک جیسی طلب، ایک جیسے جذبے دونوں کے یقینی تھے۔۔۔ یقینی تھے۔۔!!

اک حجاب آلود سی مسکراہٹ اس کے انتہائی حسین لبوں پر رقصاں تھی۔

"دھنک! کہاں ہو دھنک۔۔۔؟" امی اسے آوازیں دیتے ہوئے کمرے میں آگئیں۔ "کیا کر رہی بیٹی۔۔۔؟"

"کچھ نہیں امی! کچھ بھی تو نہیں۔" اس نے ان کی آواز سُنتے ہی جلدی سے البم اور تصویروں پر چادر ڈال دی۔۔۔ امی اپنے ہی خیال میں تھیں۔ نہ اس کی گھبراہٹ کو محسوس کیا اور نہ اس کی گڑبڑاہٹ کو۔۔۔!

"میں ذرا ادھر کوثر کی امی کے پاس جا رہی ہوں۔ بھائی آئے گا تو دو روٹیاں توے پر ڈال کر گرم گرم اسے کھلا دینا۔ شہزاد نے تو آج اپنے گاؤں جانا تھا۔ چلا

گپ ہوگا —

"جی اچھا امی — !"

امی چلی گئیں — دھنک اطمینان کا سانس لے کر پھر اپنی دنیا میں، اپنے آثم کی دنیا میں گم ہوگئی —

"ارے بھئی ! یہ سب گھر والے کہاں گئے ؟" یہ تو شہزاد کی آواز تھی شاید —

دھنک چونکی — اسے تو آج گاؤں جانا تھا — اسی لیے امی بھی کوثر کے ہاں چلی گئی تھیں "ارے ! اب کیا ہو ؟" اس سے اور کچھ نہ ہوسکا تو بیٹھی بیٹھی ہی لرزنے کپکپانے لگی — وہ گھر میں اکیلی تھی اور شہزاد آگیا تھا۔

"امی ! امی مجھے بہت بھوک لگی ہے" وہ صحن میں کھڑا ہانکیں لگائے جا رہا تھا۔

کیسی مصیبت تھی — ایک تو امی کی ممتا اپنے گھر کے متعلق کچھ نہیں سوچتی تھی اور اور دوسروں کے لیے مچل مچل اٹھتی تھی — اب شہزاد کو گلے ڈال لیا ہوا تھا۔ اچھے خاصے کیا بہت امیر والدین کا بیٹا تھا مگر چونکہ ہوسٹل کا کھانا اسے پسند نہیں تھا، اس لیے امی مارے محبّت کے اسے یہیں کھلانے لگ گئی تھیں۔ یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ گھر میں اک جوان بیٹی موجود تھی — دھنک کا ذہن باغی ہوا جا رہا تھا۔

"کیا آج مجھے روزہ ہی رکھنا پڑے گا — ؟" اس کی صدا پھر ابھری۔

"امی ادھر کوثر کے ہاں گئی ہوئی ہیں" آخر لرزتی کانپتی آواز میں اندر سے ہی دھنک نے جواب دیا۔

امی گئی ہوئی ہیں تو اور کسی کو روٹی پکانا نہیں آتی — ؟ شہزاد سنجیدہ آواز میں کہہ رہا تھا۔

"آتی ہے شہزاد بھائی — !" اچھی طرح دوپٹہ وغیرہ اوڑھتے ہوئے دھنک صحن میں نکل آئی۔ "آپ کاشی جی کے کمرے میں چل کر بیٹھیں میں روٹی پکاتی ہوں"

اسے ڈر تھا کہیں امی کی طرح وہ باورچی خانے میں ہی اس کے پاس نہ آبیٹھے پیش بندی کے طور پر پہلے ہی اس نے کہہ دیا — کچھ خود بھی جھجکتی تھی، کچھ کاشف نے اکثر و بیشتر اس کے سامنے آنے جانے سے احتیاط برتنے کو کہا ہوا تھا۔

شہزاد معمول کے مطابق اس کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں جانے ہی لگا تھا کہ دھنک کی بات سن کر وہیں ٹھٹھک گیا۔ دھنک باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔ کئی لمحے وہ وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر چپ چاپ جاکر کاشف کے کمرے میں بیٹھ گیا۔

دھنک کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا — لیکن جب شہزاد کے قدموں کی چاپ کاشف کے کمرے کی طرف جاتے سنی تو اطمینان کا اک طویل سانس لیا۔

بقول کاشی جی کے — شہزاد واقعی بڑا شریف اور بڑا مخلص انسان تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اس کی تعریف کی اور جلد جلد روٹیاں پکانے لگی۔ ان کی ہر ممکن امداد بھی وہ کرتا تھا — کاشف کو نوکری اس نے دلائی — امی بیگم اور ابّا میاں آئے تو کیسے سارا سارا دن گاڑی دروازے پر کھڑی کئے حکم کا منتظر رہتا جیسے وہ اک ادنیٰ ڈرائیور تھا صرف — وہ روٹیاں پکاتے ہوئے اسی کے متعلق سوچ رہی تھی۔

"آہا ! یہ آج ہماری گڑیا رانی روٹیاں پکا رہی ہے" کاشف کی آواز پہ وہ اتنے زور سے چونکی کہ اس کے ہاتھ سے روٹی گرتے گرتے بچی۔

"جی ہاں کاشی جی !" وہ شوخی سے مسکرائی "وہ آپ کے کمرے میں ایک فاقہ زدہ جو تشریف فرما ہے"

"پھر وہی بات — تم میرے دوست کو فاقہ زدہ کہتی ہو — دیکھیں گے نا جب تمہارا آثم بغیر کچھ کھائے ہی زندگی گزار لے گا"

"ہائے ! اس کے لیے تو دن میں چوبیس بار بھی پکانا پڑے تو سو جان سے پکاؤں" دل نے کہا مگر زبان چپ رہی — صرف چہرہ گلنار سا ہوگیا۔

"ہر بات میں آپ کاشی جی . . . "

" ان کا ذکر لے بیٹھتے ہیں ـــ" کاشف نے اس کا فقرہ خود پورا کر دیا "بھئی میرا بہنوئی جو ہُوا ـــ کیسے نہ بات بات میں اس کا ذکر کروں ـــ نہیں اک سچی بات بتاؤں گڑیا ـــ! مجھے آثم بڑا عزیز ہے ـــ مجھے وہ بہت اچھا لگتا ہے ـــ حالانکہ میں آج تک اس سے ملا بھی نہیں ـــ"

وفورِ شرم سے، وفورِ مسرت سے، اس سے روٹی بھی نہیں پک رہی تھی ـ موضوع بدل دینے میں ہی اس نے عافیت سمجھی ـــ "یہ بتائیے کھانا کہاں کھائیں گے ـــ ؟"

"صاف ظاہر ہے ـــ اپنے کمرے میں ـــ البتہ امی پکار رہی ہوتیں تو یہیں کھاتے ـــ گرما گرم ـــ"

"آپ یہاں کھا لیجئے ـــ اسے اندر بھیج دیتے ہیں ـــ"

"نہیں ـــ یوں بُرا لگتا ہے ـــ"

دھنک نے جلد جلد ٹرے میں کھانا لگاتے ہُوئے شہزاد کے آنے کا سارا واقعہ سُنا دیا ـــ

" ویسے ہے تو واقعی بڑا اچھا ـــ بے حد مخلص ـــ امی کی بھی بڑی عزت کرتا ہے ـــ اک صرف یہی ہے میں جس کے خلوص پہ پُورا اعتماد کر سکتا ہُوں ـــ"

"لیجئے ـــ کھانا تیار ہے ـــ"

"چائے بھی بنا دو ـ ورنہ ابھی پھر بانگیں دینا شروع کر دے گا ـ"

کاشف ہنس کر بولا ـ پھر کچھ سوچ کر یکدم سنجیدہ ہوگیا "چائے تیار کر کے خود ہی نہ ادھر لے آنا ـــ میں آ کر لے جاؤں گا ـ" اور اک گڑیا کا معاملہ ایسا تھا کہ اعتماد ہوتے ہُوئے بھی وہ کرنے کو تیار نہ تھا ـ

"جی اچھا ـــ" دھنک نے مُسکرا کر کاشف کی طرف دیکھا ـ جیسے کہہ رہی تھی ـــ

"آپ نے ایک بار کہا ـ میں نے سُن لیا ـــ سمجھئے ہمیشہ کے لیے ذہن نشین ہوگیا ـــ کہ میں آپ کی بات ان کانوں سے نہیں، دل کے کانوں سے سُنا کرتی ہوں کاشی جی ـــ!"

جواب میں کاشف بھی مسکرا دیا اور اس کی مسکراہٹ جیسے کہہ رہی تھی "جانتا ہُوں گڑیا! تو میری ایسی ہی فرمانبردار بہن ہے ـــ لیکن پھر بھی ـــ بار بار اس لیے کہتا ہُوں ـــ کہ یہ میرا فرض ہے ـــ تو میری ذمہ داری ہے ـ تو کسی امانت میرے پاس ہے ـــ اور میں اس امانت کی پورے خلوص و دیانتداری سے حفاظت کر کے اپنی ذمہ داریوں سے بہ حسن و خوبی عہدہ برآ ہونا چاہتا ہوں میری گڑیا ـ !!"

○

گلاب کی کیاریوں کے پاس بیٹھا وہ پڑھ رہا تھا ـــ ارد گرد کتابوں اور نوٹس والی فائلوں کے ڈھیر لگے تھے ـــ ایک طرف ایش ٹرے سگریٹوں کے ننھے ننھے ٹکڑوں سے بھرا پڑا تھا ـ دوسری طرف پانچ چائے کی خالی پیالیاں اِدھر اُدھر لڑھکی ہُوئی تھیں ـــ "توبہ ـــ" کتاب پٹخ کر آثم نے ہاتھوں میں سر تھام لیا ـ جماعت سے کبھی غیر حاضر بھی نہیں ہُوا تھا ـ پورے کے پورے لیکچر لیے تھے ـ مگر کیا مجال جو دماغ میں ایک لفظ بھی موجود ہو ـــ اور ـــ امتحان سر پہ تھا ـــ

"اثمی! ذرا مجھے اتارنا ـــ" صنم کی مدھم سی آواز تھی ـ اس نے جلدی سے ہاتھوں میں سے سر نکالا ـ صنم دیوار پر سے ان کی طرف اُترنے کی کوشش کر رہی تھی مگر شاید اُترا نہیں جا رہا تھا ـ "جلدی آؤ اثمی! دبے دبے سے لہجے میں اُس نے پھر پکارا ـ

"آ گیا میرے دل کے چین! میری زندگی کی خوشی ـــ! آ گیا ـــ" اور جلدی سے جا کر اس نے اسے بازوؤں میں بھر لیا ـ

"بس! چھوڑ بھی دو اب — میرے پاؤں زمین پہ لگ گئے ہیں۔"

"چھوڑنے کے لیے تو پکڑا ہی نہیں تھا۔" وہ اسی طرح اسے اُٹھائے اُٹھائے اور چھاتی کے ساتھ لگائے لگائے وہاں تک آ گیا جہاں اس کا پڑاؤ تھا۔

"ہائے اللہ! کوئی دیکھ لے گا۔" صنم کسمسائی۔

"ایک تو تم ہر وقت "ہائے اللہ کوئی دیکھ لے گا۔ ہائے اللہ کوئی دیکھ لے گا" کہہ کہہ کر مجھے بھی سہماتی رہتی ہو۔"

"یہ سبق تمہیں نے مجھے دیا ہے۔ کسی کو بتانا نہ — کسی کے سامنے میرے پاس نہ آنا۔ تم نہیں مجھے گھبراہٹ میں ڈالتے رہتے۔" وہ شرارت سے منہ بگاڑ بگاڑ کر بولے چلی گئی۔

"تو ٹھیک ہے۔ سب کے سامنے ہی سہی۔" اسی طرح اسے بازوؤں میں لئے لئے اُس نے اپنا رُخ برآمدے کی طرف پھیر دیا۔ "اب امی بیگم کے سامنے ہی جا کر تمہیں نیچے اُتاروں گا۔"

"ہائے میں مر گئی۔ امّی! یہ غضب نہ کرنا۔ پلیز! مجھے چھوڑ دو۔ اتار دو نیچے۔"

"اب —؟" آثم نے بڑی احتیاط سے اسے نیچے اُتار دیا۔ "اب بتاؤ — اب تو میں سب کے سامنے رومان بھرے ڈائیلاگ بھی بولوں گا۔"

"بے شرم جو ہو اور عقل بھی ذرا نہیں۔" بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے صنم بولی۔

"کیسے رہتی — لقمان نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ عقل سر میں، شرم زیرِ چشم اور محبّت دل میں مقیم ہوتی ہے مگر جب تقدیر آتی ہے تو عقل رخصت ہو جاتی ہے اور عشق انسان کے پاس آتا ہے تو شرم رخصت ہو جاتی ہے — میری تقدیر تمہاری صورت میں آئی تو عقل رخصت ہو گئی اور تمہارا عشق مجھ پہ سوار ہوا تو شرم پاس سے چلی گئی — میرا تو کوئی قصور نہیں ہے صنم —!"

"اور لقمان نے آخر میں یہ بھی تو کہا تھا کہ اگر توازن برقرار رہے تو وہ انسان بن جاتا ہے۔ تم انسان نہیں بن سکتے —؟"

"نہیں بن سکتا۔" آثم نے ہنستے ہوئے کورا جواب دے دیا۔

"نہیں بنو گے تو میں وہ شادی توڑ دوں گی جس میں قریشی صاحب کے بچوں نے ہمیں ٹھیکریاں بطور رونمائی دی تھیں۔" صنم بھی ہنسے جا رہی تھی۔

یکایک آثم سنجیدہ ہو گیا۔

"ہر وقت ایسے کلمات نہ منہ سے نکالتی رہا کرو صنو —!" آثم نے بُرا مان لیا۔ "کہتے ہیں چوبیس گھڑیوں میں سے کوئی لمحہ بات پوری ہونے کا ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے ہمارا ساتھ ٹوٹے —" آثم سوچا چہرہ لیے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ "میرے بغیر تم خوش رہو گی —؟"

"کیوں —؟ کہیں جا رہے ہو —؟؟" صنم ہنستے ہوئے اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"ہاں —"

"کہاں —؟"

"تمہارے دوزخ میں —؟" آثم کا موڈ بحال ہو گیا۔ صنم اس کے پاس بیٹھی تھی۔

"اسی دوزخ میں، جسے بہشت بھی کہتے ہیں —؟؟"

"ہاں —"

"چلو دونوں ہی چلیں گے —" دونوں ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر اک زور دار قہقہہ لگا اُٹھے۔

"یہ سب کیا ہے —؟" صنم اردگرد دیکھتے ہوئے بولی۔

"امتحان کی تیاری —"

"اوہو! تو میں بھر جاؤں ۔۔۔؟" وہ جلدی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"پاگل ہوئی ہو ۔۔" آثم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی گود میں ہی کھینچ لیا۔ "تمہارے چلے جانے سے کونسا فرق پڑ جائے گا۔"

"کیا مطلب ۔۔؟" تڑپ کر اس کی آغوش سے نکلتے ہوئے صنم سامنے بیٹھ گئی۔

"پاس آجاتی ہو تو تم سے باتیں کرنے لگتا ہوں ۔۔ پاس نہیں ہوتیں تو تمہارے تصوّر میں ڈوبا رہتا ہوں ۔۔ دیکھ لو ۔ سارے لیکچر لیے ہیں۔ کسی میں بھی غیر حاضر نہیں رہا۔ مگر تمہارے عشق نے یہ حالت بنا ڈالی ہوئی ہے کہ دماغ میں کچھ بھی نہیں ہے ۔۔ صنو! تم نے تو مجھے کہیں کا نہیں رہنے دیا ۔۔ اب بتاؤ میں امتحان کیسے دوں ۔؟"

صنم سامنے بیٹھی انتہائی معصومیت سے ہنسے جا رہی تھی۔ "نہ دو ۔۔ میرے لیے تم ایسے ہی بہت بڑے، بہت اُونچے اور سب سے زیادہ لائق فائق انسان ہو ۔۔ مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا ۔"

"اور جو ابّا میاں کی خوشی ہے ۔۔؟"

"وہ سر آنکھوں پہ ۔۔ اس کے لیے جو مدد کہو گے دینے کو تیار ہوں ۔"

"ڈبونے والا ہی چلائے گا ۔۔ چہ خوب ۔۔!" آثم نے اسے کھینچ کر اپنے پہلو کے قریب کر لیا۔ "تم بس یوں میرے قریب، میرے پاس رہا کرو ۔۔ یہی میری مدد ہے ۔"

"اور تمہاری پڑھائی ۔"

"اب ہو گی انشاءاللہ ۔۔!" اس کی کمر بازو کے حلقے میں لیتے ہوئے آثم نے کتاب کھول کر سامنے رکھ لی۔ صنم چپ چاپ بیٹھی اسے تکتی رہی۔

"یہ کیا طریقہ ہے ۔ میرے پاس کس لیے بیٹھی ہو ۔۔؟" تھوڑی دیر کتاب پر نظریں جمائے رکھنے کے بعد سر اُٹھاتے ہوئے آثم نے گھور کر صنم کو دیکھا۔

"تم نے بٹھایا ۔ میں بیٹھ گئی ۔"

"میں بیٹھ گئی ۔" آثم نے اس کی نقل اُتاری۔ "ارے بھئی کوئی کام کرو ۔ میرا کچھ ہاتھ بٹاؤ ۔۔"

"کیا کروں ۔۔؟"

"ایک سگریٹ سُلگا کر میرے ہونٹوں میں دے دو ۔ دیکھتی نہیں میرے ہاتھ مصروف ہیں ۔۔" ایک اس نے اس کی کمر میں ڈالا ہوا تھا اور دوسرے کے ساتھ کتاب تھامے تھا۔

"واہ واہ! کیا نوابی ہے ۔۔؟" صنم زور سے ہنس دی۔

"مجازی خدا کا حکم مانا کرتے ہیں۔ آگے سے باتیں نہیں بنایا کرتے۔ ہنسا بھی نہیں کرتے ۔" وہ بڑے رعب سے بولا۔

"لیجیے صاحب!" صنم نے جلدی سے سگریٹ کیس اُٹھا کر سگریٹ نکالا ۔ پھر ہونٹوں ہی میں اپنی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے اک مصنوعی کپکپاہٹ کے ساتھ سگریٹ ابھی اس کی طرف بڑھا ہی رہی تھی کہ آثم اسی رعب دار آواز میں ہولے سے گرجا۔

"ایسے نہیں ۔ خود سلگا کر دو ۔"

"یہ تمہاری نظریں کتاب پر ہیں یا ۔۔۔؟"

"کتاب پہ ہوں یا تم پہ ۔۔" آثم نے اس کی بات کاٹی۔ "ایک ہی بات ہے۔ تم سگریٹ سُلگا کر دو ۔" وہ اسی طرح کتاب پہ نظریں جمائے جمائے رعب ڈالتا چلا گیا۔

صنم نے جلدی سے سگریٹ سُلگا کر اس کے ہونٹوں میں دے دیا ۔۔ "اور حکم حضور ۔۔!"

"بس ۔۔!" ایک طویل سا کش لینے کے بعد وہ مدہوش سا ہوتے ہوئے بڑبڑایا۔

" یہ موسم ۔ گلاب کے پھولوں کی مست کر دینے والی مہک ، سگریٹ اور ـــ پہلو میں میری صنم کا حسین ، شرمیلا اور معطر سا وجود ـــ اس سے بڑھ کر زندگی میں اور کوئی تمنا نہیں ـــ جی چاہتا ہے یونہی بیٹھا رہوں اور عمر تمام ہو جائے ـــ"

" یہ پڑھائی ہو رہی ہے یا رومانس بکھر رہا ہے ۔" صنم یکدم اس کے بازو سے نکل کر پرے ہٹتے ہوئے بولی ۔" میں ابھی جا کر امی بیگم کو بتاتی ہوں نا کہ ایسے پڑھائی ہو رہی ہے ـــ" وہ اٹھ کر بھاگی ۔

" صنو کی بچی ! ٹھہر جا ـــ" کتاب پھینک کر آثم اس کے پیچھے لپکا ۔

چند قدم بھاگنے کے بعد صنم کھل کھل کرتی ہوئی وہیں سبزے پر گر سی گئی ۔ اک بڑی خوبصورت ادا کے ساتھ ۔ آثم بھی آ کر اس کے قریب بیٹھ گیا ۔

" دیکھو اثمی !" صنم یکایک سنجیدہ ہو گئی تھی ۔ آثم نے حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا ۔ " ذرا توجہ اور سنجیدگی سے امتحان کی تیاری کر لو ۔"

" ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ پھر اس قدر سنگین لہجے میں نصیحت کیوں کر رہی ہو ـــ؟"

" اس لیے کہ خدانخواستہ اگر تم کامیاب نہ ہوئے تو میری اور میرے گھر والوں کی اس میں بدنامی ہے ۔"

" تمہاری ـــ؟ تمہاری کیوں ـــ؟ اور تمہارے گھر والوں کی کیوں ؟؟"

" سمجھ جاؤ خود ہی ۔ انجم ارم وغیرہ کو تقریباً ہر اتوار سیر و تفریح کے لیے لے کر جاتے ہو اور ہمیں ـــ" پھر وہ چپ ہو گئی ۔

" ہاں کہو ـــ"

" میں اب جواں ہو چکی ہوں ۔"

" مگر تم میرے بچپن کی ساتھی ہو ۔ ہم ہمیشہ اکٹھے رہے ہیں ۔"

" پھر تم کیوں ہر بات میں مجھے رازداری کی ہدایت کرتے ہو ـــ"

" اوہ ـــ !" آثم نے اک طویل سی سیٹی بجائی ـــ یہ تو مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا ـــ مگر یہ صنم ! تم نے بروقت مجھے اس حقیقت کا احساس دلا دیا ہے جو میں بھولا ہوا تھا ۔ تمہاری عزت مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے ۔"

" پھر سب باتیں بنائیں گے ۔ سیر و تفریح میں لگ کر لڑکا خراب ہو گیا ہے ۔"

" خراب ہو گیا ہے ـــ؟" آثم نے جھک کر بڑے دلربایانہ انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانکا ۔

" میرے لیے تو نہیں ـــ" آثم کی یہ نگاہیں صنم کو اتھل پتھل کئے دے رہی تھیں اس نے اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیا ۔" میں دوسروں کی بات کر رہی ہوں ۔"

" ٹھیک ہے ۔ میں انشاء اللہ تمہیں امتحان میں پاس ہو کر دکھاؤں گا ـــ لیکن ایک شرط پھر میری بھی ہے ۔"

" بغیر سنے ، بغیر جانے ہی منظور ـــ" صنم نے آثم کے دونوں ہاتھ تھام لیے ۔

" تم نہیں جانتے اثمی ! تمہاری کامیابی ہم سب کو ہی سرخرو کر دے گی ۔ پھر ـــ"

" ہاں پھر کیا ـــ؟"

" تم نے اپنے والدین کی خواہش پوری کر دی ہو گی ۔ اس لیے اپنی من چاہی چیز ان سے مانگ لینے کا تم میں حوصلہ ہو گا ، ہمت ہو گی ـــ"

" اور میرے بچپن کا ساتھی میری زندگی کا ساتھی بن جائے گا ۔"

" وہ تو اب بھی ہے ۔ سو جان سے ہے ـــ" صنم نے جھک کر آثم کے ہاتھ چوم لیے ۔" میں تو اثمی ! تمہیں ہی اپنا سب کچھ سمجھتی ہوں ۔ اپنی دنیا ، اپنا دین ، اپنی زندگی ۔"

شدت جذبات سے اس کے ہونٹ تپ رہے تھے اور آنکھوں میں خلوص و محبت کی بڑی خوبصورت سی قندیلیں روشن تھیں ۔ آثم نے اسے بازوؤں میں بھر کر سینے کے ساتھ

بھینچ لیا۔

"وہ شرط بتاؤں ـــ؟" اس کے معطر بالوں میں چہرہ گھسیڑتے ہوئے وہ ہولے سے بولا۔

"بتا دو۔" وہ اس کی چوڑی چھاتی کے ساتھ لگی بدبدائی۔

"روز کا ایک دیدار ـــ"

"میں یہیں تو ہوتی ہوں ـــ"

"اکیلے میں ـــ؟" جواب میں وہ خاموش رہی۔

"پھر میں روز تمہیں ایک ایسا پیار دوں گا ـــ" جیسے بچپن میں آثم اسے چاکلیٹ اور ٹافیوں کا لالچ دیا کرتا تھا۔

"کیسا ـــ؟"

آثم نے اسے زور سے سینے کیساتھ بھینچتے ہوئے شعلوں کی طرح دہکتے اپنے ہونٹ اس کے رخسار پر رکھ دیئے ـــ وہ تڑپ کر اس کے بازوؤں سے نکلی اور اپنے گھر کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔

جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگئی آثم بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ اک صنم کے نازک سے وجود نے اس کی زندگی کو کتنا بامعنی اور خوبصورت بنا دیا تھا۔

وہ سوچوں میں کھو گیا۔

○

زندگی کی کٹھنائیاں اس کی ہمتیں اور حوصلے کبھی نہ توڑتیں اگر وہ ایک بے حد خوبصورت بہن کا بھائی نہ ہوتا۔ بچپن میں دھنک کی پیاری پیاری صورت دیکھتا تو اس کا جی چاہتا وہ ساری دُنیا کو اپنی یہ گڑیا دکھائے ـــ سب کو بتائے کہ یہ اتنی پیاری بہن اس کی تھی۔ صرف اس کی ـــ!!

امی اسے نہلاتیں دھلاتیں ـــ خوبصورت قطع کے اجلے اجلے اور نفیس نفیس سے لباس پہناتیں تو وہ اسے انگلی سے لگا گھر سے باہر نکل جاتا۔ اس کا دل اس وقت بے پایاں خوشیوں میں ڈوب ڈوب جاتا جب راہ چلتے انجان لوگ بھی رُک کر کوئی اس کا گال تھپتھپا جاتا اور کوئی اسے پیار کر لیتا ـــ پھر کوئی اس کا نام پُوچھ کر ایک دو دعائیہ فقرے کہتا اور چل دیتا۔

ان کے سارے محلے میں بھی دھنک کی پیاری اور من موہنی صورت کا بڑا چرچا تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے والے گھروں سے اس کے لیے بُلاوے آنے لگتے ـــ تب وہ اسے ساتھ لیے کبھی اس گھر میں چلا جاتا اور کبھی اس میں ـــ پھر وہاں اس کی توتلی توتلی پیاری پیاری باتیں سُنی جاتیں ـــ اس کے سیاہ ریشمی بالوں کو سہلایا جاتا ـــ اس کی نرم نرم گلابی مائل سفید گالوں پر پیار کئے جاتے۔

سب جانتے تھے کہ وہ کاشف کی بہن تھی مگر وہ ہر ملاقات پر فخریہ پھر بتاتا کہ یہ اس کی گڑیا تھی ـــ یوں جیسے وہ اسی کا تخلیق کیا ہُوا شاہکار تھی ـــ اس طرح ہر ایک کے سامنے اس کی نمائش کر کے وہ خوش ہوتا ـــ

اور اب یہی گڑیا تھی کہ اس کا حسن اور جوانی اس کے لیے چھپانا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی ہر وقت یہی کوشش رہتی کہ کسی غیر کی نگاہ اس پر نہ پڑے ـــ کہتے ہیں جوانی گدھی پر بھی آئے تو وہ خوبصورت ہو جاتی ہے اور دھنک تو پہلے ہی چاند کا ٹکڑا تھی ـــ اس کا ہر نقش گویا کسی بت تراش نے مہینوں اور سالوں کی کاوش سے تراشا اور سجایا تھا۔ جیسے اس کی زندگی کا مقصد، اس کے فن کا حاصل، اک صرف یہی شاہکار تخلیق کرنا تھا اور بس ـــ! اس کے بعد فن ختم تھا ـــ زندگی ختم تھی ـــ اور شاہکار امر ہو گیا تھا۔

ستم بالائے ستم انہیں نقش و نگار میں جوانی نے کوئی ایسا رنگ روپ بھر دیا کہ حسن و جمال کا یہ انوکھا پیکر کاشف سے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

دفتر جاتے ہوئے دھنک کو وہ خود کالج پہنچاتا تھا۔ موٹی سی ململ کا دوپٹہ کاشف کی ہدایت کے مطابق اس نے اوڑھا ہوتا مگر پھر بھی ہر نگاہ اس پر اٹھتی، چونکتی اور پھر کچھ دیر کے لیے ٹک سی جاتی۔

اس لمحے کاشف کا جی چاہتا ساری دنیا کی آنکھیں پھوڑ دے۔ مگر آنکھیں تو وہ کسی کی نہ پھوڑ سکا البتہ اُس نے دل میں یہ فیصلہ ضرور کر لیا کہ دھنک کو اب کالج نہیں جانے دے گا۔ بے شک اس کے سسرال والوں کی خواہش یہی تھی مگر اس کی مجبوری (ان) سے زیادہ مجبور تھی۔

"امی! گڑیا کی شادی اب کر دینی چاہیئے۔" وہ باورچی خانے میں ماں کے پاس بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ دھنک پاس نہیں تھی۔ موقع دیکھ کر اُس نے بات شروع کی۔

"اب تم نوکری پہ لگے ہو۔ آہستہ آہستہ کچھ جمع جوڑ کرتی ہوں۔"

"بس پھر طے ہو گیا نا۔ کل سے گڑیا کالج نہیں جائے گی۔ گھر میں ہی رہ کر اپنی شادی کی تیاری کرے گی۔"

"لیکن بیٹے! ابھی آئم نے ایم۔ اے کا امتحان دینا ہے۔ اس کے بعد ہی شادی ہو سکے گی نا۔"

"تیاری تو ابھی سے شروع کر دینی چاہیے۔ لڑکی والوں کے ہاں تیاری کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔"

اس کی ساس چاہتی تھی کہ کم از کم بی۔ اے کر لے۔ کل کلاں کو لڑکا یہ نہ کہے کہ کم پڑھی لکھی بیوی پلے ڈال دی۔"

"کم پڑھی لکھی کیوں۔ گھر میں پڑھ لیا کرے گی۔"

"کوئی ماسٹر رکھو گے۔ خرچہ اور بڑھ جائے گا۔"

"خرچے کی تو خیر کوئی بات نہیں مگر میں اس کا ماسٹر سے پڑھنا بھی پسند نہیں کروں گا۔"

تب اس لمحے کاشف دل کی بات زبان پر لے ہی آیا۔

"امی! آپ جانتی ہیں کہ ہماری گڑیا کی شکل و صورت کیسی ہے؟"

"ہاں۔ لیکن کیوں۔؟ ہوا کیا۔؟؟"

"امی! زمانہ بہت خراب ہے۔ ہر راہ چلتا اس کی طرف دیکھ کر گزرتا ہے۔"

"لو۔" امی زور سے ہنس پڑیں۔ "کسی کے ایک صرف دیکھ لینے سے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔"

"امی۔!" وہ تقریباً چیخ سا پڑا۔ "یہ آپ نے کیسی بات کہہ دی۔؟"

"کیوں۔؟ کیا کہہ دیا۔؟ غلط کہا ہے کچھ۔ کس کس کو ٹوکو گے۔ کس کس کی آنکھیں پھوڑو گے۔"

"کسی کو ٹوک نہیں سکتا۔ کسی کی آنکھیں نہیں پھوڑ سکتا۔ گڑیا کا کالج جانا تو بند کر ہی سکتا ہوں نا۔ بس! وہ کل سے کالج نہیں جائے گی۔"

"کمال ہے۔ قصور دوسروں کا اور سزا اس بیچاری ناکردہ گناہ کو ملے۔ میں کہتی ہوں دھنک تو غلط نہیں ہے نا۔؟"

"خدا نہ کرے کہ میری گڑیا کبھی بھی غلط ہو۔"

"تو بس پھر جانے دو اسے کالج۔"

"امی! میں اس کا بھائی ہوں۔ یوں اس پر غلط سلط نگاہیں اٹھتی رہیں۔ میں نہیں برداشت کر سکتا۔"

"تو علیحدہ دفتر چلے جایا کرو۔ اس کے ساتھ نہ جایا کرو۔"

"ہاں۔ جوان، خوبصورت اور کنواری بہن کو اکیلا چھوڑ دوں۔ میرے ہوتے ہوئے

صرف نگاہیں اُٹھتی ہیں پھر زبانیں بھی چلنا شروع ہو جائیں گی۔ زمانہ بہت خراب ہے۔ پھر کوئی اس کا ہاتھ بھی تھام لے گا ــــ اور میں علیحدہ دفتر جایا کروں ــــ یہی میری عزت ہے اور یہی میری عزت ــــ"

"تو پھر جو جی چاہتا ہے کرو۔" امی طیش میں آ کر بولیں "چھڑوا دو اس کا کالج آج کل کے لڑکے چودہ چودہ، سولہ سولہ جماعتیں پڑھی ہوئی لڑکیاں مانگتے ہیں ــــ کل کو بہنوئی سے بہن کو جاہل گنوار کے طعنے دلوانا۔"

"امی!" دھنک اندر آ کر کاشف کے پاس بیٹھ گئی۔ "کاشی جی ٹھیک کہتے ہیں۔"

"کیا ٹھیک کہتا ہے ــــ؟" امی درشتی سے بولیں۔

"میں نے ساری باتیں سُن لی ہیں ــ خود میں بھی یہی کہنے والی تھی۔"

"تُو تو بھائی ہی کی حمایت میں بولے گی ــــ یہ جو بات منہ سے نکال دے وہ تیرے لیے آسمانی حکم ہو جاتا ہے۔"

"کاشی جی میرے لیے کبھی کوئی بات غلط نہیں کہتے ــ پھر میں کیسے نہ آسمانی حکم سمجھا کروں ــ"

"تو پھر رہ جا جاہل ــــ! آج دس جماعت کو کوئی پوچھتا بھی نہیں ــ"

"امی! صرف کالج جا کر پڑھنے ہی کو تعلیم نہیں کہتے ــــ گھر میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔"

"تو ہے کس خیال میں ــ؟ وہ گھر میں بھی ماسٹر بلانے کو تیار نہیں ہے۔"

"ماسٹر کی کیا ضرورت ہے ــــ کاشی جی سے پڑھوں گی ــــ کیوں کاشی جی ــــ! ایف۔ اے کی پڑھائی تو آپ کرا ہی دیں گے نا ــ؟"

"ہاں ہاں ــــ بآسانی ــ" کاشف کے چہرے پر رونق سی آ گئی ــ "جن مضامین میں میں نے بی۔ اے کیا ہے وہی تم ایف۔ اے کے رکھ لو۔"

"بس! یوں ایف۔ اے تو کر لوں پھر بعد میں بی۔ اے کا بھی انتظام ہو جائیگا۔"

"کیوں ــــ؟ پھر تمہارا کاشی کہیں چلا جائے گا۔ ارے گڑیا! تجھے زیادہ تعلیم دینے کے لیے میں خود زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کروں گا۔"

"ویری گڈ ــ!" دھنک نے خوشی کا نعرہ مارا۔ "ساری پرابلم ہی ختم ہو گئی۔"

امی نے غصّہ بھری نگاہ اس کے چمکتے دمکتے اور مسکراہٹیں بکھیرتے چہرے پر ڈالی پھر کاشف کی طرف گھور کر دیکھا۔

"میں تو کہتی ہوں تم بھی چھوڑ دو نوکری ــ اور دونوں پڑھنے پڑھانے میں ہی لگ جاؤ۔"

"میری پیاری امی جان! نوکری کے دوران بھی مزید تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے اور کسی اور کو پڑھایا جا سکتا ہے۔ آپ کو غصّہ کیوں آئے جا رہا ہے ــ؟"

امی کچھ نہ بولیں ــــ دھنک اور کاشف ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگے ــــ

"کاشف ــ!" شہزاد کی آواز تھی ــــ یکدم دونوں کے ہونٹوں سے ہنسی معدوم ہو گئی۔

"شہزاد کی آواز ہے ــ اسے یہیں بلا لو ــ گرم گرم کھانا کھا لے گا۔"

کاشف جلدی سے دھنک سے مخاطب ہوا "گڑیا! تم اندر اپنے کمرے میں جاؤ ــ"

"اب اس سے بھی پردہ شروع ہو گیا ــ" امی جل بیٹھی تھیں "اے میں کہتی ہوں کاشی! تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ گھر میں ہر وقت اس کا آنا جانا ہے۔ یہ پابندی تو بڑی مشکل ہو گی۔"

"امی! میں پردہ کب کرا رہا ہوں ــ؟" کاشف بھی قدرے تیکھا ہو گیا۔

"لیکن یہ بھی تو ضروری نہیں کہ ہم لڑکوں میں وہ بھی گھسی بیٹھی رہے۔ کھانا تو وہ کھا ہی چکی ہے۔"

”ارے بھئی کوئی ہے گھر میں ؟ دروازہ کھول دو —“ شہزاد باہر سے ہانکیں لگائے جا رہا تھا۔

”یہ دروازے کی کنڈی کس نے لگادی —؟“ امی نے پوچھا۔

”مجھی نے لگائی ہے —“

”کیوں —؟“

”بازار کے سر پہ ہے — ہر کوئی منہ اُٹھائے اندر آ داخل ہوتا ہے اور میرا جوان بہن والا گھر ہے امی —!“ کاشف جلدی سے دروازہ کھولنے کے لیے باورچی خانے سے باہر نکل گیا — اس لیے بھی کہ امی کی کوئی اور جلی کٹی نہ سُننا پڑے۔ وہ تیزی سے نکلا تھا — دروازہ کھلتے ہی شہزاد بڑبڑانے لگا ”سب کے سب ہی شاید سوئے ہُوئے تھے۔ گھنٹہ بھر سے باہر کھڑا چیخ رہا ہُوں —“

”ارے!“ اس کی بڑبڑاہٹ کا جواب دینا کوئی چنداں ضروری نہیں تھا البتہ اس کی بغل میں دبا بڑا سا بنڈل تجسّس کا باعث بن گیا ”یہ کیا اُٹھائے ہُوئے ہو —؟“

”پیچھے تو ہٹو — اندر تو آنے دو — ٹانگیں شل ہوگئی ہیں —“ کاشف کو دھکیلتا ہُوا وہ آگے بڑھ گیا ”کھانا کھا لیا —؟“

”تقریبًا کھا ہی لیا ہے —؟“

”تقریبًا کا کیا مطلب —؟

”باورچی خانے میں سے ہی اُٹھ کر آیا ہوں — اگر تم نہ آدھمکتے تو شاید چند نوالے اور لے لیتا —“

”کوئی مزیدار چیز ہوگی نا — تبھی شاید دروازہ نہیں کھول رہے تھے —“

”نہ یدیدے! میں نے سب کچھ ختم نہیں کیا —“ کاشف ہنسا —

”تو پھر تم سے جو کچھ بچ گیا ہے جا کر جلدی سے اس پر قبضہ کروں —“

”بچے ہوئے پر کیوں شہزاد بیٹے! تمہارا حصہ اس گھر میں علیحدہ ہوتا ہے —“ امی باورچی خانے سے بولیں —

”اور سب سے زیادہ بھی نا —؟“ وہ کاشف کی طرف دیکھ کر مسکرایا —

”بیٹو انسان کا حصّہ دوسروں سے زیادہ ہی ہوتا ہے —“ دونوں ہی آگے پیچھے باورچی خانے میں داخل ہوگئے —

”آؤ بیٹھ جاؤ — میں بس تو اُٹھنے ہی لگی تھی —“

”آپ نے تو شاید ابھی کھائی ہی نہیں —“ کاشف والی جگہ پر شہزاد بیٹھ گیا تھا — کاشف دھنک والی جگہ پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”کھانے لگی تھی — مگر اب شہزاد کو کھلا کر پھر خود کھاؤں گی —“ پھر وہ کاشف سے مخاطب ہوئیں ”تم پھر آ بیٹھے ہو — ابھی کھانا کھانا ہے؟“

”نہیں تو — ایسے ہی شہزاد کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے آ بیٹھا ہوں۔ کیوں شہزاد!“ اس نے اس کی طرف رُخ موڑا ”امتحان کی تیاری کیسی ہو رہی ہے —؟“

”انشاء اللہ کامیاب ہو جاؤں گا —“

”خدا کرے — میں بھی پرائیویٹ ایم۔ اے کی تیاری شروع کرنے والا ہوں —“

”جن جن کتابوں کی ضرورت ہو مجھے بتانا — کچھ میرے پاس ہوں گی۔ کونسا مضمون رکھو گے —؟“

”انگریزی —“

”میرے پاس بھی وہی ہیں — لیکن — ذرا مشکل ہوگا —“

”مرد کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا —“

”ویری گڈ —“ ساتھ ساتھ وہ جلد جلد کھانا بھی کھائے جا رہا تھا — انگریزی

کے کورس کی میرے پاس کافی کتابیں ہیں — یاد ہے نا میں نے بھی پہلے ایم اے انگریزی میں ہی داخلہ لیا تھا۔"

"ہاں — ویسے اب کیا خیال ہے۔ قانون اس سے بہتر رہے گا — ؟"

"مجھے تو اچھا ہی لگ گیا ہے۔"

"پاس کر کے نوکری کرو گے یا . . . "

"اس کی بات پوری ہونے سے پہلے شہزاد نے جواب دے دیا "سو فیصد وکالت — ابا کی یہی خواہش ہے۔"

"ہمارے ابا کی جانے کیا خواہش تھی — فی الحال تو صرف اک کلرک ہی بن کر رہ گیا ہوں۔"

"ایم۔ اے کر لو گے تو لیکچرر شپ مل جائے گی — بس بھئی — پیٹ بھر گیا۔" شہزاد کھانا ختم کرنے کا اعلان کرتے ہوئے وہ بنڈل کھولنے لگا۔

"آخر اس میں ہے کیا — ؟" کاشف نے بے تابی سے پوچھا۔

"بس دیکھتے رہو۔" شہزاد مسکرایا — پھر — بنڈل کھل گیا۔

"یہ میری امی کے لیے سوٹ اور دوپٹہ — کیسا رنگ ہے امی — ؟"

"لیکن —" امی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کاشف قدرے بے چین سا ہو کر بول پڑا "امی کے پاس تو کافی کپڑے ہیں۔"

"تم اپنی چونچ بند رکھو — یہ میری بھی ماں ہے۔" شہزاد نے گھور کر اسے دیکھا

"اور یہ کیا ہے — ؟" کاشف نے باقی کپڑے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ ساڑھی ہے۔"

"تم پہنو گے — ؟" کاشف زور سے ہنس دیا "ویسے تم پر جچے گی خوب۔ گورا رنگ ہے اور زنانہ سا حسن۔"

"زنانے ہو گئے تم — ناپو ذرا قد — تم سے کم نہیں ہو گا۔"

"قد کی تو بات ہی نہیں — یہ دیکھو مردوں والی مونچھیں۔" کاشف نے اپنی خوبصورت سی مونچھوں کو تاؤ دیا "اور تمہارا چہرہ — صفاچٹ میدان۔ بالکل عورتوں جیسا — نہ داڑھی نہ مونچھ — پہن لو ساڑھی — پہن لو۔"

وہ مذاق کئے گیا "پھر میں اور تم کلفٹن سیر کرنے جائیں گے — بڑا ارمان تھا کسی جوان عورت کے ساتھ سیر و تفریح پہ جانے کا۔"

"امی! سن رہی ہیں نا کیا بک رہا ہے — ؟ اب اس کی شادی کر ڈالیے۔"

"پہلے بہن کو تو رخصت کرے۔ پھر بے شک اپنی کے خواب دیکھنے لگے۔"

بہن کی بات پر کاشف خاموش سا ہو گیا۔

"امی یہ ساڑھی دھنک کے لیے ہے۔" شہزاد نے وہ بے حد قیمتی اور خوبصورت سی ساڑھی امی کی طرف بڑھائی۔

"ہائے بیٹے! کیوں اتنا تکلف کیا — ؟" امی کی نگاہیں ساڑھی کی چمک دمک میں الجھی تھیں۔

"نہیں نہیں۔" کاشف جلدی سے بول پڑا۔ وہ ساڑھیاں نہیں پہنتی اور پھر پہلے ہی میں تمہارا بہت مقروض ہوں — اتنی قیمتی ساڑھی — !"

"ارے بھئی! یہ تو تحفہ ہے — تم پہلے قرضوں کا کیوں حساب کرنے لگے۔"

"نہیں نہیں — اتنا قیمتی تحفہ — ! یوں بھی ہمارے ہاں کنواری لڑکیاں ساڑھیاں نہیں پہنتیں۔" کاشف کسی بھی طرح وہ ساڑھی لینا نہیں چاہتا تھا۔

"دیکھئے امی! اسے سمجھائیے — میں اتنے شوق سے لایا ہوں اور یہ کیسے انکار کر کے میرا دل توڑے جا رہا ہے۔"

"مگر امی! میں اک غریب کلرک ہوں۔ اپنی بہن کو اتنا قیمتی لباس نہیں پہنا سکتا۔

کیا لوگوں سے اپنی طرف انگلیاں اُٹھوانا ہیں۔!"

"یہ کیسی جاہلوں جیسی باتیں کئے جا رہے ہو۔ کیا میرا اس گھر پہ کوئی حق نہیں؟"

"کیوں نہیں بیٹا! بہت حق ہے۔" امی نے کاشف کی خواہش اور مرضی سمجھے بغیر وہ ساڑھی شہزاد کے ہاتھوں سے لے لی۔

"اب تم لے ہی آئے ہو تو تمہارا دل تو نہیں توڑ نا۔ دھنک کے جہیز میں رکھ لیں گے۔" امی نے فیصلہ سُنا دیا تو کاشف عجیب سی نگاہوں سے ماں کو دیکھتے ہوئے باورچی خانے سے باہر نکل گیا۔ شہزاد امی کے ساتھ جانے کیا باتیں کر رہا تھا۔ کاشف کا موڈ اتنا بگڑا تھا کہ صحن کی کھلی ہوا میں دو تین چکر لگانے کے باوجود درست نہیں ہوا۔

اور۔ اس کا بگڑا موڈ اکثر اپنی گڑیا کے ساتھ گپ شپ لڑا کر ہی درست ہوا کرتا تھا۔ جانے کیا کیا کچھ سوچتے ہوئے وہ اس کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس کے کمرے سے ابھی پرے ہی تھا کہ اسے اس کی باتیں کرنے کی آواز سُنائی دی۔

بے اختیار اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ بہت سارا موڈ تو یہیں درست ہو گیا۔ اکیلے میں در و دیوار سے اور اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت اس کی ابھی تک موجود تھی۔ مسکراتے ہوئے اُس نے ذرا سا پردہ سرکا کر اندر جھانکا۔ "مجھے بڑے عرصہ سے ساڑھی پہننے کا شوق تھا۔ یہ دیکھو آج میں نے پہنی ہے۔ سچی سچی بتانا۔ تمہیں میں ساڑھی میں کیسی لگی ہوں۔ تم تو ہر لباس، ہر انداز میں مجھے اچھے لگتے ہو۔ بے حد اچھے۔"

وہ ایک بوسیدہ سی ساڑھی پہنے کرسی پر بیٹھی تھی اور آثم کی تصویروں والا البم اس کے گھٹنوں پہ کھلا پڑا تھا۔ پھر وہ جھکی۔ اور بہت نیچے جھک گئی۔ شاید اُس نے آثم کی تصویر کو پیار کیا تھا۔ کاشف جلدی سے کھنکارا۔ اور پھر اندر چلا گیا۔

"کون۔؟" وہ چونکی۔ "ارے! کاشی جی۔!" کاشف کو بالکل سامنے کھڑا دیکھا تو گھبراہٹ میں اسے اور کچھ نہ سوجھا۔ یکایک البم بند کر کے اُس نے سامنے پلنگ پر پھینک دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں تو بس یونہی ذرا۔"

"کیا یونہی ذرا۔؟" کاشف ہنسنے لگا۔

"امی نے اپنی اک پرانی ساڑھی مجھے دے دی ہوئی تھی اور میں پہن کر دیکھ رہی تھی کہ مجھے ساڑھی پہننا آتی بھی ہے یا نہیں۔؟" پھر وہ ذرا سی آواز دبا کر بڑبڑائی۔ "ادھر شہزاد آپ کے پاس آ گیا تھا پھر میں بھلا اکیلی اور کرتی بھی کیا۔؟"

کاشف نے اس کے سراپا کو نگاہ بھر کر دیکھا۔ ساڑھی اس کے متناسب جسم پہ بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ اتنی پھٹی پرانی تھی مگر گڑیا کے جسم اور چہرے کے حسن نے اسے بھی خوبصورت بنا دیا تھا۔ کاشف کی نگاہیں جھک گئیں۔ پھر اسے یکایک کچھ خیال آیا۔ "تمہیں ساڑھی پہننے کا بہت شوق ہے۔؟" کاشف نے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ چہرے پر سے ہٹائے۔

"ہاں۔" دھنک نے بلا جھجک سچ بول دیا۔

شہزاد تمہارے لیے بڑی ہی خوبصورت ساڑھی لایا ہے۔ وہ پہننا۔ بہت قیمتی ہے۔ یقیناً سات آٹھ سو کی ہو گی۔" امی بھی تو اس کی چمک دمک اور بڑھیا پن پہ ریجھ گئی تھیں۔ کاشف نے اسی لحاظ سے دھنک سے بات کی۔

مگر۔ کاشف نے دیکھا۔ اس کی بات سُن کر گڑیا کا چہرہ یکایک سُرخ ہو اٹھا۔ چند لمحے وہ کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر "کاشی جی! آپ نے مجھے کمینی سمجھا ہے"

"کیا مطلب۔؟"

"میں شہزاد کی لائی ہوئی ساڑھی نہیں پہنوں گی۔ خواہ وہ دس ہزار کی ہو۔"

اُس نے بھیگی بھیگی آنکھوں اور جھپاتی پلکوں سے کاشف کو دیکھا پھر اس کے سینے کے ساتھ سر ٹیک دیا۔

"کاشی جی! آپ اپنی تنخواہ کے پیسوں سے سوتی بھی ساڑھی لا دیں گے نا تو وہ بڑے شوق اور خوشی سے پہنوں گی۔ میرے لیے وہی ہزار دو ہزار کی ہوگی۔"

امی کی ساڑھی لے لینے والی حرکت نے اسے خواہ مخواہ ہی گڑیا کی طرف سے بھی بدگمان اور مشکوک کر دیا تھا۔ ورنہ اس کی گڑیا کے پاس تو اپنی شکل ہی کی طرح خوبصورت دل بھی تھا۔ وہ اپنے بھائی کی غریبی کو شہزاد کی امارت سے زیادہ امیر سمجھتی تھی۔

کاشف کا سینہ ڈھیروں ڈھیر خوشیوں سے معمور ہو اُٹھا۔ لیکن ۔۔ گڑیا اس کے سینے کے ساتھ لگی رو رہی تھی۔ کیونکہ ۔۔ وہ اب اتنی سمجھدار ہو چکی تھی کہ بھائی کی نگاہ بھی پہچان جاتی تھی۔ کاشی جی کو کیا ابھی تک یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ان کی گڑیا کس قسم کی طبیعت کی مالک تھی۔ وہ یکایک بڑی دکھی ہوگئی۔

"ارے! یہ کیا پاگل پن ہے ۔۔ ؟" کاشف مسکراتے ہوئے معذرتی انداز میں بولا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا۔" وہ سینے کے ساتھ لگے اس کے سر کو سہلانے لگا۔ پھر اسے ہنسانے کے لیے شوخی بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

"اور اگر تیرا آثم تجھے بڑی پیاری سی اک ساڑھی بھیج دے ۔۔ تو ؟ کیا وہ بھی نہیں پہنوگی ۔۔ ؟"

یکایک اس کا ہلتا وجود ساکت ہو گیا۔

"بتا بھی نا ۔ ؟" کاشف کے دوبارہ پوچھنے پر وہ اس کے سینے کے ساتھ لگی لگی ہی کسمسائی۔

"کاشی جی! ایسی باتیں تو نہ پوچھا کریں جن کا جواب آپ کو معلوم ہو۔" مگر اب

اس کے لہجے میں صرف شرمیلاپن تھا۔

"اچھا۔ یعنی کہ نہیں پہنوگی ۔ ؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" اس نے بڑے پیارے انداز میں مسکرا کر کاشف کی طرف دیکھا۔

"پگلی ۔۔!" وہ بھی مسکرا دیا۔ "لاکھوں کروڑوں میں، اربوں میں کھربوں میں، میری ایک بہنا ہے۔" وہ بلند آواز میں گنگناتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

O

وہ اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ آج وہ گھر میں بالکل اکیلا تھا امی بیگم اور ابا میاں "تایا ابا" کی بیٹی کی شادی پر پشاور گئے ہوئے تھے۔ مدعو تو وہ بھی تھا مگر امتحان کی وجہ سے ابا میاں نے آج کل اس پر سخت پابندی لگائی ہوئی تھی۔ گھر سے ہی باہر کہیں آنے جانے نہ دیتے تھے۔ تو پورے تین دن شادی میں کیسے ضائع کرا لیتے۔

کلا لو کو بڑی سخت تاکید تھی کہ وقت پہ اسے کھانا اور چائے وغیرہ مہیا کرتی رہے تاکہ اس کی توجہ صرف اور صرف پڑھائی میں رہے۔

یوں تو وہ اپنے حساب سے اس کے لیے سب انتظامات کر کے گئے تھے۔ مگر یہ جو اس کا دھیان تھا نا، نہ ابا میاں کی نصیحتوں اور پابندیوں کو خاطر میں لاتا اور نہ کسی اور مصلحت کے متعلق اسے سوچنے دیتا۔ بس ہر وقت اس خوب صورت اور معصوم سی ساحرہ میں لگا رہتا تھا جس نے کوئی ایسا سحر اس پر پھونک دیا ہوا تھا کہ وہ کسی اور کام کا رہ ہی نہیں گیا تھا۔

اب بھی کتابیں سامنے تھیں اور وہ سوچ رہا تھا اس کے متعلق۔ سامنے ہر سطر پہ گویا اسی کا نام کندہ تھا۔ اور اسی کی شبیہہ ہر صفحہ پہ تھرک رہی تھی۔

یکایک دروازے پر دستک ہوئی۔

وہ چونکا۔ چائے کا وقت تھا۔ گلابو شاید اسی لیے آئی تھی۔

"آجاؤ گلابو! تو مجھے بھی اس وقت چائے کی بڑی طلب ہو رہی ہے۔"

آہستہ سے دروازہ کھلا۔۔۔ اور پھر۔۔۔ اس کی آنکھیں جیسے پتھرا کر رہ گئیں

"کیسی لگ رہی ہوں۔۔۔؟" صنم سفید ستاروں والی ساڑھی پہنے اس کے سامنے کھڑی فیشن شو کی طرح ساڑھی کا پلّو لہرا لہرا کر، گھوم گھوم کر اسے دکھا رہی تھی۔ "بتاتے نہیں۔۔۔؟ گونگے ہو گئے ہو کیا۔۔۔؟"

"ہو ہی گیا ہوں شاید"

نازک سی صنم کا کندنی رنگ سفید ساڑھی میں دمک رہا تھا۔ اس کی لمبی سی گردن میں سفید موتیوں کی وہی خوب صورت سی مالا تھی اور پتلی سی کمر ساڑھی کی بندش میں اور بھی پتلی دکھائی دے رہی تھی۔ اونچی سی ایڑی والے سفید سینڈلوں نے اس کا قد پہلے کی نسبت زیادہ لمبا کر دیا تھا۔

"ساڑھی پہچانی نہیں امی۔۔۔؟ وہی ہے جو تم نے پچھلی عید پر آتی بیگم سے چوری مجھے دی تھی اور پھر اپنی ممی کے آگے بھی میں نے جھوٹ بولا تھا کہ میری سہیلی نے تحفہ دیا ہے۔ آج پہلی بار پہنی ہے۔"

وہ بولے جا رہی تھی، مگر آثم یوں گم سم تھا جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ یا پھر گونگا بہرہ ہو چکا تھا۔ نہ اس کی سن رہا تھا، اور نہ بول سکتا تھا۔

"نہ بولو۔ میں تو جا رہی ہوں۔"

"کہاں۔۔۔؟" اس کی بے ہوشی کو ہوش آ گیا۔ اپنی جگہ پر سے اٹھتے ہوئے آثم نے بے قراری سے پوچھا، "کہاں جا رہی ہو۔۔۔؟"

"میری سہیلی کی سالگرہ ہے نا۔"

"میں تو ایسی سج دھج میں تمہیں بالکل کسی سہیلی کے ہاں نہ جانے دوں گا۔"

صنم کے قریب جا کر عادت کے مطابق اس کی کمر میں بازو ڈالتے ہوئے بولا

"کیوں۔۔۔؟ کیوں نہ جانے دو۔۔۔؟"

"تمہاری اس سہیلی کا بھائی بھی ہو گا۔۔۔؟"

"ایک نہیں، تین تین۔"

"کس عمر کے۔۔۔؟"

"دو اس سے بڑے ہیں ایک چھوٹا۔ عمروں کا میں نے کبھی نہیں پوچھا"

صنم معنی خیز شوخی سے مسکرائی۔ "تم نے ضرورت ہی نہیں رہنے دی۔"

"پھر تو میں تمہیں بالکل وہاں نہیں جانے دوں گا۔"

"کیوں بھلا۔"

"میری صنم کو اس روپ میں کوئی دیکھے۔ نہ جی نہ۔۔۔ اتنا فراخ حوصلہ نہیں ہوں۔ تمہاری محبت نے مجھے بڑا حاسد بنا دیا ہے۔"

"امی! میرا جانا ضروری ہے۔"

"تو یہ ساڑھی اس لیے میں نے تمہیں دی تھی کہ پہن کر خوب صورت لگو۔ اور میرے بجائے دوسروں کو دکھاتی پھرو۔"

"پھر اور کس لیے لا کر دی تھی۔ میری اتنی عزیز سہیلی کی سالگرہ ہے۔ اس سے اچھا اور کون سا موقع ہو گا۔"

"سب سے اچھا موقع یہ ہے کہ یہاں میرے پاس میری آنکھوں کے سامنے بیٹھو۔ بیٹھی رہو۔ بیٹھی رہو اور میں تمہیں دیکھتا رہوں۔ دیکھتا ہی رہوں۔"

اس نے صنم کو دونوں بازوؤں سے پکڑتے ہوئے صوفے پر بٹھا دیا۔

"نہیں امی مجھے۔ ۔ ۔"

"نہیں وہیں کچھ نہیں۔۔۔ بس! میں نے کہہ دیا ہے کہ تم آج پورے ٹائم گھر میرے پاس بیٹھو گی۔"

"آخر کس جرم کی سزا میں۔۔۔؟"

"میرے پاس بیٹھنا کسی جرم کی سزا ہے۔۔۔؟" آثم نے گھور کر اسے دیکھا۔

"یعنی کہ اپنے مجازی خدا کے پاس بیٹھنے کو تم سزا کہہ رہی ہو۔؟ توبہ، توبہ"

"لیکن اُمّی، وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔"

"مجھ سے زیادہ تمہیں اس کے انتظار کا خیال ہے؟" اُتم اس کے پاس نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔ صنم کے دونوں ہاتھوں کو اپنے بڑے بڑے ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے وہ بولا "میں صبح سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ نہ پوچھو کس بے تابی اور بے قراری سے۔ ابّا میاں اور امّی بیگم بھی نہیں ہیں۔ کیا تمہیں اک لمحے کو بھی میرا خیال نہیں آیا تھا کہ میں اکیلا ہوں؟"

"میں کالج گئی ہوئی تھی۔"

"اب تو شام ہونے والی ہے۔ کالج سے تو تم سہ پہر کو آجایا کرتی ہو؟"

"امّی ڈھیروں تو میرے لیے کام رکھے پڑی ہیں، وہی نمٹاتے نمٹاتے اتنا وقت ہو گیا۔ پھر سالگرہ پر جانا تھا۔ جلد جلد تیار ہوئی۔ حالانکہ دیر کافی ہو چکی تھی۔ لیکن پھر بھی دیکھ لو، یہ ساڑھی دکھانا تو محض ایک بہانہ تھا۔ صرف تمہیں ایک نظر دیکھنے کو گزرتے گزرتے اندر چلی آئی۔" صنم نے اُتم کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"یہ کبھی نہ سوچنا اُتمی! کہ اک لمحے کے لیے بھی کبھی تم یا تمہارا خیال مجھ سے علیحدہ ہوتا ہو گا۔" صنم بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

سارا دن کمرے میں بند رہا تھا۔ الجھے بکھرے بال تھے۔ روشن اور ذہین آنکھوں میں گلابی گلابی ڈورے تھے۔ اونچی خوب صورت سی اس کی ناک شدتِ جذبات سے سرخ ہو رہی تھی۔ بہت خوب صورت مردانہ بھرے بھرے ہونٹوں کے اوپر بڑے پیار سے انداز میں ترشی ہوئی مونچھیں تھیں۔ اور وہ لب نیم وا کیے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس کی پوری کی پوری ہستی اپنے اندر کچھ ایسی عجیب سی کشش اور وجاہت لیے تھی کہ وہ تکے ہی گئی۔ یہ اس کا اپنا اُتمی تھا۔ صرف اس کا اُتمی ــــ اس کے بچپن کا ساتھی۔ اسے چاہنے والا۔ اسے ٹوٹ کر محبت کرنے والا۔ عجیب سا تفاخر

کا احساس اس کے ذہن میں در آیا۔ جس طرح خود وجیہہ اور بانکا سجیلا تھا۔ اسی طرح اس کی محبت تھی۔ پر جوش اور پر خلوص ــــ اور وہ۔ اس کی ہستی کی مالک تھی اور محبتوں اور چاہتوں کا مرکز۔ اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتے ہوئے وہ انتہائی عقیدت سے جھکی اور پھر اسے بھی معلوم نہیں ہوا کہ کیا ہو گیا۔ اس نے جھک کر بڑے والہانہ انداز میں اس محبوب ترین ہستی کی پیشانی اور رخسار چوم لیے۔

اُتم چونکا۔ صنم کی اس بے ساختہ حرکت میں جذبات کی شدت کے ساتھ ساتھ خلوص و اعتماد کا بھرپور اظہار تھا اور اس کے اتھاہ پیار کی خوب صورت سی صداقت۔ اُتمی لمحے وہ اس کی لذت میں ہی ڈوبا رہا۔ پھر ــــ ابھرا ــــ تو اس نے جنونی انداز میں اسے بازوؤں میں بھر کر ڈھیروں پیار کر ڈالے۔

"صنم۔ ! تو بھی مجھے اتنا چاہتی ہے۔ اتنا ہی، جتنا میں تمہیں ــــ ؟ نہیں کہہ دو اس سے بھی زیادہ ــــ بہت زیادہ ــــ"

اب وہ اس کا چہرہ کسی مقدّس کتاب کی طرح ہاتھوں میں لیے۔ جیسے اسے پڑھ رہا تھا۔ "وعدہ کرو۔ میری زندگی کے آخری لمحوں تک تم مجھے یوں ہی چاہتی رہو گی، اسی طرح پیار کرتی رہو گی۔"

"اُتمی! وعدہ تو وہاں کرایا جاتا ہے جہاں اعتماد نہ ہو، جہاں بے یقینی ہو ــــ"

صنم کے چہرے پر بڑے خوب صورت سے رنگ بکھرے تھے۔

"لیکن میری طرف سے تمہیں ایسی کوئی بے اعتمادی نہیں ہونی چاہیے اس لیے اُتمی! کہ میں نے شعور کی آنکھ کھولنے کے بعد تمہیں ہی دیکھا ہے، تمہیں ہی پایا ہے۔ اور دعا کرتی ہوں کہ میری زندگی کا انجام بھی تمہاری ہی باہوں میں ہو۔"

"نہیں، نہیں۔ یہ میرے لیے بددعا ہے۔ صنم! تمہارے بغیر میں زندگی کے ایک دن کا بھی تصوّر نہیں کر سکتا۔ دعا کیا کرو کہ ہماری زندگی کا انجام اکٹھے ہی ہو۔ ہم میں جدائی کبھی نہ آئے۔"

اسی لمحے باہر قدموں کی چاپ ہوئی۔ دونوں جیسے ہوش میں آ گئے۔

"گلابو ہے شاید۔"

"ہائے میں کہاں جاؤں۔؟" سنم کا رنگ فق ہو گیا۔

"سہیلی کی سالگرہ پہ جاؤ۔" آثم نے بڑے پیار سے' بڑے دُلار سے طنز کیا۔

"نہیں نہیں۔ میں کہیں نہیں جا رہی۔"

آثم زور سے ہنسا۔

"مگر اثمی! مجھے یہاں موجود دیکھ کر گلابو کیا کہے گی؟"

"کہے گی دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔"

"ہائے نہیں۔"

"نہیں کرتیں؟"

"تمہیں شرارت سوجھ رہی ہے اور میری۔۔۔" دروازے پر دستک ہوئی۔

"گھبراؤ نہیں۔ گلابو اپنی یار دوست ہے۔"

آثم سنجیدگی سے بولا۔ پھر اک خوب صورت سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ "اس نے تمہیں اور مجھے سینکڑوں بار اکٹھے دیکھا ہے' اور۔ اور۔"

"اور کیا۔؟ جلدی بتاؤ نا۔"

دروازے پر پھر دستک ہو رہی تھی۔

"اور اس دن جب تمہاری گود میں سر رکھے میں لیٹا ہوا تھا اور تم جھکی ہوئی۔۔"

"اوہ بس کرو اثمی!" سنم نے سرخ ہوتے ہوئے ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

"اب ذرا اپنا حلیہ درست کر لو نا۔ میں اسے اندر بلانے لگا ہوں۔"

آثم ایک۔۔ کر اپنی پھیلی کتابوں کے درمیان بیٹھتے ہوئے بولا۔

"آ جاؤ گلابو چائے لائی ہو۔؟"

"جی چھوٹے صاحب۔"

ایک پیالی زیادہ لانا۔ وہ ابھی اندر نہیں آئی تھی۔ آثم نے وہیں اسے ہدایت کی۔

"کیوں جی۔؟ کوئی مہمان آیا ہے؟"

"ہاں۔ اک خاص مہمان۔"

"تو پھر چھوٹے صاحب! ساتھ بھی کچھ ہونا چاہیئے۔"

"ہاں ضرور۔ گھر میں اس وقت جو بھی اچھی اچھی چیزیں موجود ہوں۔ وہ سب کی سب لے آؤ۔"

"اچھا چھوٹے صاحب! ابھی لے کر آئی۔" وہ وہیں سے واپس چلی گئی۔

"یہ کیا کیا اثمی۔؟ جھوٹ کیوں بولا؟"

"جھوٹ کب بولا۔ تم آئی نہیں ہوئیں۔"

"میں کوئی خاص مہمان ہوں۔؟"

"مہمان نہ سہی۔ خاص تو ضرور ہو۔ ارے ہاں مہمان بھی ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"ایسی خوب صورت ساڑھی پہن کر اور ایسی خوب صورت سج دھج کے ساتھ تم مجھ سے ملنے آئی ہو۔ ارے بھئی! اب بیٹھ بھی جاؤ نا' یا تھانیداروں کی طرح سر پر ہی کھڑی رہو گی؟"

"میں چاہتی تھی گلابو کے آنے سے پہلے۔"

"چلی جاؤں" آثم نے اس کا فقرہ مکمل کر دیا۔ "لیکن آمدن بہ ارادت' رفتن بہ اجازت۔ میری اجازت کے بغیر نہیں جا سکتی ہو۔ اب تو جنابہ صنم صاحبہ تم تین چار دن یہیں رہو گی۔"

"کیا مطلب؟"

"امی بیگم اور ابا میاں جب تک انہیں جانتے تم مجھے اکیلا نہیں چھوڑو گی"

"ہائے! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ایسے ہی جیسے۔۔ یاد ہو گا تمہیں۔ چھوٹی سی تھیں تم۔ تمہارے ممی اور ڈیڈی کے کوئی قریبی عزیز رحلت فرما گئے تھے۔ دونوں کا ہی جانا ضروری تھا اور بچوں کا غیر ضروری۔ پھر وہ تمہیں ہمارے ہاں چھوڑ گئی تھیں۔"

"بچوں کا غیر ضروری نہیں تھا۔ انجم اور ارم تو گئی تھیں۔ بس صرف میں نے ہی غل غپاڑہ مچا دیا تھا کہ ممانی کے ہاں نہیں جاؤں گی۔ عین ان کے جانے کے وقت میں نے ضد کر دی تھی۔" پھر وہ ہولے سے مسکرائی۔

"دراصل اشی! آج تمہیں بتا رہی ہوں۔ میں امّی بیگم اور ابا میاں کی وجہ سے نہیں جانا چاہتی تھی۔ ان سے تین دن کی بھی جدائی میری برداشت سے باہر تھی۔"

"تو گویا بچپن ہی سے تمہیں اپنی ساس اور سسر سے اتنا پیار ہے، خدا کرے تاحیات اسی طرح رہے۔"

"تم اپنی بات تو پوری کرو۔" صنم شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"یوں پھر تمہاری ممی تمہیں ہمارے ہاں چھوڑ گئی تھیں۔ اس وقت تم چھوٹی تھیں اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکتی تھیں اور اب۔ سمجھ گئی ہو نا۔"

"کیا سمجھ گئی ہوں؟"

اب تم ایک مکمل عورت ہو۔ گھر بار سنبھال سکتی ہو۔ اور میں مرد۔ مرد بھی اک قسم کا بچہ ہی ہوتا ہے۔ مجھے سنبھالنا بھی تمہارا فرض ہے۔ کیونکہ میں تمہارا مرد ہوں۔"

"ہائے۔ ہائے۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔؟" وہ اک پیاری سی ادا کے ساتھ شرمادی۔

"ہائے۔ ہائے! کیسی باتیں کرتے ہو۔؟" آثم نے بڑے پیار سے، اس کی اس من موہنی ادا کی نقل اتاری۔ "سچی باتیں کرتا ہوں۔ اور اب بیٹھ بھی جاؤ نا۔"

"کہاں بیٹھوں۔ یہ قالین پر تو ساری کتابیں بکھری ہیں۔"

"میری گود جو خالی ہے میری جان! تشریف رکھیے۔"

"توبہ، توبہ! اشی، تمہیں تو شرم ذرا سی بھی چھو کر نہیں گئی۔"

"وہی لقمان والی بات پھر سنا دوں گا۔"

"اور میں بھی اس کا آخری حصہ سنا دوں گی۔" کتابیں اکٹھی کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے صنم نے اپنے لیے جگہ بنالی۔

"اور وہ خالی صوفہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔؟"

"تم نیچے بیٹھے ہو۔ میں اوپر کیسے بیٹھ جاتی؟"

"اوہ! ایسا مقام مجھے دیتی ہو۔؟"

"یہ تو دل کے معاملے ہیں، جسے جس قابل سمجھے وہی مقام دے دیتا ہے۔"

"اتنی خوب صورت بات کی ہے تم نے میری صنو! ابھی ایک آدھ منٹ تک گلابو کے آنے کا احتمال نہ ہوتا۔ تو۔" پھر وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا، مگر نگاہیں پروانہ وار صنم کی صورت پر سے نثار ہوئی جا رہی تھیں۔

"تو کیا۔؟" صنم نے بے تابی سے پوچھا۔

"تمہارے یہ ہونٹ چوم لیتا جنھوں نے اتنی پیاری بات کی ہے۔"

"ہائے اللہ۔" صنم نے یکایک دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

"اشی! اگر ایسی باتیں کرو گے تو میں اٹھ کر چلی جاؤں گی۔"

"نہیں جان! اب ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔" آثم نے اس کے آگے جھک کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "معاف کر دو میری منی سی دوست۔!"

کھوں، کھوں، کھوں۔ کھانسی کی بے ربط سی آواز پر دونوں ہی چونکے۔ آثم نے باندھے ہوئے ہاتھ جلدی سے کھول دیے اور سفید لباس والی دیوی وینس نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔ گلابو جانے کب سے چائے لے کر آئی تھی۔ اور کھڑی دونوں کو اس عالم میں دیکھ دیکھ کر بڑے انداز سے مسکرا رہی تھی۔ "کون مہمان آیا ہے چھوٹے صاحب؟"

"یہ دکھائی نہیں دے رہیں۔؟"

"یہ تو جی اپنے ہی جی ہیں۔"

"تو پھر چائے کے ساتھ جو لوازمات لائی ہو، واپس لے جاؤ۔"

"نہیں جی! جم جم کھائیں۔ انہیں کے مقدر کا تو ہے سب کچھ۔"

وہ معنی خیز انداز میں دونوں کو دیکھتے ہوئے چائے کا ٹرے رکھنے لگی۔

"گلابو۔!"

"جی چھوٹے صاحب!"

"تمہیں اپنی بیٹی کو وہ ملتان کے قریب گاؤں میں کسی پیر کے پاس لے کر جانا تھا تعویذ وغیرہ کرانے کے لیے۔"

"ہاں جی۔"

"تو تم صبح چلی جانا۔"

"چھوٹے صاحب! مجھے وہاں دو دن لگ جائیں گے۔"

"تو کوئی بات نہیں۔ تمہاری بیٹی زیادہ نہ بیمار ہو جائے۔"

"یہ تو ہے جی۔ لیکن پھر آپ۔ آپ کیا کریں گے؟"

"ارے گلابو۔ بس مجھے سنبھالنے والے بہت۔"

"وہ تو میں جانتی ہوں چھوٹے صاحب۔!" گلابو نے نگاہ بھر کر صنم کی طرف دیکھا اور بولی۔ "بہت کی بات چھوڑیئے۔ ایک ہی اچھا سنبھالنے والا مل جائے تو خدا کی کرم نوازی ہوتی ہے۔"

صنم نگاہیں جھکائے چپ چاپ بیٹھی پیالیوں میں چائے انڈیل رہی تھی۔ اسی کی طرف دیکھتے ہوتے گلابو پھر بولی۔ "پھر میں چلی جاؤں چھوٹے صاحب۔؟"

"ہاں، ضرور ضرور۔"

"پھر سمجھیے ابھی سے چلی گئی، رات کو کپڑے وغیرہ دھو کر تیار کر لوں گی۔ تو صبح پہلی گاڑی سے جا سکوں گی۔"

"یہ برتن وغیرہ تو سمیٹ لو گی نا۔"

"کوئی بات نہیں اتمی! میں سب کچھ کر لوں گی۔"

"تمہاری یہ سفید ساڑھی اور اجلا اجلا روپ۔" وہ قدرے آواز دبا کر بولا

"ابھی گھر جا کر بدل لیتی ہوں۔"

"نہیں، نہیں۔"

"تو کیا میں تمہیں ہر روپ، ہر حلیے میں اچھی نہیں لگتی۔؟"

صنم نے سرگوشی کی۔ پھر بلند آواز سے بولی۔

"ساتھ انجم اور ارم کو بھی لے آؤں گی۔"

"سلام چھوٹے صاحب جی۔ سلام چھوٹی بی بی۔"

گلابو گویا رخصت ہو گئی۔ وہ نگاہوں سے اوجھل ہوئی۔ تو آتم نے گھور کر صنم کو دیکھا "کیا کہہ رہی تھیں۔؟ انجم اور ارم کو لے آؤ گی۔"

"ہاں۔"

"ایک ہڈی کو نکالا ہے اور تم دو دو لے آؤ۔"

"ہائے۔! تو میں بھلا اکیلے گھر میں تمہارے پاس رہوں گی۔ خود ہی سوچو نا۔"

"کیا میں تمہیں کھا جاؤں گا۔؟"

"کیا پتہ۔؟" صنم زور سے ہنس دی۔

"تم میری محبت ہو صنم۔! میری عزت ہو۔! میں تمہاری پاکیزگی پہ کبھی بھی دھبہ نہیں لگنے دوں گا صنو۔!" آتم یکایک سنجیدہ ہو گیا۔

"تمہیں مجھ پر پورا اعتماد ہونا چاہیے۔"

"اتمی۔! مجھے تم پر اپنی ذات سے اپنے آپ سے بھی زیادہ اعتماد ہے۔ لیکن دنیا کی آنکھیں اور زبانیں کوئی نہیں بند کر سکتا۔ ویسے باقی دنیا کا معاملہ چھوڑ دو ممی اور ڈیڈی کے سامنے بھی تو مجھے سرخرو ہونا چاہیے۔"

چائے کی پیالی صنم نے آتم کے سامنے رکھ دی۔ پھر۔ گلابو واقعی چائے کے ساتھ بہت کچھ اٹھا لائی تھی۔

آتم اپنی پرلی طرف چائے کی پیالی رکھ رہا تھا۔ صنم نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر

برفی کا ایک بڑا سا ٹکڑا اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔

"اچھا صنو۔!" برفی کے چھوٹے چھوٹے ذروں سے لتھڑی اپنی مونچھیں اور ہونٹ صاف کرتے ہوئے آثم نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"جب میری باری آئے گی، تو شور نہ مچانا۔" آثم نے اس سے بھی بڑا برفی کا ٹکڑا اٹھا لیا۔

"غنچہ دہن ہوں۔" صنم شوخی سے بولی۔ "اس کا اندازہ لگا لینا۔"

آثم کی معیت میں رہ رہ کر وہ بھی بہت شریر ہو گئی تھی۔

"اور میں لگڑ بھگا تھا جو میرے منہ میں اتنا بڑا ڈال دیا۔"

"وہ تو میں نے محبت کے مارے اتنا بڑا ڈالا تھا۔"

"اور اب میری بھی محبت دیکھو۔"

آثم کسی صورت اسے بخشنے والا نہ تھا اور صنم اس وقت ایسے حلیے میں تھی کہ یک دم اٹھ کر بھاگ بھی نہ سکتی تھی۔ ساڑھی کے ساتھ اونچی سی ایڑی کے سینڈل پہنے تھی جن سے چلا ہی بڑی مشکل سے جاتا تھا۔ تب — یکایک اس نے آنکھیں بند کر کے منہ کھول دیا۔ "تمہارے ہاتھ سے اثمی! سب کچھ قبول — برفی چھوڑ زہر بھی ڈال دو۔ تو خوشی سے چاٹ لوں۔"

صنم کی یہ ادا آثم کو نہال کر گئی۔ برفی وہیں پھینک، اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا — اور — بڑے ہی وارفتہ نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے اس کی دونوں بند آنکھوں کو چوم لیا۔

یوں ہی دونوں بڑی دیر تک بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، چائے پیتے رہے، شرارتیں کرتے رہے اور پیار سے ایک دوسرے کو کھلاتے رہے، ہنستے اور مسکراتے رہے۔

"بس اب جاؤں۔" یکایک صنم چونکی

"نہیں۔"

"بس ممی سے پوچھ کر پھر آتی ہوں۔ کہوں گی نا کہ گلابو کی بیٹی اچانک بہت بیمار ہو گئی ہے۔ اس لیے گلابو اسے کسی پیر کے پاس لے گئی ہے اور اثمی بالکل اکیلا ہے۔"

"پھر تو وہ ضرور ہی آنے دیں گی تمہیں۔"

"کیوں نہ آنے دیں گی۔" صنم معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

"ہمارا گھرانہ ایک نہیں، پانچ پانچ بیٹیوں والا گھرانہ ہے۔"

"کیا مطلب۔؟"

"ممی ڈیڈی کو تم بہت پسند ہو۔" قدرے شرما کر صنم نے سر جھکا لیا۔

"سچ صنو۔" آثم نے اچھلتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "سچ کہہ رہی ہو۔"

"ہاں۔ ایک دن ممی اور ڈیڈی کی باتیں میں نے سن لی تھیں، تبھی تو مجھے ادھر یوں بے تکلف آنے جانے سے انہوں نے کبھی منع نہیں کیا۔"

"یہ تو تم نے بڑی اچھی خبر سنائی۔ لو۔ لو۔ جلدی سے منہ میٹھا کر دو۔"

آثم نے عجلت سے برفی کا ایک ٹکڑا اپنے منہ میں رکھنے کے بعد ایک صنم کے ہونٹوں میں بھی گھسا دیا۔

"پوری پلیٹ ختم کر چھوڑی ہے اور ابھی منہ ہی میٹھا نہیں ہوا۔"

"شگون کے لیے۔ بے وقوف! شگون کے لیے۔!"

آثم کے ساتھ صنم بھی مسکرانے لگی۔

"اب رہ گیا معاملہ میرے والدین کا۔" آثم اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا۔ "مجھے تو یقین ہے کہ ان آنکھوں کے جادو سے وہ بھی نہیں بچے ہوں گے۔"

"ہائے اللہ — ! کیسی باتیں کیے جا رہے ہو — امی بیگم اور ابا میاں پر آنکھوں کا جادو —"

"اوہ۔ ! غلطی ہو گئی۔ آنکھوں کا جادو تو صرف میرے لئے ہے ان کے لئے

تمہاری یہ من موہنی صورت اور میٹھی میٹھی' پیاری پیاری عادات ہی جادو ہیں۔ مجھے تو پورا یقین ہے کہ ان کے دل میں بھی یہی ہے۔ دونوں ہی تمہیں کتنا پیار کرتے ہیں۔ ہیں نا۔۔۔؟"

"مجھے نہیں پتہ۔۔۔" ایک شرمیلی سی ادا کے ساتھ اس نے اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا۔

"ارے بھئی! یہ رخ روشن کیوں چھپالیا۔ میری دنیا تاریک ہوئی جارہی ہے۔"
اُثم نے اس کے چہرے پر سے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی۔

"اوہ! تمہارا خیال ہوگا کہ میں نظر لگادوں گا۔۔۔ وعدہ کرتا ہوں کہ بالکل نہیں لگاؤں گا۔۔۔"

"اثمی۔۔۔!" وہ اسی انداز میں میٹھی میٹھی مدھم سی آواز میں بولی۔

"کہو جانِ اثمی۔۔۔!"

"اگر تمہیں سارا وقت ایسی ہی باتیں کرنا ہیں تو میں یہ دو تین دن اِدھر کا رُخ بالکل نہیں کروں گی۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ یہ ظلم نہ کرنا۔ اچھا میں وعدہ کرتا ہوں اب کوئی بات نہیں کروں گا بلکہ تم جتنی دیر رہو گی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بیٹھا رہوں گا۔"

صنم نے جلدی سے ہاتھ ہٹالیے۔

"اب رکھو انگلی۔۔۔"

"یہ اپنی چائے بھی ختم نہ کروں۔۔۔؟" وہ مسکرایا

"اچھا۔ چائے ختم کرتے ہی وعدے کے مطابق خود ہی فوراً انگلی رکھ لینا۔۔۔"

"اور سگریٹ۔۔۔"

"اور سگریٹ جناب یوں پیتے ہیں کہ ایک کے بعد دوسرا' پھر ساتھ ہی تیسرا' کیا ساری زندگی ایسے ہی وعدے کیا کرو گے اور نبھایا کرو گے۔"

"وہ تو ہوگا ہی۔ یہیں منظور نو۔۔۔" شرارت سے اس کی آنکھیں چمکیں۔

"بس' بس۔ خبردار۔! آگے شرارت میں بھی کچھ نہ کہنا۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"عورت صرف ایک بار محبت کرتی ہے۔"

"اور مرد ہرجائی ہوتے ہیں۔ کہہ دو۔ سب عورتوں کا یہی نعرہ ہے۔"

"بھئی جن کے ہوتے ہوں گے وہ کہتی ہوں گی۔ مگر میرا نہیں ہے۔"

"انشاء اللہ۔ !میں تمہارے اس اعتماد کو سدا قائم رکھنے کی کوشش کروں گا۔ صنم۔۔۔! ہمیشہ۔ ہمیشہ۔" خلوص و یقین اس کے چہرے سے مترشح تھے۔

پھر وہ تین دن ان کے اتنے خوب صورت گزرے کہ جیسے پوری زندگی کی حسرتیں نکل گئیں۔۔۔ صبح صنم اپنے گھر سے کالج جانے کے لیے نکلتی۔ اثمی کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے صرف ایک نظر اسے دیکھنے کی بے تابی اس کے قدم روک لیتی۔ وہ اندر چلی آتی۔

تب۔۔۔ اس کے بعد۔۔۔ وہ کالج جا ہی نہ پاتی۔۔۔ اثمی نے ابھی ناشتہ کرنا ہوتا تھا اس کے دوپہر کے کھانے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ اور اسے وہ اپنی ذمہ داری سمجھتی تھی۔ اسی ذمہ داری کا احساس اس کے قدم پکڑ لیتا۔

پھر وہ کالج جا ہی نہ پاتی۔۔۔ اثمی کے کاموں میں' اثمی کی معیت میں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلتا۔

یوں۔۔۔ وہ اپنی ممی سے بھی چوری روزانہ کالج کا سارا وقت وہیں گزارتی رہی پھر وہ اور کرتی بھی کیا۔ اس کے اثمی کا معاملہ تھا۔ اس کے دل کا معاملہ تھا نہ چاہتے ہوئے بھی چوریاں کرتی رہی۔ رو لیے دل ہی دل میں ممی سے بھی معذرت کرلیتی اور اللہ میاں سے بھی معافیاں مانگ لیتی تھی۔

اس کا اپنا ضمیر صاف تھا۔ وہ کوئی برا کام تو نہیں کرتی تھی۔ صرف اپنے اثمی

کی خدمت ہی کرتی تھی نا۔ اس کے کمرے کو ٹھیک ٹھاک کرتی۔ اس کے لیے ناشتہ اور کھانا وغیرہ تیار کرتی۔ آثم اس کے ساتھ ساتھ کمرے میں، باورچی خانے میں یوں اس کا پلو تھامے ہوتا جیسے کوئی منا سا بچہ۔

وہ اس کے لئے کھانا بناتی تو پیچھے سے اس کے گلے میں بازو حمائل کیے کھڑا آتنی دیر تک پیاری پیاری، میٹھی میٹھی سی باتیں اس کے ساتھ کرتا رہتا۔ پھر کھانا اس کے ہاتھ سے کھاتا۔ چائے اس کی ہاتھ سے پیتا۔ اور صنم کو یوں اس کی خدمت کرنے میں اتنا مزہ آتا کہ کبھی کبھی دل میں دعائیں مانگنے لگتی

"اللہ میاں! پروگرام سے زیادہ ہی دن ابا میاں اور امی بیگم وہاں رک جائیں۔"

آثم کے ساتھ گزرنے والا اک اک لمحہ اتنا خوب صورت، اتنا سہانا اور اتنا روح پرور تھا۔!!

پچھلے پہر انجم اور ارم وغیرہ سکول سے آتیں۔ تو معمول کی طرح وقت پر وہ بھی گھر چلی جاتی جیسے کالج سے لوٹ آئی تھی۔ کسی کو ذرا سا بھی شبہ نہ ہو پاتا۔ اتنے خوبصورت انداز میں اسے چوریاں کرنا آگئی تھیں۔

تب۔ ممی سے کہہ کر سب بہنوں کے ساتھ اثمی کے حضور پھر حاضری دینے آ پہنچتی اس وقت پھر ادھر ہی طرح کی محفل سجتی۔ بڑے پاس نہ ہوں تو بچے آزادی محسوس کرتے ہیں۔ خواہ بڑوں نے کبھی بھی کوئی پابندی نہ لگائی ہو۔

پھر سب مل کر خوب اودھم مچاتے۔ گپ بازی ہوتی۔ لطیفے بازی ہوتی، بیت بازی ہوتی۔ آثم کچھ ایسی باغ و بہار قسم کی طبیعت کا مالک تھا کہ سبھی لڑکیاں اسے بہت پسند کرتیں۔ اس کی باتوں سے لطف اندوز ہوتیں۔ اس کے مزیدار مزیدار لطیفوں سے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو ہو جاتیں۔

"کیوں بھائی جان! اب تو آپ کبھی نہیں کہیں گے نا کہ ہم بہت ڈھیر ساری ہیں، دیکھا کیسے ہم نے آپ کی تنہائی دور کر دی ہے۔"

انجم نے ایک دن احسان جتایا۔ تو آثم نے بڑے خوب صورت انداز میں مسکرا کر صنم کی طرف دیکھا۔ اس کی تنہائیاں دور کرنے کے لیے تو اک اس کی صنم کا وجود ہی اتنا کافی تھا۔ کہ لگتا ارد گرد محفلیں ہی محفلیں سجی تھیں۔ پوری دنیا وہیں آباد تھی جیسے۔

لیکن ان کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ انہیں کی وساطت سے تو باقی اوقات صنم کے وجود کے ساتھ سجے سنورے گزرتے تھے۔ ورنہ کالج کے بعد کے وقت کے لیے ممی کے سامنے پیش کرنے کو کوئی بھی بہانہ اس کے پاس نہ تھا۔

"جی ہاں۔ بالکل۔ بالکل۔" تب وہ بڑی فراخدلی سے ان کا احسان مان لیتا۔

O

شہزاد نے قانون کی ڈگری لے کر وکالت شروع کر دی۔ باپ دولت والا تھا بڑا خوب صورت اس کا دفتر بن گیا۔ ٹیلی فون ایک دو ہفتے میں لگ گیا۔ کار آگئی کہ بڑا وکیل وہی سمجھا جاتا ہے۔ جس کے پاس یہ سب کچھ ہو۔

تین چار مقدمے تو گاؤں سے ہی مل گئے۔ اسی گاؤں سے جس کا بہت بڑا زمیندار اس کا باپ تھا۔ یوں۔ اس کے سر پہ باپ کا سایہ تھا۔ دولت کا سایہ تھا۔ اس کے نصیب میں بھی خوشحالی ہی خوشحالی لکھی گئی۔

اور وہ۔ سر اونچا ہوا۔ عقل نے ذہن روشن کیا۔ تو مقدر کی تاریکی راہوں میں آکر پھیل گئی۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھتے ہی وہ ایسا بے سہارا ہوا کہ آنے والی زندگی کا اک اک لمحہ بے سہارا ہو گیا۔

تعلیم مکمل وہ نہ کر سکا، نہ اپنی، نہ بہن کی، اپنا مستقبل سنوارنا چاہا۔ وہ سنورنے کی بجائے بگڑ ہی گیا۔ بہن اور ماں کے لیے آسودگی اور آسائشوں کی تمنا کی تو وہ پوری نہ ہوئی۔ بہت ساری تگ و دو اور بہت جد و جہد کے بعد ایک نوکری ملی تھی، دو ہزار ماہ

بعد ہی وہ بھی چھوٹ چکی تھی۔ شہزاد کے دوست کا اس دفتر سے تبادلہ کیا ہوا ساتھ اس کا بھی نصیب بدل گیا۔

اور اب۔ کئی ماہ سے وہ پھر بے کار تھا۔ قرض کا بوجھ پہلے ہی کندھوں پر کافی تھا۔ مسلسل بے کاری کی وجہ سے اب وہ اور بھی بھاری ہوا جا رہا تھا۔ بس! صرف اک خوش بختی تھی تو یہ۔ کہ اسے شہزاد جیسا مخلص دوست مل گیا ہوا تھا۔

اس پر کوئی بھی مشکل کا، پریشانی کا وقت آتا، اسے شہزاد کے سامنے نہ زبان کھولنا پڑتی، نہ دستِ سوال دراز کرنا پڑتا۔ وہ اپنے آپ ہی تاڑ جاتا۔ محسوس کر لیتا اور پھر خود ہی حل کر دیتا۔

گھر میں کوئی پیسہ نہ ہوتا۔ امی کا خاموش اور فکر و تردد میں ڈوبا چہرہ دیکھ کر شہزاد خود ہی کچھ نہ کچھ لا کر ان کے ہاتھ میں تھما دیتا۔ بغیر کوئی حساب کئے بغیر کوئی احسان جتائے۔ کاشف کی نگاہ میں البتہ ایک ایک پیسہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ماں اور بہن پر غیر کا مال خرچ ہو۔ یہ اس کی ذمہ داری تھی۔ خدا نے اس پر ڈالی تھی اور اسے ہی نبھانا تھا۔

شہزاد اگر وقت پر کام آ جاتا تھا۔ تو یہی بڑی بات تھی۔ اس کا لاکھوں کا احسان تھا اور اس کی عظمت کی دلیل ــــ! کاشف کے دل میں تھا کہ جب بھی پھر اس کی نوکری لگی یا وہ اس قابل ہوا تو اس کا دیا ہوا ایک ایک پیسہ بصد شکریہ لوٹا دے گا۔

انہیں لامتناہی سوچوں میں ڈوبا وہ گھر آ رہا تھا۔ ایک نوکری کے لیے انٹرویو دے کر۔ لیکن اسے وہ ملازمت ملنے کی امید بالکل نہیں تھی۔ اتنے عرصے سے یہی کچھ تو ہو رہا تھا۔ رشوت دینے والے، سفارش گزارنے والے رکھ لیے جاتے اور وہ اس نوکری کی اہلیت رکھتے ہوئے بھی ناکام ہی رہتا۔ اس کی خود اعتمادی ٹوٹ ٹوٹ جاتی۔ بکھر بکھر جاتی۔ وہ کسی حقیر ذرے سے بھی زیادہ خود کو

حقیر جاننے لگتا۔

بہت دنوں سے اس کی جیب میں کوئی پیسہ نہ تھا۔ امی سے بھی مانگنے کو دل نہ چاہا۔ وہ لا کر دیتا ہی کیا تھا۔ جو پھر ضرورت پڑنے پر مانگ سکتا۔ آج تک کوئی بھی تو ان کا حق اس نے ادا نہیں کیا تھا۔ انہیں جذبات و احساسات کو سینے سے لگائے پانچ میل پیدل چل کر وہ انٹرویو دینے گیا تھا اور اب پانچ میل پیدل چل کر تھکا تھکا یا ہمیشہ کی طرح ملازمت نہ ملنے کا خدشہ دامن میں سمیٹے گھر واپس آ رہا تھا۔

پرانی طرز کا بنا ہوا ان کا گھر تھا۔ جس کا بیرونی دروازہ ایک بازار میں کھلتا تھا یہ دودھ والے کی دکان تھی۔ تو وہ نون تیل بیچنے والے کی، سبزی کی، گوشت کی، پھل کی، مٹی کے تیل کی، کوئلے کی اور لکڑی کی۔ غرض ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی اک اسی بازار سے فراہم ہو سکتی تھیں۔

ابّا کسی باعزت جگہ پر کوٹھی بنانے کا ارادہ دل ہی میں لے کر آگے سدھار گئے اور ان بے چاروں کے لیے سدا کی یہ ہاؤ ہو رہ گئی۔ دکانوں کے تھڑوں پر بے مصرف بیٹھے ہوئے بے کار اور آوارہ لوگوں کی باتوں کا موضوع کبھی کسی کا گھر ہوتا تو کبھی کسی کی بیوی، بہن، بیٹی یا کوئی اور مسئلہ ہوتا۔

کاشف دن میں جتنی بار گھر آتا۔ یا گھر سے نکلتا تو اس ماحول سے جلد از جلد فرار کے لیے اس کا من تڑپ تڑپ اٹھتا۔ اس کی روح بے قرار ہو جاتی۔ اب بھی جب اپنے بازار میں آیا۔ تو اس کی دوسری سب سوچیں رخصت ہو گئیں۔ وہ اب صرف اس بازار، اس کی فضا، ان دکانوں اور دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے بے کار لوگوں کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ جانے یہ لوگ گزارہ کیسے کرتے تھے۔ ایک وہ تھا۔ بے کاری کا اک اک لمحہ بھی اسے بچھو بن کر ڈستا ہوا گزر رہا تھا۔

دودھ والے کی دکان کے سامنے سے گزرا۔ وہ بڑے بڑے دودھ کے گڑوے آگے رکھے ان میں گندا مندا پانی ملا رہا تھا۔ بلا جھجک بغیر خدا کا خوف کئے۔ سبزی والا گلی سڑی سبزی بھی بے حد مہنگے داموں بیچ رہا تھا۔ اس سبزی کو جو یقیناً وہ منڈی کے کسی خراب مال کے ڈھیر میں سے اونے پونے داموں خرید لایا ہوگا نہ کسی کا ایمان سلامت تھا اور نہ دیانت داری۔

گوشت والے کی دکان کے پاس سے گزرا، جانے کسی بیمار جانور کا گوشت تھا یا پھر دو دن کا باسی۔ لبساندھ سے اسے ابکائی سی آنے لگی۔ ناک پر رومال رکھ کر اس نے ایک ہی قدم آگے بڑھایا تھا کہ عین اپنے سامنے دو لڑکوں کو اپنی طرف اشارے کر کر کے کچھ باتیں کرتے پایا۔

وہ داؤد اور اقبال تھے۔ اسی محلے کے آوارہ مزاج نوجوان، جنہیں نہ کوئی مصروفیت تھی اور نہ کوئی کام۔ بس سارا دن اسی بازار میں کبھی اس تھڑے پر بیٹھ کر وقت گزار دیتے اور کبھی کسی گھر کی کھڑکیوں تلے کھڑے ہو کر فحش فحش باتیں کرتے رہتے۔ تاک جھانک کرتے رہتے اور آتی جاتی لڑکیوں پر آوازے کستے رہتے۔

اس وقت ان کی گفتگو کا موضوع شاید کاشف ہی تھا۔

مگر اس نے ذرا دھیان نہ دیا۔ ان کی عادت ہی ایسی تھی۔ وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

"مگر یار چھوڑو اس لڑکی کی بات ــــ تم نے کبھی کاشف کی بہن کو غور سے دیکھا ہے۔"

کاشف کی گڑیا کا ذکر اور ان آوارہ لڑکوں کے ناپاک ہونٹوں پر ــ اس کے قدم وہیں تھم گئے۔

"اتنی خوب صورت ہے کہ کیا کوئی ایکٹرس ہوگی۔ اپنی زیبا، سنگیتا اور آسیہ وغیرہ سب اس کی باندیاں لگیں۔"

"یہ جو جوتیاں چٹخاتا، نوکری ڈھونڈتا پھر رہا ہے اسے چاہیئے وہی سرمایہ کام پر لگا دے۔ سونے میں کھیلنے لگ جائے گا۔"

"لگایا تو ہوا ہے شاید۔ اسی لیے گزارہ بھی ہو رہا ہے۔ وہ دیکھو۔ وہ گاڑی اس کے دروازے پر کھڑی ہے۔"

"یار! اگر یہ بات ہے تو کوشش کریں۔ شاید ہمیں بھی چانس مل جائے۔"

داؤد نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

وہ بڑے ٹھنڈے مزاج اور صبر و حوصلے کا مالک تھا، مگر بات گڑیا کی تھی۔ اس کی فرشتوں سے زیادہ پاک اور حوروں سے زیادہ مقدس بہن کی۔ ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ جانا کوئی عجیب بات نہ تھی۔

غصے میں سرخ چہرہ اور لال انگارہ جیسی آنکھیں لیے وہ پلٹا۔ کاشف کو اپنی جانب آتے دیکھ کر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

"اب بتاؤ۔ کیا کہہ رہے تھے ــ؟" قریب جا کر کاشف نے داؤد کو گریبان سے پکڑ لیا۔ "تمہاری کوئی بہن ہے ــ؟" اس کی آنکھوں سے جیسے خون ٹپک رہا تھا۔

"ہے تو ــ" وہ ڈھٹائی سے کاشف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ "مگر ہم عزت دار لوگ ہیں۔"

"کیا مطلب ــ؟"

"ہم بہنوں کی کمائی نہیں کھاتے ــ" پاس سے اقبال اپنے دوست داؤد کی حمایت میں خالص غنڈوں کے سے انداز میں بولا۔

"تو کیا میں تمہیں ایسا لگتا ہوں ــ؟" کاشف نے دوسرے ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ پھر بڑے جوش کے عالم میں دونوں کو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"خبردار! جو تم نے پھر کبھی یوں اپنے ناپاک ہونٹوں سے میری بہن کا نام لیا۔ اس جیسی پاک باز تمہارے پورے کے پورے خاندان میں کوئی لڑکی نہ پیدا ہوئی ہوگی۔"

"ہاں ـــ" داؤد نے کاشف کا ہاتھ جھٹک کر طنز سے بھرا اک قہقہہ لگایا "بڑی پاک باز ہے۔ وہ بھی اور تو بھی ـــ تبھی اکثر دروازے پر گاڑی کھڑی رہتی ہے۔"

"ذلیل انسان ـــ! وہ میرا دوست ہے۔ میرا محسن ہے ـــ" کاشف نے اقبال کا گریبان چھوڑ کر پھر داؤد کا پکڑ لیا ـــ اور ـــ اب داؤد کو بھی تاؤ آگیا ـــ سارا بازار اس کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔ اور کاشف نے اسے گریبان سے پکڑ لیا تھا۔

"تیرا دوست ہے یا تیری بہن کا یار ہے۔؟"

"کمینے ـــ ذلیل ـــ کتّے ـــ!!!" کاشف نے اس پر تابڑ توڑ مکّوں کی بارش کردی۔ اس کی گڑیا کے متعلق، اس کے اتنے اچھے اور مخلص دوست شہزاد کے متعلق لوگ ایسے خیال رکھتے تھے۔

غصّے سے وہ کانپ رہا تھا۔ اس کی پوری ہستی میں اک زلزلہ سا آیا ہوا تھا۔ اسے اپنا ہوش تھا نہ ارگرد کا اور نہ اپنی حیثیت کا۔ وہ پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ باتیں کرتے ہوئے اس کا لہجہ ہمیشہ کسی سبک رو ندی کی طرح دھیما دھیما سا ہوتا۔ اس کے اطوار بڑے شائستہ تھے۔ وہ بڑی حلیم طبع کا مالک تھا۔ مگر ـــ یہ معاملہ تو اس کی گڑیا کا تھا۔ اس کی بھولی بھالی اور معصوم سی گڑیا کا۔

دفورِ طیش نے اسے آپے سے باہر کر دیا۔ اقبال نے اپنے دوست داؤد کی مدد کرنا چاہی ـــ اسے بھی دو تین گھونسے جڑ دیئے ـــ تب ـــ وہ دونوں بھی باقاعدہ اس سے گتھم گتھا ہوگئے۔

کاشف نے انہیں دو، دو گھونسے لگائے تھے انہوں نے چار چار جڑ دیئے ـــ کاشف نے ان کے گریبان پکڑے تھے انہوں نے اس کا گریبان تار تار کر ڈالا۔ سارے بازار کے لوگ اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر ان کے گرد آ جمع ہوئے۔

کاشف نے کبھی کسی کو ماں کی گالی نہیں دی تھی ـــ داؤد اور اقبال مارکٹائی کے ساتھ ساتھ ماں بہن کی گالیاں بھی بک رہے تھے۔ کاشف کا غصّہ اور تیز ہو رہا تھا۔ لوگ انہیں چھڑاتے۔ ایک دوسرے سے دُور لے جاتے۔ مگر وہ پھر آ کر ایک دوسرے سے لپٹ پڑتے۔

اقبال نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لپک کر گوشت والے کی دکان سے یہ بڑا سا چھرا اٹھا لیا۔ لوگ پکڑتے رہ گئے۔ چیخوں اور شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ کاشف اور داؤد ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ اقبال چھرا ہاتھ میں لہراتا ہوا اور زور سے نعرہ مارتا ہوا ان میں شامل ہوگیا۔

لوگ چیخنے چلانے لگے۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور کیا نہیں ہو رہا۔ اردگرد لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ داؤد اور اقبال کی زبانوں کی بے نقط نکلنے والی گالیوں میں اضافہ ہوا جا رہا تھا۔

اور پھر ـــ پتہ نہیں کیسے ہوا اور کس طرح ہوا ـــ؟ داؤد کے سینے میں چھرا پیوست تھا ـــ اور کاشف اور اقبال کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ طوفان یک دم تھم گیا۔ چند لمحے یوں ہی خاموشی رہی۔ جیسے وہ چلتا بازار نہیں، کوئی قبرستان تھا ـــ!

"مرگیا ـــ!" ایک آواز نے سناٹے کو چیرا۔

اور پھر یک لخت شور مچ گیا۔

"کون مرگیا ـــ؟"

"کس نے مار ڈالا ـــ؟"

"داؤد۔"

"کاشف نے مار ڈالا۔" کوئی آواز ابھری۔

"داؤد کو کاشف نے قتل کر دیا۔ داؤد کو کاشف نے قتل کر دیا۔" ہر طرف یہ صدا اچھل گئی۔ ہر زبان پر، ہر ہونٹ پر یہی فقرہ تھا اور آگے سے آگے چلا جا رہا تھا۔

"نہیں۔ نہیں۔ میں نے تو اسے نہیں قتل کیا۔ میں نے نہیں کیا۔"

کاشف کا مرتعش لہجہ نقار خانے میں طوطی کی آواز بن گیا۔

چند منٹوں میں پولیس آگئی۔ نعش کو قبضہ میں لینے کے بعد کاشف کو ہتھکڑی پہنا دی گئی۔

"میں نے تو اسے قتل نہیں کیا۔" کاشف نے دبے لہجے میں پھر صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "ہمارا جھگڑا ضرور ہوا ہے۔"

"یہ تو اب عدالت میں ہی جا کر فیصلہ ہو گا۔" پولیس والے اسے حراست میں لیے تھانے کو چل دیئے۔ اس کی کچھ سنی ہی نہیں۔ سارے بازار میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں لوگ سہمے ہوتے تھے۔ کسی کا سودا کچھ بکا کچھ نہیں۔ کسی کا اسی طرح پڑا ہوا تھا۔ مگر کسی نے پرواہ ہی نہیں کی۔

دہشت کے مارے سرِ شام ہی لوگ دکانیں بند کر کے اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

○

موسم یکایک بڑا ہی خوشگوار ہو گیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ مل کر اس سے لطف اندوز

ہونے والا کوئی نہ تھا۔ ابا میاں اپنے دفتر گیے ہوئے تھے اور امی بیگم ہنڈیا چولہے میں مصروف تھیں۔ یوں تو گھر کا کام کاج کرنے کے لیے گلابو موجود تھی مگر کھانا ہمیشہ امی بیگم خود ہی بنایا کرتی تھیں۔ ابا میاں کسی اور کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہی نہیں کرتے تھے۔

یوں وہ اکیلا بور ہو رہا تھا۔ امتحان کے بعد نتیجے کا انتظار تھا خاصا ناخوش گوار کام تھا۔ دوست کوئی ایسا بنایا نہیں ہوا تھا کہ جس کی رفاقتیں اس کا دل بہلاتیں۔ دوستوں میں سب سے گہرا اک دوست صنم جو موجود تھی۔ شاید تبھی اس نے کوئی اور دوست بنانے کی کبھی ضرورت ہی نہ محسوس کی تھی —— اور وہ بھی اس وقت کالج گئی ہوئی تھی۔

کرکٹ بھی چھوٹ چکی تھی۔ سب لڑکے امتحانات سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ ابا میاں کوئی ملازمت بھی نہیں کرنے دیتے تھے کہ اس کی تگ و دو اور تلاش کی اک مصروفیت مل جاتی۔ وہ تو اسے اپنے ہی امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار میں لگانا چاہ رہے تھے۔ مگر اس کے لیے آثم کا خود اپنا موڈ بھی نہیں بن رہا تھا۔

امی بیگم نے کتنی ہی بار اسے اس کا احساس دلایا کہ اسے اب کام شروع کر دینا چاہیئے تھا۔ کیونکہ نتیجہ نکلتے ہی وہ اس کی شادی کر دینا چاہتی تھیں۔

"امی بیگم! آپ ہر وقت شادی شادی کا کہتی رہتی ہیں —— پہلے کوئی لڑکی تو ڈھونڈ دیتے ——" ایک دن ہنسی ہنسی میں آثم نے کہہ دیا تھا۔

"لڑکی تو میں ڈھونڈ بھی چکی۔ بہت عرصہ ہوا۔"

امی بیگم کا جواب سن کر آثم نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ نہ لڑکی کے متعلق اور نہ شادی کے متعلق۔ لڑکی کے متعلق اس لیے نہیں کہ اسے خود ہی علم تھا۔ صنم کے علاوہ ان کا انتخاب اور کوئی نہ تھا۔ یہ اسے یقین کامل تھا۔ اور شادی کے متعلق اس لیے اس نے نہیں پوچھا کہ وہ ابھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔

کیوں کرنا نہیں چاہتا تھا۔؟ یہ اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ بس دل کے اندر اک عجیب سی سوچ تھی جو اکثر ذہن کے تار پر آ کر اس کے دل کو اک شاک سا لگا دیا کرتی تھی۔

آج بھی ارد گرد کوئی نہیں تھا۔ اتنا حسین موسم تھا۔ ایک کتاب، سگریٹوں کے تین چار پیکٹ اور ٹرانسسٹر وغیرہ لے کر وہ اکیلا ہی اس موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے لان کی نرم نرم گھاس پر لیٹا تھا۔

کتاب ہاتھوں میں تھی۔ سلگا ہوا سگریٹ ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ کسی دلنواز موسیقی کی تانیں سماعت سے ٹکرا رہی تھیں کہ یک لخت ہی ذہن کی وہی سوچ لاشعور سے نکل کر شعور کے پردے پر آ کر تھرکنے لگی۔

ٹرانسسٹر کا سوئچ دبایا اور کتاب بند کر کے نیچے رکھنے کے بعد وہ اسی کی طرف اپنی ساری توجہات کے ساتھ متوجہ ہو گیا۔

وہ دنیا میں آیا۔ اسے ہر آسائش ملی۔ ہر نعمت میسر ہوئی۔ کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ صنم ایسا بچپن کا ساتھی مل گیا جس نے نہ کوئی تنہائی محسوس ہونے دی۔ نہ کسی اور محرومی کا احساس۔ زندگی کا ہر لمحہ بڑی مسرت اور شادمانی سے کٹنے لگا۔

پھر۔ جوان ہوا۔ اب اس کی جوانی کا کوئی ساتھی چاہیئے تھا۔ تب۔ صنم۔ اس کے بچپن کے ساتھی نے اس کی جوانی کے ساتھی کا اک بے حد خوبصورت سا روپ دھار لیا۔ اس نے اسے ایسے انوکھے، سہانے سہانے سے جذبات اور احساسات سے روشناس کرایا کہ اس کا من روشن ہو اٹھا۔

جوان ہونے والے ہر لڑکے کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی جوانی کسی کے دل کو گرمائے۔ کوئی انہیں چاہے۔ اور وہ اپنے جوان ہونے والے تیز و تند جذبات کا مخالف جنس پر اظہار کریں کہ ان کی مردانگی تسکین پا سکے۔

اور اسے ایسی کوئی بھی تلاش نہیں کرنا پڑی تھی۔ پروردگار نے صنم کے روپ میں

اسے ایسا ساتھ دے دیا ہوا تھا کہ وہ اس کے ذہن کے بنائے ہوئے ہر ڈھانچے میں ڈھلتی گئی۔ اس نے اس کے جذبات کو قبولیت بخش کر گویا اسے ہر نعمت سے مالا مال کر دیا تھا۔ اس کے خوابوں کو بڑی ہی خوب صورت سی تعبیر مل گئی تھی۔

وہ اب اس کے قریب، اس کے پاس نہ بھی ہوتی تو اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ یہیں کہیں، اس کے ارد گرد، اس کے اندر موجود تھی۔ ایسے خوبصورت جذبے اس کی ذات نے اسے بخشے تھے۔

پھر۔ ابا میاں کی خواہش کے مطابق اس نے ایم اے کا امتحان بھی دے ڈالا تھا۔ توی امید تھی کہ اس میں بھی کامیاب تھا۔ کیونکہ اس کے پرچے بڑے اچھے ہوتے تھے۔ اس کے بعد اسے کسی نوکری وغیرہ کے لیے در بدر ٹھوکریں بھی نہیں کھانا تھیں۔ ابا میاں کا کاروبار قائم تھا۔ اسی کو اس نے سنبھال لینا تھا۔ امی بیگم نے اسی کی پسند کی لڑکی اس کے لیے منتخب کی ہوئی تھی۔ دو چار مہینے تک انہوں نے اس کی شادی بھی کر دینا تھی۔

یوں۔ اس کی زندگی مکمل تھی۔ اس کی زندگی کامران اور شادمان تھی۔ اس کی ہر خواہش، ہر تمنا تکمیل پر پہنچ رہی تھی۔ مگر۔ یہ سب کچھ صرف اور صرف اس کی اپنی ذات، اپنی ہستی کے لیے ہی تھا نا۔

صنم اس کی تھی۔ صرف اس کی۔ تعلیم اس نے حاصل کی۔ وہ اس کے اپنے لیے تھی۔ اپنے ہی من کی روشنی کے لیے۔ ابا میاں کا کاروبار اس کے خوشحال مستقبل کا ضامن تھا۔ اس کے اپنے مستقبل کا۔

سب کچھ اسی کا، سب کچھ اس کی اپنی ذات، اپنے مستقبل اور اپنی زندگی کے لیے۔ کسی دوسرے انسان کو اس سے کیا فائدہ پہنچا۔؟ کسی دوسرے کے لیے اس نے کیا کیا۔؟

کچھ بھی تو نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ پھر کیا یہ خود غرضی نہ تھی۔؟ صرف اپنی

ہی ذات، اپنی ہی ہستی کے محور کے گرد گھومنا تنگ نظری نہ تھی ـ؟ قرآن نے انسان کو اجتماعی زندگی گزارنے کا درس دیا ہے۔ اور اس نے آج تک جو کچھ کیا۔ صرف اپنے لیے کیا۔

اس نے کیوں کوئی ایسا راستہ اختیار نہ کیا جس پہ وہ چلتا۔ تو دوسروں کو بھی کچھ فیض پہنچا سکتا ـ اب تو اس کا وجود کسی دوسرے کے لیے بالکل غیر اہم تھا۔ ہوا نہ ہوا اک برابر۔ یہ بھی کوئی زندگی تھی ـ یہ بھی کوئی انسانیت تھی ـ؟

اور وہ یہی سوچ تھی۔ جو اکثر اسے پریشان کر دیا کرتی ـ اس کی زندگی کی سیدھی سپاٹ راہوں میں دھند پھیلا دیتی۔ تب وہ بیچ دوراہے کھڑا رہ جاتا اور اسے یوں لگتا ـ جیسے وہ منزل کھو بیٹھا تھا۔ اصل زندگی کا مقصد اس نے کبھی بھی نہ پایا تھا ـ!

اور کچھ نہیں تو ڈاکٹر بن جاتا ـ فکر معاش کی آزادی کے ساتھ ساتھ ہزاروں لاکھوں انسانوں کو اس سے فائدہ پہنچتا ـ وکیل بنتا تو سو کے بگڑے کاج سنوارتا۔ لوگوں کے غصب شدہ حق حقوق دلواتا ـ فوج میں جاتا ـ ملک کو فائدہ پہنچتا ـ مگر اب ـ اب تو وہ صرف اور صرف اپنا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔

"ہیلو ـ! ہیلو ـ!" صنم ـ بڑے پیار سے اس کی ناک مروڑ رہی تھی۔

"اثمی صاحب ہیں ـ؟" وہ اپنے خیالات سے چونکا۔

"یہاں اثمی صاحب نہیں رہتے ـ سوری! رانگ نمبر ـ" وہ سنجیدہ تھا

"اثمی صاحب نہیں رہتے ـ اور یہ کون ہے ـ" صنم نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے پھر اس کی خوب صورت سی ناک پکڑ لی۔ "یہ اکیلے پڑے کیا کر رہے ہو؟"

"اک بے کار انسان کیا کر سکتا ہے ـ"

آثم کا جواب صنم کے لیے بالکل خلاف توقع تھا ـ ورنہ اس کے اس سوال کا جواب وہ ہمیشہ یوں دیا کرتا تھا ـ "اپنی صنم کا انتظار ـ" اور وہ نہال نہال ہو ہو جاتی۔

بڑی حیرت سے صنم نے اسے دیکھا ـ وہ پھر ڈوب سا گیا تھا ـ شاید اس سے ناراض تھا ـ وہ آج کالج سے بھی تو بڑی دیر کر کے آئی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آج کل اس کا اثمی گھر میں اکیلا پڑا بور ہوتا رہتا تھا ـ اس لیے اسے اس کا شدت سے انتظار رہتا تھا۔

صنم نے اس کے بالوں میں انگلیاں الجھا دیں ـ اور جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

"دیکھو صنو! اس وقت رومانس بالکل نہیں ـ"

اک جھٹکے سے صنم نے اس کے بالوں میں سے ہاتھ نکالا ـ یوں تو اس نے پہلے کبھی نہیں کہا تھا۔ صنم کا قرب اور پیار بھری باتیں تو اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا اور خوشی ہوا کرتی تھی۔

"کیا ہوا اثمی ـ؟" صنم نے بڑے پیار سے آثم کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو؟"

آثم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سگریٹ کا ایک طویل سا کش لیتے ہوئے خلاؤں میں گھورنے لگا۔

"اف ـ! اتنے ڈھیر سارے سگریٹ تم نے دو تین گھنٹوں میں پھونک ڈالے ہیں ـ"

"دو تین گھنٹوں میں نہیں ـ شاید صرف ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ـ"

"لیکن کیوں ـ؟" صنم نے نرم نرم نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ والا سگریٹ اس سے چھین لیا۔ "پہلے بتاؤ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں صنو ـ! ایسے ہی بہت دنوں سے اک سوچ میرے ذہن میں آ آ کر مجھے پریشان سا کیے دے رہی ہے ـ"

"یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ وہ سوچ کیا ہے ـ؟"

"سوچ بس یہی ہے کہ جب سے پیدا ہوا ہوں ـ اس لمحے سے لے کر آج تک

میں نے زندگی میں جو کچھ کیا ہے صرف اپنے لیے۔ اپنی ذات کے لیے۔ کسی اور کے لیے میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ ہم اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے دُنیا میں آئے ہیں۔ مگر اکثر صرف اپنی ہی ذات کے محور کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ کسی دوسرے کے لیے کچھ نہیں کر پاتے۔"

"لیکن اثمی۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں صنو۔ تم میری بچپن کی ساتھی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اک تمہیں ہو جو میری بات کا مفہوم سمجھ سکو گی۔ کیا میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں۔؟ ذرا میرے ذہن کے ساتھ ذہن ملا کر سوچو نا۔"

صنم چپ سی ہو گئی۔ اور بڑے غور سے اس کی بات سننے لگی۔

"دنیا میں آنے کے بعد کیا میں نے سب کچھ اپنے لیے نہیں کیا۔؟ تعلیم حاصل کی تو اپنے لیے۔ آسائشوں کی تمنّا کی تو اپنے لیے۔ ابا میاں کا کاروبار سنبھالوں گا تو اپنے لیے۔ تم سے محبت کی تو اپنے ہی جذبوں کو تسکین ملی۔ شادی کر دوں گا، بچّے ہوں گے۔ پھر ان کے لیے جد و جہد شروع ہو جائے گی وہ بھی میری اپنی ذات اپنی خوشی کے لیے کہ بیوی بچّے، گھر بار سب کچھ میرا ہو گا۔ بتاؤ نا کسی دوسرے انسان کے لیے میں نے کیا کیا۔؟؟"

صنم سر جھکائے خاموش بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ سوچے جا رہی تھی۔ کئی لمحات یوں ہی بیت گئے۔

"صنم! میرا مدعا سمجھ گئی ہو نا۔؟" آثم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم خاموش کیوں ہو گئی ہو۔؟" اس نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔

"صنو! تم میری ساتھی ہو۔ اور اصل ساتھی وہی ہوتا ہے جس کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی بھی ہو۔ ہمیشہ تم وہی کرتی رہی ہو، جو میرے ذہن میں، میرے دل میں آتا رہا ہے۔ آج بھی میری اس سوچ کو اسی ذہن۔۔۔۔"

"ارے بھئی! پریشان کیوں ہو رہے ہو۔؟" صنم نے اس کی بات کاٹ دی

"میں بڑی اچھی طرح تمہاری بات سمجھ گئی ہوں۔" سر اونچا کر کے اس کی نظر سے نظر ملاتے ہوئے صنم مسکرا دی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنے اثمی کی بات صنم نہ سمجھے۔!"

"پھر تم یوں خاموش سی کیوں ہو گئی تھیں۔؟"

"اس لیے کہ تمہاری یہ سوچ میرے دل کو لگی ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے اثمی۔! کہ تمہارے ذہن میں ایسی زندہ سوچیں ہیں۔ اور انہیں سوچوں کے لیے میں سوچنے لگ گئی تھی کہ ان کی تکمیل کیسے ہو۔ تمہاری زندگی کی ساتھی ہوں نا۔! مجھے بھی تمہارا ساتھ دینا ہے۔"

"سچ صنم! تم میرا ساتھ دو گی۔؟ تم میری سوچوں کو میرے ساتھ مل کر عمل کی راہیں دکھاؤ گی۔؟!"

"کیوں نہیں۔؟ زندگی کے ہر قدم میں تمہارے ساتھ قدم ملا کر چلوں گی اثمی، اور یہ راہیں تو نیکی کی منزل کی طرف جاتی ہیں۔"

"اوہ! میری صنم۔!!" آثم نے اطمینان و سکون بھرا اک سانس لیتے ہوئے اس کی کمر کے گرد بازو پھیلا لیا۔

"دیکھو اثمی! سنجیدہ موضوع ہے۔ اس وقت رومانس بالکل نہیں۔"

صنم نے اس کا بازو پرے ہٹا دیا۔

"اچھا جی۔ بدلے اتارتی ہو۔"

"نہیں۔ سنجیدہ ہوں۔ اور۔ اور بھی کام ہیں۔ اس محبّت کے سوا۔ اور جب الشان اس طرف لگ جاتا ہے۔ تو پھر اور کسی کام کا نہیں رہتا۔ رومانس والی باتیں۔ اور حرکتیں شروع ہو گئیں۔ تو یہ موضوع یہیں دفن ہو کر رہ جائے گا۔"

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو۔ جیسے پہلے سے ہی یہ سب کچھ تم بھی سوچ چکی ہو۔؟"

"ہاں۔"

"سچّی۔"

"یقین کرو۔"

"تمہارا اور میرا ذہن کہیں ایک تو نہیں ہے؟"

"دل ایک ہے دماغ کیسے دو ہو سکتے ہیں ہے؟"

"دیکھو۔ اب تم نے ایسی بات کی ہے؟"

"کیسی ہے؟"

"رومانس والی۔!"

"نہیں نہیں۔" صنم مسکرادی۔ "ایسی بالکل نہیں۔ وہ تو بات سے بات نکل آئی تھی۔ میری نیت پہ شبہ نہ کرو اثمی۔"

"اچھا۔!" وہ بھی مسکرادیا۔

"چلو۔ پھر اصل موضوع کی طرف۔"

"میں بتاؤں کہ میں ایسا کیوں سوچتی تھی۔"

"بتاؤ۔" آثم بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"ہماری ٹک شاپ کے سموسے بہت اچھے ہوتے ہیں۔"

"تمہی۔" آثم یکایک اچھل پڑا۔ "میں بھی کہوں یہ ہر وقت میری جیب ڈاکہ زنی کا شکار کیوں ہوتی رہتی ہے۔؟"

صنم کھل کھل کر ہنسنے لگی۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا۔ میں تو چپکے سے نکال کے جاتی رہی ہوں۔"

"تمہیں آنکھوں سے دیکھنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ میرے من کی آنکھیں ہر وقت تمہارے ہی طواف میں لگی رہتی ہیں۔ صنو جانی۔!"

"میں نے کہا نا رومانس نہیں۔"

"اب کون سا رومانس کیا ہے۔؟"

"یہ محبت اور پیار بھرے الفاظ۔ تمہارے منہ سے نکلے ہوئے ایسے جذباتی

سے فقرے میرے دل کو اتھل پتھل کر دیتے ہیں۔"

"بس۔! ارادوں میں ایسا ہی استحکام ہے۔؟ آخر صنفِ نازک ہی رہیں نا۔"

"مجھے صنف نازک کا طعنہ نہ دو اثمی۔ اصنفِ نازک نے دنیا میں بہت بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ اور۔" صنم نے بڑے پیارے انداز میں سینے پر ہاتھ رکھا "چند دن میں یہ صنفِ نازک بھی انشاء اللہ بڑے بڑے کام کرنے والی ہے۔"

"کیا۔؟ کچھ اس کے نہ صرف بچپن کے، بلکہ زندگی بھر کے ساتھی کو بھی تو پتہ چلے۔"

آثم بڑی پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"پہلے میری بات تو سن لو۔"

"گرم گرم، تازہ تازہ سموسوں کی بات تھی نا۔" آثم نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"ہائے! میں قربان اثمی۔! اگر تمہارا گرم گرم اور تازہ تازہ سموسے کھانے کو اتنا ہی دل چاہ رہا ہے۔ تو۔ میں بنا کر کھلا دیتی ہوں۔ مجھے بنانا آتے ہیں۔"

آثم زور سے ہنس پڑا۔

"صنو! تم پھر رومانس۔ . ."

"نہیں۔ نہیں۔ بس چپ۔" صنم نے اپنا ہاتھ آثم کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ "بڑی سنجیدہ بات ہے اثمی۔"

"تو کہو نا میری جان۔!" آثم نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ صنم کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ جلدی سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔

"اور وہ سموسے ایک عورت، بناتی ہے۔ ایک دن ہم چاروں سہیلیاں سموسے کھا رہی تھیں۔ اس کے پاس ہی بیٹھ کر۔ کرن بڑی شریر ہے۔ سموسوں کا مزہ آیا تو شوخی بھرے لہجے میں اس عورت سے کہنے لگی۔

"کیا سموسے بنانا تمہارا آبائی پیشہ ہے۔ بڑے مزے کے بناتی ہو۔"

"آبائی پیشہ۔؟" آثم زور سے ہنس پڑا۔ "اس بے چاری کے تو کچھ پلے نہیں پڑا ہوگا کہ کرن کیا کہہ گئی۔"

"ہمارا بھی یہی خیال تھا۔ مگر جب اس نے بڑے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "بی بی۔ میرا آبائی پیشہ تو ماں باپ اور بھائیوں کو لاڈ دکھانا اور شادی کے بعد میاں سے نخرے اٹھوانا تھا۔ یہ سموسے بنانا تو مقدر نے میری پیشانی پر لکھ دیا ہے؟" ہم سب لڑکیاں دنگ رہ گئیں۔

"اُمی۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور خاصی سمجھدار عورت تھی۔"

"حیرت کی بات ہے۔"

"بہت حیرت کی۔ تب کرن ہی کے اصرار پر اس نے اپنی بپتا ہمیں سنا ڈالی۔ وہ ایک بہت امیر اور صاحب جائداد باپ کی بیٹی تھی تین بھائیوں کی صرف ایک بہن۔ شادی بھی اس کی اچھے پڑھے لکھے گھرانے میں ہوئی۔ مگر مقدّر کا کوئی نہیں مٹا سکتا۔ شادی کے آٹھ سال بعد وہ بیوہ ہو گئی۔ ایک جیٹھ اور ایک دیور تھا۔ شروع میں کچھ عرصہ انہوں نے اس کی کفالت کی مگر تابہ کے۔ پھر ان کا بھی ہاتھ کھنچنے لگا۔ اس پر خرچ کیے جانے والا اک اک پیسہ دیورانی اور جیٹھانی کو کھٹکتا تھا۔ وہ اور ہی طرح کے معنی پہنانے لگیں۔"

"اور طرح کے کیا مطلب۔؟"

"مطلب یہ کہ اس کے کردار پر کیچڑ اچھالنے لگیں۔ تب۔ اس غیرت مند نے خود ہی جیٹھ اور دیور سے کچھ لینے سے انکار کر دیا۔ پانچ سات مہینے زیور اور قیمتی قیمتی چیزیں وغیرہ بیچ بیچ کر گزارہ کرتی رہی۔ مگر دو بچوں کا اور اپنے پیٹ کا تنور روز ہی ایندھن مانگتا۔ آخر سب کچھ ختم ہو گیا۔ تو اس نے محنت مزدوری کرنا چاہی۔ وہ دیور اور جیٹھ جیٹھانی نے کرنے نہ دی کہ ان کے خاندان کے نام پر بٹہ لگتا تھا اس میں ان کی عزت نہ تھی۔ یوں سسرال گھر سے مجبور ہو کر وہ میکے آ گئی۔"

"تین بھائیوں کی لاڈلی بہن تھی۔ اور جائداد والے باپ کی بیٹی۔ وہاں کچھ سکھ ملا ہوگا۔"

"یہی تو افسوس کی بات ہے۔ والدین کے بعد بھائی ہر چیز پر قابض ہو چکے تھے اور بھائیوں پر قبضہ ان کی بیویوں کا تھا۔ چند دن آرام سے گزرے۔ پھر بھابھیوں کو ان تینوں کا وجود دیمک کی طرح دکھائی دینے لگا۔ جو اندر ہی اندر ان کو کھائے جا رہا تھا۔ اور بیوگی کوئی چار دن کا معاملہ نہیں ہوتا۔ وہ تو سدا کا روگ تھا۔"

"لیکن باپ کی جائداد پر اس کا بھی تو حق تھا۔"

"یہی تو اصل بات تھی اُمی! جو میں تم کو بتانا چاہ رہی تھی۔ اگر باپ کی جائداد میں سے بیٹی کو شرع کی رو سے حصّہ مل جاتا تو وہ بڑے باعزت طریقے سے اپنی بیوگی کاٹ سکتی تھی۔ اور بن باپ کے یتیم بچّوں کو اچھی طرح پال سکتی تھی۔ لیکن۔ ان کے خاندان میں نسلوں سے بیٹیوں کو جائداد میں سے حصّہ دینے کا رواج نہیں ہے۔"

"عجیب رواج ہے۔؟"

"ہمارے ملک کے سارے دیہاتوں میں یہی رواج چلتا ہے۔ اکثر شہروں میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ جہیز ڈھیر سارا دے دیں گے۔ ساری عمر عید بقرعید کے نام پر تحفے بھی بھائی بہنوں کو دیتے رہیں گے۔ مگر جائز طور پر جائداد یا زمین میں سے حصّہ کبھی نہیں دیں گے۔"

"پھر اس عورت کا کیا بنا۔؟"

"بننا کیا تھا۔؟ بھابھیوں کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو کر یہاں آ گئی ہے اور اب ہماری ٹک شاپ پر سموسے بناتی ہے اور بچوں کو تعلیم دلا رہی ہے۔ سارا سارا دن آگ کے سامنے بیٹھ کر جھلستی ہے۔ شرع کی رو سے کافی جائداد کی مالک ہو کر بھی اک ملازمہ جیسی حیثیت میں جی رہی ہے بے چاری۔ دیکھو نا۔ کیسا خراب زمانہ ہے لوگ اپنے بنائے ہوئے رسم و رواج کو شرع پہ فوقیت دیتے ہیں۔"

"ہاں۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔"

"اور اب میں کتنے دنوں سے ہی یہی سوچ رہی ہوں۔ کہ اس بے چاری کی کس طرح مدد کروں۔"

"سنو میری پگلوسی صنم کی بات ۔ تم اس کی مدد کیسے کر سکو گی۔؟"

"یہی تو سوچنے کا معاملہ ہے اثمی جی! جن لوگوں میں طاقت نہیں ہوتی، جن کے پاس دولت نہیں ہوتی، اس کا مطلب ہے وہ اپنے حق حقوق گنوا بیٹھتے ہیں ۔"

"اس میں طاقت اور دولت کہاں سے آگئے۔؟"

"طاقت اور دولت یوں آگئے کہ اک کمزور سی عورت کی بجائے طاقتور مرد ہوتی وہ، تو دھونس سے، لڑائی جھگڑے سے بھی اپنا حق لے لیتی۔ دولت پاس ہوتی تو چپ چاپ جا کر مقدمہ دائر کر دیتی۔"

"دولت ہوتی بھی تو وہ مقدمہ دائر نہ کرتی۔ کیونکہ ان کے ہاں رواج یہی ہے کہ بہنیں حصّہ نہیں لیتیں۔"

"وہ نہ کرتی۔ مگر میں کرواتی اثمی! میں کرواتی ۔ اس غلط قسم کے رواج کے خلاف میں اس کے بھائیوں کو اس کے ذریعے عدالت میں کھینچ لاتی۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم دونوں ہی بے چاری بے بس اور مجبور عورتیں ہیں۔ نہ دنگا فساد کر سکتی ہیں اور نہ رقم خرچ۔"

"رقم میں دیتا ہوں۔" اثم مسکرانے لگا۔ "مگر وہ عورت تمہیں مقدمہ کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ اس لیے کہ اسے بھی اپنے خاندان اور اپنے بھائیوں کی عزت عزیز ہو گی، وہ اپنے باپ کے نام پر اس کی موت کے بعد بھی انگلی اٹھتی دیکھنا گوارا نہیں کرے گی۔ ہمارے ہاں کی عورت یوں ہی باپ بھائیوں کی عزتیں بچاتی بچاتی خاک ہو جایا کرتی ہے۔"

"مطلب یہ کہ ۔ جس طرح وہ زندگی گزار رہی ہے۔ گزارتی رہے۔؟"

"تو میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔؟"

"بس ۔ اچھے سے اچھا کھا کر، ٹرانسسٹر لگا کر، بڑھیا سگریٹوں کے کئی پیکٹ پھونک کر ۔ بڑی شان سے لان میں لیٹ کر صرف سوچ ہی سکتے ہو۔"

"طعنہ نہ دو صنم ۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا۔ کہ انسان صرف اپنی ذات کے لیے جیا تو کیا جیا ۔"

"یہی میں بھی کہہ رہی ہوں ناکہ صرف سوچتے ہی نہ رہو۔ اس کے علاوہ بھی بہت سارے مسائل ایسے ہوتے ہیں جو نہ طاقت سے حل کیے جا سکتے ہیں اور نہ دولت کے بل پر مقدمہ بازی وغیرہ کر کے ۔ ان کے لیے حکمت عملی چاہیے اور ہمارے دیہاتوں میں خصوصاً بہت سے معصوم لوگ بستے ہیں۔ تعلیم ان کے پاس نہیں۔ تعلیم نہ ہونے سے عقل کا بھی فقدان ہوتا ہے۔ وہاں حکمت عملی کہاں سے آئے گی ۔ پھر زندگیاں تباہ ہوتی ہیں ۔"

"ہاں ۔ یہ تو بات ہے ۔"

"اب اسی کا معاملہ لے لو۔ وہ کسی سے مدد بھی نہیں لے گی ذرا سہولت سے، اگر باپ کی جائداد میں سے اسے اس کا جائز حصّہ مل جاتا ۔ تو ۔ وہ بہتر زندگی گزار لیتی۔"

"یہ بھی درست ہے ۔"

"اثمی ۔! کہاں ہو بیٹے ۔؟"

امی بیگم نے آواز دے کر دونوں ہی کو چونکا دیا۔ جلدی سے ایک دوسرے سے پرے پرے ہٹ کر بیٹھ گئے۔

"جی ۔ امی بیگم ۔! میں یہاں ہوں ۔"

وہ دور برآمدے میں کھڑی تھیں ۔

"اچھا۔ صنو تم بھی سوچو ۔ میں بھی اسی لائن پہ سوچتا ہوں۔ شاید اپنے علاوہ بھی ہم کسی کے کام آسکیں ۔"

"شاید کیوں ۔ بو انشاء اللہ یقیناً۔"

آثم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اس عورت کی تو میں ضرور مدد کرونگی۔"

"اور ہم صنو! تیرے بچپن یا جوانی کے ہی نہیں پوری زندگی میں اٹھنے والے ہر ہر قدم کے ساتھی ہیں۔" آثم نے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔

"پگلو! میں نے تو سوچ بھی لیا ہے کہ کس طرح اس کا حق اسے دلائیں گے۔"

"سچی اثمی۔۔۔؟"

"اثمی بیٹے۔ آؤ دیکھو تو۔ کون آیا ہے۔۔۔؟" امّی بیگم خوشی سے بھرپور آواز میں کہہ رہی تھیں۔

"کون آیا ہے امّی بیگم۔۔۔؟"

"ادھر تو آؤ۔ وہیں سے پوچھے جا رہے ہو۔"

"آؤ صنو! دیکھیں کون آیا ہے۔" وہ قدرے آواز دبا کر صنم سے مخاطب ہوا۔ "چل تو جلال تو۔"

"ارے یہ چل تو جلال تو کا وظیفہ کیوں کیا جا رہا ہے۔۔۔؟" صنم اس کی پھیلی بکھری چیزیں سمیٹتے ہوئے مُسکرا کر پوچھنے لگی۔

"اس لیے کہ ڈھیر سارے دن رہنے والا کوئی مہمان نہ ہو۔ ہماری آزادی ختم ہو جائے گی۔" ٹرانسسٹر اور سگریٹ اثم نے اٹھا لیے۔ اور دونوں ہی ساتھ ساتھ برآمدے کی طرف چل پڑے۔

"تم پر اثمی! کوئی بھی پابندی نہیں لگا سکتا۔" صنم مسکرائی۔

"اور تم تو جیسے بڑی پابندیاں قبول کر لیتی ہو۔"

"کیوں کروں۔۔۔؟ یہ میرا گھر ہے۔ تم میرے اثمی ہو۔ وہ میری امّی بیگم ہیں۔ اور ابّا میاں بھی میرے ہیں۔ پھر مجھ پہ یہاں کے متعلق کوئی پابندی کیوں لگے۔"

"اچھا جی۔" آثم صرف پیار سے اسے دیکھ ہی سکا۔ مزید کوئی بات نہ کر سکا۔ وہ برآمدے کے قریب جا پہنچے تھے۔

"صنم بھی یہیں ہے۔" امی بیگم بڑی نرمی سے بولیں۔ "بیٹی۔ اثم ذرا سر پہ دوپٹہ وغیرہ اوڑھ کر آنا۔"

"آخر کون سی آفت آ گئی ہے۔۔۔؟" آثم قدرے الجھ سا پڑا۔

"کیا بک رہے ہو۔۔۔؟ تمہاری نانی اماں آئی ہیں۔"

"او ئے ہوئے۔ مارے گئے۔" آثم بڑبڑایا۔

صنم نے ہنستے ہوئے سر پہ دوپٹہ اوڑھ لیا۔

گو ان سے ملنے کا صنم کا پہلا اتفاق تھا۔ مگر اس نے آثم کی زبانی ان کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ بہت بوڑھی تھیں۔ ستر اسی سال کے قریب ان کی عمر ہو گی۔ امی بیگم ان کی آخری اولاد تھیں۔ ان سے بڑے ان کی چار بیٹیاں اور پانچ بیٹے۔ پورے دس بچوں کی ماں تھیں۔

سب سے بڑا ان کا بیٹا تو پوتوں نواسوں والا تھا۔ اور وہ اس کے پاس ہی رہا کرتی تھیں۔ اپنے آبائی گھر میں۔ اور اب امی بیگم نے کئی خط لکھ لکھ کر انہیں بلایا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ انہیں کے صلاح مشوروں سے آثم کی شادی کی تیاریاں کریں۔ بیٹیوں کی شادیاں تو وہ اپنی زندگی میں بھگتا چکی تھیں اور امی بیگم کا یہ پہلا اور آخری کام تھا۔ تجربہ بھی نہیں تھا اور وہ بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت سے بھی کرنا چاہتی تھیں۔

گویا چار چھ مہینے سے بڑھ کر بھی ان کا قیام یہاں ہو سکتا تھا۔ آثم ان سے گلے مل ہی رہا تھا کہ امّی بیگم نے یہ سب کچھ اسے بتا دیا۔ اور۔ نانی اماں کی بینائی اب بھی اس عمر میں بھی اتنی تیز تھی اور حواس اتنے بجا، کہ آثم کو گلے ملتے ملتے اس کے کندھے کے اوپر سے صنم کو بھی غور سے دیکھ لیا۔ "اے ساجدہ! یہ لڑکی کون ہے؟"

"یہ ہمارے ساتھ والے نیازی صاحب کی سب کی بڑی بیٹی صنم ہے۔"

"ادھر آؤ بیٹی۔۔۔!" حکم کے ساتھ ساتھ ان کے لہجے میں پیار بھری نرمی بھی تھی وہ سہمی سہمی سی ان کے پاس چلی گئی۔ آثم دو قدم پرے ہٹ کر کھڑا صنم کا تماشہ

دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"ماشاء اللہ بڑی پیاری ہے۔ لیکن بیٹی! یوں منہ اٹھائے ادھر نہ آجایا کرو، جوان لڑکے والا گھر ہے۔"

"ہائے، ہائے! اماں! کیسی باتیں کرتی ہیں۔ صنو تو یہیں پلی بڑھی ہے ہماری اپنی بیٹی کی طرح ۔۔۔ یہ اسی گھر کو اپنا سمجھتی ہے۔ اور اگر کسی دن یہ ادھر نہ آئے تو ہم دونوں کو گھر اجاڑ ویران دکھائی دیتا ہے۔" امی بیگم نے بڑی پیار بھری نگاہوں سے صنم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ آثم صنم اور نانی اماں کو دیکھ دیکھ کر مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔

"اے آثمی بیٹے۔ تو کیا ٹکر ٹکر دیکھ رہا ہے"۔ نانی اماں کی بات پر وہ چونکا۔

"جب لڑکے جوان ہو جائیں تو انہیں نگاہ نیچی رکھنی چاہیئے۔"

"چھوڑیئے بھی اماں! اب گھر میں ہی نگاہیں نیچی رکھنے کے لیے سبق تو نہ دینے لگیں۔"

بھئی جوان لڑکی جو گھر میں آتی جاتی . . ."

"صنو۔" امی بیگم نے جلدی سے صنم کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "جا بیٹی! باورچی خانے میں جا کر کلابو کو کہہ دے کہ چائے تیار ہو گئی ہو تو لے آئے۔"

امی بیگم کیسی نبض شناس تھیں۔ اک گھڑی کو اور وہ یہاں سے نہ جاتی تو نانی اماں کی باتوں نے اسے یقیناً بے ہوش کر دینا تھا۔ وہ بھاگنے کے انداز میں تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے نکل گئی۔ آثم بھی پیچھے پیچھے چلا۔ اس کے ہونٹوں پر شوخ سی مسکراہٹ تھی جو صنم کو چھیڑنے والے اس کے ارادے کی غمازی کر رہی تھی۔

"تم کہاں جا رہے ہو۔؟ پیچھے سے نانی اماں نے پکار لیا۔ تو وہ گڑبڑا سا گیا۔

"جوان لڑکیوں کے پیچھے جانے کی عادت اچھی نہیں ہوتی۔؟"

آثم کے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔

"اللہ میاں ۔۔۔! تو ہمیں اور ہمارے راز و نیاز کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا یہ نانی اماں تو دلوں کے حال جاننے والی کوئی نجومن معلوم ہوتی ہیں۔!!"

O

کئی دن سے اس نے اچھی طرح کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا۔ نہ وقت پر سوئی تھی نہ جاگی تھی۔ نہ ہاتھ منہ دھوئے تھے۔ نہ کنگھی چوٹی کی تھی۔ اور نہ ہی لباس وغیرہ تبدیل کیا تھا۔ الجھے الجھے بالوں، ملگجے سے لباس اور اپنے گدلے گدلے وجود کو لئے بیٹھی وہ پھر رو رہی تھی۔

آنکھوں پہ ورم آ گئے تھے۔ گلابی گالوں والے چہرے پر زردیاں کھنڈی تھیں۔ گلاب کی تازہ پنکھڑیوں جیسے نرم و ملائم ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی تھیں اور وہ بے رنگ سے ہو کر کپکپا رہے تھے۔

وہ تو ہر دم بہت اجلی اور صاف ستھری رہا کرتی تھی۔ اس کی اپنی طبیعت اور مزاج میں نفاست بہت تھی ۔۔۔ اتنی ۔۔۔ کہ غریبی سرپرستی میں بھی ہمیشہ پاکیزہ اور دن کے اجالوں کی طرح صاف اور روشن دکھائی دیتی تھی۔ اوپر سے اس کی امی بیگم بتا گئی تھیں کہ آثم خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا، اور پسند بھی ایسے ہی نفاست طبع لوگوں کو کرتا تھا

اس کے آثم کی پسند اور وہ اس کا دھیان نہ رکھے ۔۔۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کی زندگی کا ہر ہر لمحہ آثم کے تصور میں گزرتا تھا۔ اس کے ہر سانس کا مالک و مختار وہی تھا پھر وہ کیسے نہ ہر بات ہر کام میں اس کی پسند ناپسند کو ملحوظ رکھتی۔ مگر۔ یہ حادثہ تو جیسے اسکے ذہن سے سب کچھ مٹا گیا۔ تن کا ہوش نہیں تھا تو من کا بھی ہوش باقی نہ رہا۔

گو امی کی اپنی حالت بڑی خستہ سی ہو رہی تھی مگر وہ برداشت اور حوصلے والی تھیں۔ زندگی میں اتنی پریشانیاں، اتنے دکھ، اتنے غم ملے تھے کہ کاشف کے ساتھ گزرنے والا یہ واقعہ بھی انہیں کا ایک حصہ معلوم ہو رہا تھا۔

لیکن ۔ دھنک نے اپنی زندگی میں یہ پہلا غم دیکھا تھا اور وہ بھی ایسا، کہ اس کے خیال میں اس سے بڑا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ابا کا انتقال ہوا تو وہ بالکل ناسمجھ تھی

پھر جب ہوش سنبھالا راحتوں اور دکھوں میں تمیز کرنے کا شعور آیا تو کاشف اپنی ذات سے اک خوب صورت اور مکمل تحفظ دینے والا سائبان بن کر اس کے سر پر تن گیا۔

کوئی فکر، کوئی پریشانی، اس نے کبھی اس کے قریب بھی نہ پھٹکنے دی۔ یہاں تک کہ دھنک کی اپنی ہی کسی غلطی پر امی سے جھڑکیاں پڑتیں۔ تو تب بھی وہ اس کے لیے ڈھال بن جاتا۔

اور۔۔۔ اسی کے کاشی جی کا وہی غمگسار، ہمدرد اور چارہ ساز وجود اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ وہ اسے اردگرد کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تین دن اور تین راتیں گزر گئی تھیں۔ جیسے تین صدیاں۔ تین زمانے بیت گئے تھے۔ اور وہ تو اپنی اتنی زندگی میں اس سے کبھی ایک رات بھی جدا نہیں ہوئی تھی۔

عجیب سا ہی غم اسے ملا تھا نا۔ دنیا بھر کے غموں سے انوکھا اور نرالا۔

اس کے کاشی جی کا بازار میں دو غنڈوں کے ساتھ جھگڑا ہوا۔ ان میں سے ایک قتل ہوگیا اور قاتل اس کے کاشی جی کو ٹھہرایا گیا۔ کاشی جی۔ جو اتنا نرم دل رکھتے تھے۔ جو بے حد مخلص اور بے ضرر سے تھے۔ وہ ایک انسان کے قاتل بن گئے تھے۔

اس کا دل یہ بات تسلیم کرنے پر کسی بھی طرح راضی نہیں ہو رہا تھا۔ مگر فی الحال حقیقت یہی تھی۔ کاشف حراست میں تھا اور مقتول کے لواحقین اسے زیادہ سے زیادہ سزا دلوانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

سارے بازار میں اس سرے سے اس سرے تک انہیں کے تذکرے تھے۔ اس وقت اس کا غم اور بھی سوا ہو جاتا۔ جب ہر زبان سے اپنا ذکر سنتی۔ ہمسائیاں، پڑوسنیں کچھ سن گن لینے کے لیے بظاہر افسوس کا اظہار کرنے کو آجاتیں۔ پھر بیٹھ کر خوب باتیں ہوتیں۔ بڑی طعن بھری باتیں۔ بڑے ذومعنی سے فقرے کسے جاتے۔ بڑی عجیب عجیب سی نگاہوں سے اسے گھورا جاتا۔ تب وہ اور روتی۔ چیخیں مار مار کر روتی۔

اس کی طرف تو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھتا تھا تو کاشی جی اس کی آنکھیں نکالنے کو تیار ہو جایا کرتے تھے۔ اور اب۔ اک وہ نہیں تھے تو ہر ایرے غیرے کی نگاہ میں وہ

تھی اور زبان پر اس کا تذکرہ۔ کیا عورتیں۔ کیا مرد۔ گھروں میں۔ دکانوں کے تھڑوں پر۔ اک یہی داستان تھی۔ اک یہی قصہ تھا۔ کیسی ذلت تھی۔ کیسی رسوائی تھی۔!!

اور یہ سب کچھ جو ہوا۔ اس میں قصور اس کا کتنا تھا۔؟ وہ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی گناہگار بنی جا رہی تھی۔ وہ اتنی پاک باز، معصوم اور مقدس تھی۔ کہ ان سب باتیں بنانے والوں میں بھی ایسا کوئی نہ ہوگا۔ مگر پھر بھی اس وقت وہ خود کو جیسے اس دنیا کا سب سے زیادہ داغدار وجود متصور کر رہی تھی۔

"گڑیا۔!" میٹھے سے لہجے میں مردانہ بھاری سی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ تو اسے یہی محسوس ہوا جیسے کاشف اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

"کاشی جی۔! یہ کیا ہو گیا۔؟ یہ کیا ہو گیا کاشی جی۔؟!"

وہ یکایک اٹھ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ لیکن۔ اس کی خوشبو، اس کے پرخلوص لمس کی حرارت اجنبی سی لگی۔ یہ تو اس کے بھائی کا ہمدرد وجود نہیں تھا۔ دھنک نے جیسے ہوش میں آتے ہوئے سر اٹھا کر نگاہیں اٹھائیں۔

ارے! وہ تو شہزاد تھا۔ جیسے اسے کئی بچھو یکدم چمٹ گئے۔ وہ چیخ کر پیچھے ہٹی۔

"تم۔ تم یہاں کیوں آئے۔؟ چلے جاؤ یہاں سے۔ تمہاری وجہ سے ہی یہ سب کچھ ہوا ہے۔ میرے کاشی جی مجرم بن گئے۔ ہم رسوا ہو گئے۔ ہر زبان پر ہمارا ذکر ہے ہم بدنامی کے عمیق ترین گڑھے میں گر گئے۔ کیا ابھی کوئی کسر باقی ہے جو تم پوری کرنے آگئے ہو۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ نکل جاؤ ہمارے گھر سے۔"

وہ وحشیانہ انداز میں چیخے جا رہی تھی۔ امی اس کی چیخوں کی آواز سن اندر آگئیں۔

"تم نے ہماری خوشیاں چھین لی ہیں۔ تم نے ہمارا چین لوٹ لیا ہے۔ جب تک تم ہماری زندگی میں نہیں آئے تھے۔ ہمارے پاس عزت بھی تھی۔ وقار بھی تھا اور سکون بھی تھا۔ میں کہہ رہی ہوں چلے جاؤ یہاں سے۔ لٹیرے!۔ ڈاکو۔" اس کی پھیلی پھیلی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی اور شہزاد اس کے سامنے گردن جھکائے چپ چاپ کھڑا تھا۔

اس کی ہر بات بڑے صبر اور حوصلے سے سن رہا تھا۔ امّی نے یہ نظارا دیکھا تو لپک کر قریب آگئیں۔

"کیا ہو گیا دھنک ۔۔۔! یہ کیا بکے جا رہی ہو۔ کچھ عقل کرو ۔۔" امّی نے اسے کندھوں سے تھام کر ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی۔ "یہ تم اس انسان کی شان میں ایسے نازیبا کلمات زبان سے نکال رہی ہو ۔۔۔ جو ہر مشکل کے وقت میں ہمارے کام آتا ہے۔"

"ہماری عزت اِسی نے لوٹی ہے۔ ہمارا سکون اسی کی وجہ سے تباہ ہوا ہے۔ میرے کاشی جی اسی کی وجہ سے آج جیل میں پڑے ہیں ۔۔" وہ پھر ہذیانی انداز میں چیخی۔ "پھر بھی آپ کہہ رہی ہیں کہ اس کو کچھ نہ کہوں۔ میرا بس چلے تو میں نہ صرف یہ کہ اس کو کھڑے کھڑے اپنے گھر سے نکال دوں بلکہ اس کی جان ہی لے لوں۔"

ایسے شریف اور مخلص انسان کی شان میں وہ کیسی کیسی گستاخیاں کیے جا رہی تھی، امّی کو غصّہ آگیا۔

"احسان فراموش ۔ بے فیض ۔۔۔!!" چٹاخ چٹاخ تین چار تھپڑ امّی نے اس کے رخساروں پر جڑ دیئے۔ "پھر کرو گی ایسی بکواس ۔۔"

"نہیں نہیں ۔۔" شہزاد تڑپ کر آگے بڑھا اور امّی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ "یوں سختی نہ کیجیے ۔۔۔ یہ اپنے ہوش و حواس میں کب ہے۔ دیکھ نہیں رہیں، صدمے کی وجہ سے اس کی حالت کیا ہو رہی ہے۔"

"کاشی جی۔ ! کاشی جی کہاں ہیں آپ ۔۔؟" دونوں رخساروں پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بالکل بچوں کی طرح زور زور سے رونے لگی۔

"دیکھیے امّی مجھے مار رہی ہیں۔ آپ نہیں ہیں تو میرے ساتھ کیسا سلوک ہو رہا ہے آپ امّی کو مجھے جھڑکی تک دینے نہیں دیا کرتے تھے اور کاشی جی دیکھیے یہ مجھے مار رہی ہیں۔ کاشی جی۔ کاشی جی ۔۔" وہ بلک بلک کر روئے جا رہی تھی۔

"حوصلہ کرو گڑیا۔ ! میں بہت جلد تمہارے کاشی جی کو تمہارے پاس لے آؤں گا

میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے بے گناہ ثابت کرنے کے لیے جو کچھ بھی کرنا پڑا میں کر گزروں گا۔ میں اپنا سب کچھ تمہارے کاشی جی پر نثار کر دوں گا۔ میں خود اس کا مقدمہ لڑوں گا، بڑے بڑے وکیلوں سے مشورے کروں گا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ جب تک اسے بری نہ کرا لوں گا۔ چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

"دیکھ ۔ اپنی طرف بھی اور اس کی طرف بھی ۔ وہ تیرے بھائی کی خاطر اپنا دھن دولت تو کیا جان تک لٹا دینے کو تیار ہے۔ اور تو اُسے کیا کہے جا رہی ہے ۔"

گڑیا کی سسکیوں میں اب چیخوں کی گونج نہ تھی۔ ہولے ہولے قدرے مدھم پڑتی جا رہی تھیں۔

"ان پچھلے تین دنوں کا اک اک لمحہ میں نے کاشف کی ضمانت کرانے کی کوشش میں صرف کیا ہے ۔"

"پھر ۔۔؟" امی کی بے قرار نگاہیں کسی امید پر شہزاد کے چہرے پر جا ٹکیں۔ اسی لمحے دھنک نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا تے۔

"ضمانت نہیں ہو سکی ۔۔" شہزاد کا سر جھک گیا۔ "ویسے آپ فکر نہ کریں میں اسے وہاں ہر سہولت پہنچانے کی اپنی پوری کوشش کروں گا۔"

"میرے دل کو ہول اٹھ رہے ہیں بیٹے، ہم کیا کریں گے، تنگدستی اور اوپر سے یہ پریشانی، کاشف کے مقدمے پر کیا لگائیں گے اور گھر کس طرح چلائیں گے۔"

"امّی ۔ !" شہزاد نے بڑی شاکی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ "میرے ہوتے ہوئے بھی آپ پریشانیوں اور فکروں کو اپنے اوپر مسلط کرتی ہیں۔ میں نے کہا نا کہ اپنا سب کچھ کاشف پر لگا دوں گا۔ اور آپ اور گڑیا . . . "

"مجھے گڑیا مت کہو ۔" دھنک پھنکاری۔ "میں صرف کاشی جی کی گڑیا ہوں ۔"

گو وہ سب کچھ سن رہی تھی مگر جیسے ابھی تک اس کے دماغ سے وحشت کا اثر کم نہیں ہوا تھا۔

"بدتمیز ۔ !" امّی نے اسے پھر ڈانٹا۔ وہ اپنے پلنگ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ امّی جانے کس ارادے سے پھر اس کی طرف لپکیں۔

"نہیں، نہیں۔" شہزاد جلدی سے ڈھال کی طرح دھنک کے آگے آکھڑا ہوا۔ "اسے کاشف کے ساتھ بہت پیار ہے۔ اسی لحاظ سے صدمے کا اثر بھی اتنا شدید ہوا ہے۔"

"لیکن یہ اب بچّی تو نہیں۔ اسے زمانے کی اونچ نیچ کو سمجھنا چاہیے۔"

"سمجھ جائے گی۔"

"سمجھ جائے گی۔" گڑیا نے منہ میں بڑبڑا کر شہزاد کی نقل اتاری۔ "میری طرفداری کرنے والا یہ پتہ نہیں کون ہوتا ہے۔" اس کے دل میں شہزاد کے لیے اس وقت ڈھیروں ڈھیر نفرت تھی۔ جس کا اظہار وہ یوں بڑبڑا کر اور بدمزاجی کے ساتھ پیش آکر کر رہی تھی

ان کے خاندان پر یہ جو نحوست پھیل گئی تھی اس کا ذمّہ دار سراسر وہی تھا۔ نہ وہ ہر وقت ان کے گھر میں آیا رہتا، نہ لوگ دیکھتے اور باتیں بناتے اور پھر نہ کاشی جی سنتے اور انہیں غصّہ آتا اور یہ سب کچھ ہوتا۔ وہ لاکھ ان سے ہمدردی جتاتے۔ لاکھ انہیں تسلیاں دلاسے دے۔ مگر جو دکھ، جو صدمہ ان پر ٹوٹ پڑا تھا وقتی طور پر اس پہاڑ کے بوجھ تلے آکر وہ پس تو گئے تھے۔ خاک تو ہو گئے تھے۔

"میں نے ڈیفنس سوسائٹی میں ایک کوٹھی کا بندوبست کیا ہے۔ میرا خیال ہے اس محلے میں آپ کا اور گڑیا کا رہنا اب مناسب نہیں ہے۔" دھنک اپنی سوچ سے ابھری تو شہزاد کی بات اس کے کان میں اتری۔

"لیکن بیٹے۔!" جانے امّی نے کیا کہنا چاہا تھا۔ پوری بات سننے بنا ہی شہزاد نے ان کی بات قطع کر دی۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں امّی۔! اب آپ کو جذباتی پن سے نہیں سوچنا چاہیے بے شک اس گھر کو آپ کے لیے چھوڑنا بڑا مشکل ہوگا۔ مگر اس وقت مناسب یہی ہے کسی بھی مرد کا سائبان آپ کے سر پر نہیں ہے۔"

"میرے کاشی جی کو خدا سلامت رکھے۔" دھنک نے بلند آواز میں بڑبڑا کر اک تیکھی نگاہ سے شہزاد کی طرف دیکھا۔

"میں وقتی بات کر رہا ہوں۔" گڑبڑاتے ہوئے جلدی سے وہ معذرتی انداز میں بولا۔ "گھر میں مرد کی موجودگی اک بہت بڑے تحفظ کی علامت ہوتی ہے اور اس وقت جب کہ سبھی جانتے ہیں کہ کاشف گھر میں موجود نہیں ہے، جوان لڑکی کا ساتھ ہے، یوں بھی ایسی رسوائی کے بعد لوگوں کی نگاہوں میں وہ بات نہیں ہے جو پہلے تھی۔"

"بات تو تمہاری بڑی معقول ہے، سو فیصد درست۔ مگر بیٹے! ڈیفنس سوسائٹی کی کوٹھی کا خرچہ وغیرہ ہم غریب اپنے ناتواں کندھوں پر کیسے اٹھا سکیں گے۔"

"امّی! پھر وہی بات۔ میں نے کہا نا کہ آپ کو کسی قسم کی فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، میں جو آپ کی خدمت کرنے کے لیے ہمہ وقت آپ کا بیٹا موجود ہوں۔!"

"اوہ! شہزاد بیٹے! یہ تمہارے اتنے احسانات، میرا تو سر جھکا جا رہا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ احسان کوئی نہیں۔ آپ ایسا کہہ کر میرے خلوص کو بے خلوص کر دیتی ہیں اور مجھے غیر ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔"

"بیٹے! میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ مولا۔" امّی جھولی پھیلا کر منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگیں مگر آواز اتنی بلند تھی، جو شہزاد کے کانوں میں بھی اتر رہی تھی۔ "تو اسے زندگی میں خوشی دینا۔ پروردگار! کوئی دکھ زندگی میں کبھی اس کے قریب نہ آئے۔ جس طرح اس نے میری سب پریشانیاں خود لے لی ہیں، اسی طرح میرے خدا تو ہمیشہ اس کا مددگار رہنا۔"

"آج آپ ساری تیاری وغیرہ کر لیں کل ہم۔۔۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" دھنک اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑی، ساتھ ساتھ اپنے بھیگے رخسار خشک کر رہی تھی۔ "میں کاشی جی کے گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔"

"کبھی کبھار عقل کی مہار بھی تھام لیا کرو، ہر وقت بے عقلی کے گھوڑے پر ہی سوار رہتی ہو۔" امّی نے گھور کر دیکھا۔ "شہزاد ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہاں ہم بہت بدنام ہو چکے ہیں۔

"بدنام ہو چکے ہیں تو ساری بدنامیوں کے داغ اس وقت مٹ بھی جائیں گے۔ جب کاشی جی بری ہو کر گھر آجائیں گے۔ مجھے یقین ہے میرے کاشی جی نے قتل نہیں کیا۔ وہ ایسے نہیں ہیں۔ یہ ان پر الزام ہے۔" اس کی آنکھیں پھر بھیگنے لگیں۔

"وہ تو میرا دل بھی یہی کہتا ہے۔ مگر سچ جھوٹ کے فیصلے کے لیے بھی تو اک طویل عرصہ درکار ہوگا۔ مقدمہ چلے گا۔ گواہ بھگتیں گے۔ اِدھر سے، اُدھر سے، یوں تمہیں کیا پتہ کہ ان مقدموں میں کتنا وقت لگ جاتا ہے۔ دن ہفتے نہیں۔ مہینے سال بیت جاتے ہیں۔" شہزاد نے نرم لہجے میں گویا اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو کیا پھر اتنا عرصہ میرے کاشی جی گھر ہی نہیں آئیں گے۔؟" اس کی آنکھیں پھر برساتی ندیاں بن گئیں۔

"نہیں نہیں۔ روؤ نہیں۔ دیکھو تو پہلے ہی رو رو کر تمہاری آنکھیں متورم ہو رہی ہیں اور یہ تمہارا حلیہ کیا بنا ہوا ہے۔" شہزاد اسے بہلانے کے لیے پہلے سے بھی زیادہ نرم و ملائم آواز میں بولا۔

"تمہیں حلیے کی پڑی ہوئی ہے اور مجھے کاشی جی یاد آ رہے ہیں۔"

"یہ تمہیں، کیا ہوا۔؟" امّی نے پھر اسے گھور کر دیکھتے ہوئے ٹوکا۔

"کوئی بات نہیں۔ جو جی چاہے کہہ لے۔ میں اس کی کسی بات کا بُرا تھوڑا مانتا ہوں۔"

"تم تو فرشتہ ہو بیٹے۔!" امّی تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"میں تو بس اس کی خوشی چاہتا ہوں۔ یہ ذرا حوصلہ کرے نا۔ انشاءاللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اس سے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد اس کے کاشی جی کو اس کے پاس لے آؤں گا۔ اک بار مجھ پہ اعتبار تو کرے۔"

"وعدہ کرتے ہیں۔؟ بالکل پکّا۔؟" یکایک اس نے شہزاد کی آنکھوں میں اپنی بھیگی بھیگی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ اتنے وثوق سے کہہ رہا تھا۔ چلو اعتبار کر کے دیکھ ہی لے۔ یوں بھی اور ان کا کون تھا۔

دور و نزدیک کوئی بھی تو اپنا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جو سر پر پڑی۔ ان مشکلات کو صرف الفاظ سے ہی حل کرنے کے لیے کہتا۔

"ہاں، ہاں بالکل پکّا۔! ایک مرد کا وعدہ۔" شہزاد کے چہرے پر بڑے خوبصورت سے رنگ بکھر اٹھے۔ "لاؤ ہاتھ۔" دھنک نے اعتبار جیسے پیارے جذبے سے اسے نوازا تھا۔ آپ ہی آپ لہجے میں انداز میں بے تکلفی آ گئی۔ یہ بڑا سا ہاتھ اس کے آگے پھیلائے کھڑا تھا۔ "لاؤ نا۔ ہاتھ ملا کر وعدہ پختہ کر لو۔ تاکہ کہیں مکر نہ جاؤں۔"

دھنک کتنے ہی لمحے اس کے پھیلے ہاتھ کو دیکھتی رہی۔ پھر نگاہ اٹھا کر اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

"ہاں بیٹی! شہزاد کو بھی کاشی ہی کی طرح اپنا بھائی سمجھو۔ ملا لو ہاتھ، بہن کے ساتھ کیے گیے وعدے کا پھر زیادہ خیال رکھے گا۔"

دھنک نے جھجکتے جھجکتے اپنا لرزتا، کانپتا نازک سا سفید ہاتھ اس کے مردانہ بڑے سے مضبوط ہاتھ پر رکھ دیا۔ صرف اپنے کاشی جی کی خاطر۔ ورنہ۔ لاکھ وہ کاشف کا دوست تھا۔ ہر وقت اس کا گھر میں آنا جانا تھا۔ مگر تھا تو وہ نامحرم۔ اور وہ خود کسی اور کی امانت۔!!

شہزاد نے اسے جلدی سے اپنی گرفت میں لے کر زور سے دبایا۔

"لیجیے امّی! آپ کے سامنے پکا وعدہ ہو گیا۔" پھر اس نے زور زور سے کئی جھٹکے دے ڈالے۔ "تو اب مسکرا دو۔"

وہ سر جھکائے چپ رہی۔

"یہ رونا دھونا ختم کرو۔ ہاتھ منہ دھوؤ۔ لباس صاف ستھرا پہنو۔ چلو شاباش۔!" شہزاد اسے بالکل کاشی کے سے انداز میں سمجھا، بہلا رہا تھا۔ "اگر اس وقت تمہاری ساس یہاں آ جائے تو تمہارا یہ حلیہ دیکھ کر تمہیں یقیناً کوئی اور ہی مخلوق سمجھے اور پھر ڈر کر بھاگ جائے۔"

"اوں! آپ بھی شہزاد بھائی کاشی جی جیسی باتیں کرنے لگے۔"

"بھئی بھائی والی ٹھیک نہیں۔ مجھے تو تمہارا کاشی جی والا طرزِ تخاطب پسند ہے"

"ہاں بیٹی! شاہی جی کہہ لیا کرو۔ کاشی جیسا ہی ہے نا یہ بھی۔ بلکہ میں تو سمجھتی ہوں کہ ہمارے لیے اس کے دل میں اس سے بھی زیادہ درد ہوگا۔"

"نہیں نہیں۔ میرے کاشی جی جیسا کوئی نہیں ہو سکتا۔" اس کی آنکھیں پھر نم ہونے لگیں۔

"پھر دماغ میں کوئی کیڑا کلبلایا۔" امّی کو یکایک ہی طیش آگیا خاصی برہمی سے بولیں

"ہاں جی ہاں۔" شہزاد اسے بہلانے کے لیے جلدی سے اس کی حمایت میں بول پڑا۔ "میں کاشی جی جیسا نہیں ہو سکتا۔ دھنک ٹھیک کہہ رہی ہے۔"

وہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ پلنگ کے کونے پر اس کے کچھ کاغذات پڑے تھے جھک کر انہیں اٹھاتے ہوئے بولا۔ "کل سہ پہر کو امّی! پھر تیار رہیئے گا۔"

"میں تو بیٹے تیار ہو جاؤں گی، مگر یہ بڑی ضدی ہے۔ اگر اپنی بات پر اڑ گئی تو۔"

"نہیں امّی۔ ضدی بے شک ہو گی۔ مگر مجھے یقین ہے یہ بے وقوف نہیں ہے، وقت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم کچھ دیر کے لیے یہ گھر چھوڑ دیں۔ اچھے کرایہ داروں کا بندوبست کر دوں گا۔ کرایہ آجایا کرے گا۔"

"اور اُدھر دینا بھی تو پڑے گا۔ شاید اس سے کہیں زیادہ۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ کوٹھی بس اپنی ہی سمجھیے۔" دھنک کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے امّی کو جواب دیا۔

"میں کس طرح تمہارے احسانوں کا بدلہ چکاؤں گی شہزاد بیٹے۔!" احسان مندی کے بھاری بوجھ سے جیسے امّی کا سر جھک سا گیا۔ "مجھے تو کئی جنم بھی مل جائیں تو شاید۔"

"امّی! پلیز امی۔!" شہزاد نے ان کے سامنے سر جھکا دیا۔ "مجھے آپ اپنا حقیقی بیٹا سمجھا کیجیے۔"

امّی نے اس کے جھکے ہوئے سر کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

O

نانی اماں کیا آئیں گویا دنیا جہان کی رونقیں اور برکتیں سمٹ کر اس گھر میں آگئیں صنم کے نہ نانا نانی حیات تھے اور نہ دادا دادی۔ اس کی سب چھوٹی بہنوں کو جب اسی کی زبانی آثم کی نانی اماں کی آمد کی اطلاع ملی تو سبھی اک عجوبے کی طرح برف جیسے سفید بالوں اور بغیر دانتوں کے منہ والی ایک سرخ و سفید سی بوڑھی عورت کو دیکھنے کے لیے آگئیں۔

نانی اماں اس بڑھاپے میں بھی بڑی زندہ دل تھیں۔ ساتھ ہی بڑی بااخلاق اور انتہائی نرم طبیعت کی مالک بھی تھیں۔ اپنے عین سامنے کھڑی پیاری پیاری لڑکیوں کی یہ قطار جہاں انہیں بہت اچھی اور پیاری لگی وہیں اس انداز میں اور اتنے غور سے اپنی طرف دیکھتے پا کر انہیں ہنسی بھی بہت آئی۔

خوش دلی سے مسکراتے ہوئے انہوں نے سب کو قریب بلا کر خود ہی اپنا تعارف ان سے کرایا۔ امی بیگم باورچی خانے میں تھیں۔ آثم کو ابھی ابھی انہوں نے کچھ ضروری چیزیں لینے بازار بھیج دیا تھا۔ صنم ان کی آمد کی اطلاع دینے گھر گئی تھی تو اس کی ممی نے وہیں اسے کسی کام پر لگا دیا تھا۔ یوں تعارف کی رسم انہیں خود ہی نبھانا پڑی تھی۔ اپنے متعلق بتانے کے بعد اب وہ ان کے نام وغیرہ پوچھ رہی تھیں۔

بال بچوں، پوتوں پوتیوں اور نواسوں نواسیوں والی تھیں، بچوں کے ساتھ ساری زندگی بہت پالا پڑا۔ شاید تبھی دلچسپی بھی بہت رہی اور پیار بھی بہت کرتی تھیں۔ چند منٹوں میں ہی انجم سے لے کر منو تک چاروں کی چاروں ان کی دوست بن گئیں۔

منو کی دوستی نے تو بے تکلفی کی حدیں بھی پھلانگ لی تھیں۔ وہ نانی اماں کی گود میں بڑے اطمینان سے تشریف فرما تھی۔ پونہ نے اپنی بے تکلفی کے اظہار کے لیے ان کے پہلو کے ساتھ پہلو ملا کر بیٹھتے ہوئے خالی والے گھٹنے پہ یوں ہاتھ رکھا ہوا تھا جیسے

کوئی اپنی ملکیت پر قبضہ کیسے ہو۔

انجم اور ارم سامنے بیٹھیں اپنے گھر کے رشتہ داروں کی اردگرد رہنے والے محلہ داروں اور پڑوسیوں وغیرہ کی بے شمار باتیں سناتے جا رہی تھیں، امّی بیگم جلد جلد باورچی خانے سے فارغ ہو کر آئیں تو یہ مجمع لگا دیکھ کر بے اختیار مسکرا دیں۔

"میں جلدی جلدی کام نمٹا کر اس لیے آئی تھی کہ اماں اکیلی بیٹھی کہیں بور نہ ہو جائیں مگر یہاں تو ماشاء اللہ رونقیں لگی ہیں۔" پھر انہوں نے شرارت سے ہر ایک کی طرف دیکھا

"اماں! ان میں سے کسی نے تنگ تو نہیں کیا۔؟"

"انسان کو تنگ کرنے والے انسان ہی ہوتے ہیں، اللہ میاں کے ایسے ننھے ننھے فرشتے تو چین اور سکون دیتے ہیں۔" نانی اماں نے پونہ کے گھنگھریالے بالوں والے منے سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور جھک کر گود میں بیٹھی نمو کا منہ چومتے ہوئے جواب دیا۔"میں تو یہاں آنے سے کترا رہی تھی کہ اثم ماشاء اللہ اب سیانا ہے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر کام وام پر بھی لگ گیا ہوگا، پھر یہ لمبے لمبے دن اور راتیں بچوں کی رونق بغیر کیسے کٹیں گے۔" نانی اماں نے باری باری ہر ایک کو بغور دیکھا۔ مگر اب لگتا ہے یہاں سے جانے کو میرا جی نہیں چاہے گا۔"

"نانی اماں! ہم آپ کو اب کبھی بھی واپس نہیں جانے دیں گے۔" نمو نے بڑے خلوص و اپنائیت سے ان کے گلے میں اپنے ننھے ننھے بازوؤں کا ہار ڈال دیا، نمو کی اس ادا سے وہ اور بھی نہال ہو گئیں اس کے معصوم اور بے حد پیارے چہرے کے کئی پیار لے ڈالے۔

"ہاں اماں! اب تو میں آپ کو تب ہی جانے دوں گی، جب اپنے اثمی کی نہ صرف شادی ہو جائے گی بلکہ کوئی بچہ بھی ہو جائے گا۔"

"امّی بیگم! اثمی بھائی کی شادی ہے۔؟" انجم نے حیران ہو کر پوچھا

"ہاں۔ اب خیر سے ہو گی ہی نا۔" انہوں نے گول مول سا جواب دیا۔

"اور بچّہ بھی ہونے والا ہے۔؟" آنکھیں جھپکتے ہوئے پونہ کی معصومیت

بھی بول اٹھی۔

اس کے اس معصوم سوال پر امّی بیگم اور نانی اماں دونوں ہی زور سے ہنس پڑیں پھر نانی اماں نے اس کا سر پیار سے اپنے پہلو کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔" بیٹا شادی ہو گی تو پھر بچہ ہوگا نا۔"

"شادی کے بغیر بچّہ کبھی نہیں ہو سکتا۔؟" اب گود میں بیٹھی نمو صاحبہ نے سوال کر ڈالا۔

"ہو کیوں نہیں سکتا۔" نانی اماں یا امّی بیگم سے پہلے پونہ اپنی قابلیت کا ثبوت دینے کو بول پڑی۔" ہماری جولی کے چار بچے ہو گئے تھے۔ اور اس کی شادی کب ہوئی تھی۔؟"

"ہائے میں مر گئی۔" نانی اماں نے بے اختیار سینے پر ہاتھ مارا۔"ساجدہ سن رہی ہو۔ کہتی ہیں جولی کی شادی نہیں ہوئی تھی اور چار بچے ہو گئے تھے۔"

امّی بیگم زور سے ہنس پڑی اور ان کی ہنسی میں انجم اور ارم بھی شامل ہو گئیں۔

"اماں۔ ہنسی کی زیادتی سے آنکھوں میں آیا پانی دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے امّی بیگم بولیں۔"جولی تو ان کی کتیا کا نام ہے۔"

"ہائے ہائے! تو انہوں نے گھر میں کتیا رکھی ہوئی ہے۔؟"

"اماں! پہرے کے لیے اچھی نسل کا کتا ہو یا کتیا۔ ایک ہی بات ہے۔ آج کل ادھر چوری کی وارداتیں بھی تو بہت ہو رہی ہیں۔"

"تو وہ موئی خاک پہرہ دیتی ہو گی، پہلے بچے پیدا کرنے میں لگی رہی، پھر پالنے لگ گئی۔ کیا فائدہ۔؟"

امّی بیگم پھر ہنس پڑیں"خواہ بچوں ہی کی خاطر پہرہ دے۔ لیکن غافل تو نہیں رہتی نا۔"

"ہاں نانی اماں! رات کو دس بجے کے بعد کوئی بھی گھر میں آ جائے، جولی جہاں کہیں بھی ہو وہیں سے بھونکنے لگ جاتی ہے۔"

مگر بیٹیو! یہ بھی تو تمہیں معلوم ہوگا ناکہ جس گھر میں کتا ہو۔ وہاں رحمت کا فرشتہ نہیں جاتا۔"

"نہیں اماں! یہ سب دقیانوسی باتیں ہیں۔ جہاں کتا ہو وہاں اگر رحمت کا فرشتہ نہیں جاتا تو پھر خدا نے کتے جیسی منحوس مخلوق بنائی ہی کیوں اور اپنی دنیا میں بھیجی ہی کیوں یوں تو پھر ساری دنیا میں سے رحمت اور برکت اٹھ گئی نا۔"

"تو کیا کچھ غلط ہے۔ گھر گھر کتے موجود رہنے لگے ہیں۔ تبھی تو وہ رحمت اور برکت نہیں رہی جو پہلے تھی۔"

"انجو۔ انجو۔!" دیوار کی پرلی سمت سے صنم انہیں پکار رہی تھی۔ "وہیں جا کر بیٹھ گئی ہو۔ ممی بلا رہی ہیں۔"

"اچھا آپی! آتی ہیں۔" انجم وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دینے کے بعد باقی لڑکیوں لڑکیوں سے مخاطب ہوئی۔ "چلو پونہ اور نمو اٹھو، ممی بلا رہی ہیں۔"

"تمہیں بلایا ہے۔ تم جاؤ۔" پونہ نے ننھے منھے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "میں تو ابھی نہیں جاؤں گی۔"

"نہیں بیٹے ماسٹر آیا ہوگا۔" امی بیگم جلدی سے بولیں۔ "پڑھائی کا ناغہ نہیں کرنا۔"

"اچھا نانی اماں! ہم ابھی پڑھ کر آتی ہیں۔ ہمارے آنے تک چلی نہیں جایئے گا۔"

"نہیں پونہ! تم بے فکر ہو کر پورے دھیان سے پڑھنا۔ نانی اماں ابھی بہت دنوں تک یہاں رہیں گی۔"

"نانی اماں! آج رات کو ہم ادھر ہی آ کر ٹی وی دیکھیں گی۔"

"ہاں۔ ساتھ ساتھ ہم نانی اماں سے کہانیاں بھی سنیں گی۔"

"ہاں۔ بڑا مزہ آئے گا۔" سبھی پھر آنے کے شوق اور خیال میں جلدی سے اٹھ کر بھاگ گئیں۔

امی بیگم اور نانی اماں کتنی ہی دیر انہیں کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر اس کے بعد لڑکیوں کی ہر شام وہیں گزرنے لگی۔ نانی اماں مزے مزے کی باتیں سناتی رہتیں۔ سب لڑکیاں ارد گرد بیٹھیں ان کے پرخلوص اور مشفق چہرے کو دیکھتی رہتیں۔ اور ان کی دلچسپ باتیں سنتی رہتیں۔

امی بیگم بھی اپنی سوئی سلائی لے کر پاس بیٹھ جاتیں۔ ابا میاں بھی عادت کے مطابق اخبار چہرے کے سامنے پھیلاتے نانی اماں کے ارد گرد ہی کہیں پائے جاتے۔ نگاہیں ان کی اخبار پر ہوتیں لیکن کان نانی اماں کی طرف لگے رہتے۔ صنم کو گھر کے کاموں سے جوں ہی فرصت ملتی وہ بھی ادھر ہی بھاگ آتی۔ اور ـــ صنم موجود ہوتی تو آثم کیسے وہاں سے کہیں دور رہ سکتا تھا۔ شمع کے ارد گرد ہی پروانہ بھی چکر لگاتا رہتا۔ یوں کوئی بھی غیر حاضر نہ ہوتا۔ اس رات بھی ایسی ہی محفل سجی تھی۔ حسب معمول نانی اماں اپنے اسی پرکشش انداز میں مزے مزے کی باتیں سنا رہی تھیں۔

"اب تو زمانہ ہی بڑا بدل گیا ہے۔"

"کیوں نانی اماں! زمانے کو کیا ہو گیا ہے ـــ؟" آثم نے پاس بیٹھی صنم کو سب سے چھپا کر کہنی سے ٹھوکا دیتے ہوئے پوچھا۔

"زمانہ چالاک ہو گیا ہے۔"

"تو کیا پہلے بہت بھولا تھا ـــ؟"

"اور نہیں تو کیا۔ اب یہی لے لو ـــ یہ موا ٹی وی ہے۔ آج کل کے لوگوں کی چالاکی ہی تو ہے جو اتنے ذرا سے ڈبے میں اتنے ڈھیر سارے لوگ بھر دیئے۔"

"یہ تو صرف تصویریں ہیں نانی اماں۔" انجم بولی۔

"جانتی ہوں۔ مگر جب نیا نیا ٹی وی ہمارے ملک میں شروع ہوا تو تمہاری اور تم سے بھی کم عمروں والے بچوں نے تو ذرا حیرت کا اظہار نہ کیا۔ بڑے مزے سے ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگے۔ لیکن ہمارے وقتوں کے لوگ بھولے ہی تھے نا۔"

"کیوں ـــ؟ کیا ہوا انہیں ـــ؟"

"ایک ہماری خالہ تھیں۔ انہوں نے جب اتنے سے ڈبے میں یوں طرح طرح کے لوگ چلتے پھرتے، ہنستے بولتے دیکھے تو بے ہوش ہی ہو گئیں۔"

"سچی ۔۔۔؟"

"ہاں ۔۔۔ سچ مچ ۔۔۔!" سبھی زور زور سے ہنسنے لگے۔

"شاید کبھی پھر وہ فوت ہو گئیں ۔۔۔" آثم نے ہنسی ہونٹوں ہی میں چھپانے کی کوشش کی۔

"نہیں تو۔" نانی اماں معصومیت سے بولیں۔ "اس وقت تو انہیں پھر ہوش آ گیا تھا۔"

"اور دوبارہ دیکھا تو تب۔؟"

"ارے کہاں بیٹے! پھر تو وہ کبھی اس کمرے میں جاتی ہی نہیں تھیں۔ بڑی ضرورت آن پڑتی تو ٹی وی کی طرف سے گھونگھٹ نکال کر اندر جاتیں۔"

"گھونگھٹ کیا ہوتا ہے نانی اماں ۔۔۔؟" یونہ چہرے پر ڈھیروں حیرت لیے ننی منی آنکھیں جھپک جھپک کر پوچھ رہی تھی۔

"لو اب یہی دیکھ لو ۔۔۔" نانی اماں نے تیکھے سے انداز میں آثم کی طرف دیکھا۔ "چھ سات سال کی عمر ہو گئی اور گھونگھٹ کا پتہ ہی نہیں کہ کسے کہتے ہیں اور ہمارے زمانے میں اتنی اتنی لڑکیوں کو برقعہ پہنا دیا جاتا تھا۔ جبھی تو زمانہ معصوم تھا۔ نہ دنیا دیکھتے تھے نہ کسی بات کا پتہ چلتا تھا۔ بڑے معصوم لوگ ہوتے تھے۔ اب تو دنیا دیکھنے کے علاوہ یہ بناسپتی گھی اور اس کی بنی ہوئی خراب خراب چیزیں کھانے سے بھی لوگ چالاک ہو گئے جا رہے ہیں۔"

"بناسپتی گھی کھانے سے لوگ چالاک ہو جاتے ہیں ۔۔۔؟" صنم خاموش نہ رہ سکی۔ حیرت سے پوچھنے لگی۔

"تو اور کیا ۔۔۔ خالص چیزیں انسانوں کو خالص کب رہنے دیتی ہیں اور معصومیت خالص انسانوں کا شیوہ ہے ۔۔۔" نانی اماں کی اس بات پر امی بیگم کی ہنسی چھوٹ گئی۔ جلدی سے انہوں نے شوہر کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مسکرا رہے تھے بچے سب البتہ اپنی پوری توجہ سے نانی اماں کی طرف متوجہ تھے۔

"ہماری بڑی آپا تھیں۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔" نانی اماں نے پھر کوئی قصہ شروع کر دیا تھا۔ ابا میاں نے اخبار کو وہیں رکھتے ہوئے صوفے کی پشت کے ساتھ سر ٹیک کر آنکھیں میچ لیں جس سے صاف ظاہر تھا کہ نانی اماں کا یہ قصہ وہ پوری دلچسپی سے سننے کو تیار ہو بیٹھے تھے۔ امی بیگم کے تیز تیز چلنے والے ہاتھ بھی ذرا سے سست پڑ گئے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ آنکھوں کے گوشوں سے اماں کو بھی مسکرا کر اک نگاہ دیکھ لیتیں۔ اور بچے سب ایک ایک انچ مزید نانی اماں کی طرف کھسک گئے تھے۔

"ہمارے ہاں بناسپتی گھی کبھی نہیں آیا تھا۔ بڑی سی ہماری حویلی تھی اور اس کے پچھواڑے کی طرف اس کے ساتھ ملی ہوئی کمی کمین کی کوٹھڑیاں تھیں۔"

"کمی کمین کیا ہوتا ہے نانی اماں ۔۔۔؟" ارم نے پوچھا۔

"پہلے چپ کر کے بات تو سن لو۔ بیچ ہی میں ٹوک دیتی ہو ۔۔۔" انجم نے اس کی مداخلت سے بدمزہ ہوتے ہوئے اسے جھڑکا۔

"نہیں بیٹا! چھوٹی بہنوں کے ساتھ تلخ آواز میں نہیں بولتے۔ ارم بیٹی! کمی کمین ان کو کہتے ہیں جو گھروں کے چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں جیسے نوکر چاکر۔"

"اب معلوم ہو گیا ہے نا ۔۔۔؟ شکر ہے ۔۔۔" انجم نے نانی اماں کی نظر بچا کر ارم کے ایک چٹکی لے لی۔

"دیکھیے نانی اماں! یہ مجھے ۔۔۔۔"

"چلو ۔۔۔ ادھر تو پانی پت کی ایک اور لڑائی چھڑ گئی۔" صنم زور سے ہنس پڑی۔

"نہیں بیٹی، اچھی بیٹیاں جھگڑا نہیں کرتیں ۔۔۔" نانی اماں دونوں کو پیار سے سمجھانے لگیں۔

"پھر کیا ہوا نانی اماں ۔۔۔؟" آثم کی زبان نے باقی سب کے دلوں کی بات کہہ دی۔

"ہاں ۔۔۔ تو ہمارا جو سائیس تھا نا ۔۔۔"

"سائیس کیا ہوتا ہے ۔۔۔؟" انجم نے پوچھا۔

"ایک تو ان لڑکیوں کی نالج کچھ نہیں۔" آثم نے انجم کی کھوپڑی زور زور سے ہلائی۔ "سائیں" تانگہ چلانے والے کو کہتے ہیں۔" پھر وہ نانی اماں کی طرف متوجّہ ہو گیا
"پھر نانی اماں۔؟"

"وہ جو سائیں تھا نا۔ شہر سے بناسپتی گھی لے آیا۔ ہمارے ابا مرحوم کا حکم تھا کہ کوئی بھی شہر کی الا بلا کبھی نہ کھائے۔ کمی کین بھی نہیں۔"

"بناسپتی گھی کو الا بلا کہتے تھے۔" ارم حیرت سے بولی،

"تو اور نہیں کیا۔"

"مگر ہمارے گھر تو سالن میں وہی ڈالا جاتا ہے۔"

"ارے بٹیا وہی تو کہہ رہی ہوں۔ اب تو راجے مہاراجے بھی وہی کھاتے ہیں۔ اور ہمارے زمانے میں نوکر چاکر بھی بھینس کا خالص گھی کھایا کرتے تھے۔"

"وہ آپ کی بڑی آپا والی بات تو رہ ہی گئی۔" صنم نے انہیں اصل موضوع یاد دلایا۔

"ہاں۔ وہ ہماری بڑی آپا اس وقت سات آٹھ سال کی ہوں گی۔ کھیلتے کھیلتے ادھر پچھواڑے جا نکلیں۔ سائیں کی بیوی اسی گھی سے ہنڈیا پکا رہی تھی۔ عجیب طرح کی خوشبو لگی۔ سائیں کی بیوی ڈوئی میں سالن لے کر نمک چکھنے لگی تو بڑی آپا نے بڑھ کر اسے سونگھ لیا۔ بس بٹیا غضب ہو گیا تھا۔ وہ تو ایسی بیمار پڑیں کہ کئی دن تک کھانسی اور بخار نے انہیں چین نہ لینے دیا۔"

چھوٹی لڑکیاں تو حیرت اور دلچسپی سے نانی اماں کو بس دیکھے ہی جا رہی تھیں، البتہ صنم آثم، انجم اور ارم ہنسی سے دوہرے ہونے لگے۔

"صرف سونگھنے سے کھانسی لگ گئی۔" آثم قہقہے پر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔
"مجھے تو یہ گپ لگتی ہے۔"

امی بیگم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور ابا میاں نے بھی جلدی سے اخبار چہرے کے سامنے پھیلا لیا تھا۔

"گپ کیوں۔؟ بالکل سچی بات ہے۔ اتنے بھولے بھالے لوگ ہوا کرتے تھے۔ پھر ابا نے حکم دے دیا کہ کسی نوکر چاکر کے گھر بھی آئندہ یہ گھی نہیں آئے گا۔ اور اب تو لوگ پیڑ پیڑ ایسی چیزیں کھا جاتے ہیں تبھی اتنے چالاک ہو رہے ہیں نا۔"

"نانی اماں! چالاک اگر ہیں تو ساتھ ذہین بھی تو ہیں۔ دیکھ لیجیے یہ بناسپتی گھی ہی کھا کر آج کل کے لوگوں نے کیا کیا کچھ ایجاد کر لیا ہے۔" آثم نے ٹی وی اور فریج وغیرہ کی طرف اشارہ کیا۔

"اے بٹیا! ذرا ٹی وی تو لگانا۔ بھلا دیکھیں کوئی گانا یا ناچ تو نہیں ہو رہا۔"
"نہیں نانی اماں! اس وقت ٹی وی نہیں۔ باتوں کا بڑا مزہ آ رہا ہے۔"

ارم نے بھاگ کر اوپر سے سوئچ نکال دیا کہ کہیں نانی اماں پونہ یا منو سے ہی لگوا نہ لیں
ٹی وی کے پروگراموں سے زیادہ مزے کی آپ کی باتیں ہوتی ہیں۔"

"اے بٹیا! ہماری باتیں کیا مزے کی ہوں گی۔ ہم پچھلے وقتوں کے سیدھے سادے لوگ۔ میری ایک ہمسائی تھیں۔" ارم کی فرمائش پر وہ سچ مچ کوئی اور قصہ سنانے لگیں۔ سبھی ایک بار پھر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ابا میاں نے اخبار گھٹنوں پر رکھ کر اسی طرح صوفے کی پشت کے ساتھ ٹیکتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

"بے چاری بڑی ہی بھولی بھالی تھیں۔" نانی اماں کسی ہمسائی کی داستان بیان کرنے لگیں۔ "پچھلی سی پچھلی جنگ کی بات ہے۔"

"غدر کے زمانے کی۔" آثم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں بیٹے! اب اتنی بھی تو میں عمر رسیدہ نہیں ہو گئی۔"

"میں تو آپ کی ہمسائی کی بات کر رہا تھا نانی اماں۔!"

"میری ہمسائی میرے ہی ارد گرد کی عمر کی ہو گی نا۔ اور غدر کو گزرے سو سال سے بھی سولہ سترہ اوپر ہو گئے۔"

"آپ کی عمر کتنی ہو گی نانی اماں۔؟" پونہ نے معصومیت سے پوچھا۔
"یہی کوئی بیس سال چند ماہ۔" نانی اماں کے بجائے آثم نے شوخی بھرے لہجے

میں جواب دیا۔

"مذاق اڑاتے ہو میرا۔" نانی اماں نے گھور کر آثم کو دیکھا

"نہیں نانی اماں! بھلا میری ایسی مجال ہے۔"

"تو کیا میں بیس سال کی ہوں۔؟" نانی اماں خشمگیں نگاہوں سے آثم کو دیکھنے لگیں۔

"نانی اماں! ساتھ میں نے چند ماہ بھی تو کہا ہے۔ اور چند ماہ چھ سو سات سو بھی ہو سکتے ہیں۔ حساب کر کے دیکھ لیں۔ میں نے تو ان بچیوں کو ذرا چکر میں ڈالا تھا۔"

"دیکھ لیا نا آج کل کا زمانہ کتنا ہوشیار ہے۔ کیسے بات فوراً بنا لیتے ہیں۔"

"وہ تو نانی اماں۔"

"اب چپ بھی کیجئے بھائی جان ۔۔۔ ہمیں جنگ کی بات سن لینے دیجئے۔" انجم نے آثم کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید بولنے نہ دیا۔

"ہاں بیٹیا! تو میں کہہ رہی تھی ۔۔۔" نانی اماں جھٹ پٹ شروع ہو گئیں۔ وہ کبھی غصے کو زیادہ دیر دل میں جگہ نہیں دیا کرتی تھیں۔ فوراً اسی طرح چھپانے لگتیں۔ "سرحد کے پاس ہی ہمارا گاؤں تھا۔ جنگ شروع ہوئی تو اکثر لوگوں نے اپنے اپنے گھروں سے قیمتی قیمتی چیزیں سرحد سے دور بسنے والے اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں کے پاس بھیج دیں۔ ہماری اس ہمسائی کے گھر میں اور تو کوئی ایسی چیز اعلیٰ یا قیمتی نہیں تھی۔ البتہ اس کے پاس زیور بہت سارا تھا۔"

"زیور میں کیا کیا تھا نانی اماں۔؟" ارم کو زیورات پہننے کا بڑا شوق تھا۔ زیور کے نام پر چٹخارے لے کر نانی اماں سے پوچھنے لگی۔

"لو بھلا۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" انجم اس کی مداخلت پر الجھ پڑی۔

"یہی کوئی جھمکے، ہار اور کنگن وغیرہ ہوں گے۔" پھر وہ نانی اماں سے مخاطب ہوئی۔

"آپ آگے سنائیے نانی اماں! یہ تو پاگل ہے۔"

"اک یہی نہیں۔ تم ساری ہی بہنیں ایک سے ایک بڑھ کر پاگل ہو۔" آثم کی روشن آنکھیں انتہائی شوخی بھرے انداز میں ایک ایک پر سے ہوتی ہوئی آخر میں صنم پر آ کر ٹھہر گئیں۔ "پاگل پن اوپر سے چلا ہے۔ بے چارے نیازی انکل۔ ان کی ساری کی ساری ہی نسل خراب ہو گئی۔"

"کس کی نسل خراب ہو گئی۔ آثمی بیٹے ؟"

"اوہ۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔" ابا میاں کا سوال ایسا غیر متوقع تھا کہ آثم بری طرح سٹپٹا گیا۔

"بتائیے نا اب۔ اب کیوں نہیں بول رہے۔" انجم چیخ کر بولی

"آرڈر، آرڈر پلیز۔!" ارم کو ٹھک ٹھک بجانے کیلئے کوئی میز قریب ترین دکھائی نہ دی۔ تو وہ پونہ کی پشت ہی تھپ تھپا تھپ تھپا کر بلند آواز میں چلانے لگی تھی۔

"دو روٹی ایک سالن ۔۔۔" ارم کے آرڈر کے جواب میں انجم ہنستے ہوئے جلدی سے بول اٹھی۔ باقی سب بھی اس کی حاضر جوابی پر ہنس پڑے۔

"ہائے صنو آپی! یہ ارمی مجھے مار رہی ہے۔" پونہ زور زور سے رونے لگی۔

"ارے مار کب رہی ہوں میں تو آپی۔ ایک جج کی طرح سب کو خاموش کرا رہی تھی۔" ارم نے پونہ کی پشت تھپ تھپانے کا جواز پیش کیا۔ "نانی اماں کی بات کوئی سن ہی نہیں رہا تھا۔ بیچ میں اپنی اپنی بولے جاتے ہیں۔"

"یہ آثمی اور انجم سب سے زیادہ لڑاکے ہیں۔ انہیں کمرے سے باہر نکال دینا چاہیئے۔" صنم نے انجم کو اور مسکراتے ہوئے آنکھوں کے گوشوں سے آثم کو دیکھ کر شوخی سے کہا۔

"ہاں جی ہم لڑاکے ہیں ۔۔۔" انجم روٹھتے ہوئے اٹھ کر جانے لگی تھی کہ نانی اماں نے اس کا بازو تھام لیا۔

"بس بس! بیٹھ جاؤ میرے پاس۔ اچھی بیٹیاں چھوٹی چھوٹی بات پر روٹھا نہیں کرتیں اور آؤ وہ بات، پوری تو سن لو۔ بڑی مزیدار ہے۔" نانی اماں جھگڑا چکانے کی خاطر جلدی سے آگے قصہ بیان کرنے لگیں۔

"اور اتنے قیمتی زیورات وہ کسی کے پاس رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے کسی پر اعتبار ہی نہ تھا۔ تب اس نے کیا کیا۔ جھٹ پٹ اٹھی۔ زیورات والا ڈبہ الماری سے نکالا۔ اور اپنی قمیص کے اندر کمر کے ساتھ مضبوطی سے باندھ لیا۔"

"کیوں نانی اماں ۔۔۔ اس نے کیوں ایسا کیا۔۔۔؟"

"اس لیے کہ خدانخواستہ اگر جنگ خطرناک صورت اختیار کرے اور انہیں گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑے تو کم از کم اس کا زیور تو ساتھ ہو۔"

"ترکیب تو واقعی اسے خوب سوجھی۔" صنم نے اس کی عقل کی داد دی۔

"جنگ کے سولہ سترہ دن اس نے بڑی تکلیف میں کاٹے۔ کمر پر ڈبہ بندھا تھا۔ نہ رات کو اچھی طرح سو سکتی تھی اور نہ دن کو ٹھیک طرح سے کوئی کام کر پاتی۔ یہاں تک کہ سانس لینا بھی دشوار تھا۔ لیکن وہ ہر تکلیف برداشت کرتی رہی۔ آخر خدا خدا کر کے جنگ ختم ہوئی۔ سب لوگ اسی طرح رہنے لگے تو اس نے بھی کمر کے گرد سے زیورات والا ڈبہ کھولا۔ بہت دنوں بعد جسم کو چین نصیب ہوا۔ سکون و اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اس نے ڈبے کا ڈھکنا اتارا کہ اپنے زیورات کا دیدار کر کے اتنے دنوں کی تکلیف کا ازالہ کرے۔ لیکن ۔۔۔ ڈبہ کھولتے ہی اس کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔ زیورات کے بجائے اس میں تو سوئیاں، دھاگے اور بٹن وغیرہ قسم کی معمولی معمولی چیزیں پڑی تھیں۔"

"ہائے ہائے ۔۔۔" ارم بے اختیار چلا پڑی ۔۔۔ "وہ اس کے زیورات کہاں گئے۔۔۔؟"

باقی بھی سب آنکھوں میں ڈھیروں حیرت لیے سکتے کے عالم میں نانی اماں کو دیکھ رہے تھے اور ہر ایک کی خاموش زبان گویا یہی سوال کر رہی تھی۔

"معاملہ دراصل یہ تھا کہ اس کے پاس ایک جیسے دو ڈبے تھے۔ ایک میں اس نے زیورات رکھے ہوئے تھے اور دوسرے میں سوئیاں، دھاگے اور بٹن وغیرہ۔ افراتفری اور پریشانی کے عالم میں اس نے کھول کر دیکھا ہی نہیں۔ بس عجلت میں سوئیوں والا ڈبہ اٹھایا اور اسے زیورات کا سمجھ کر کمر کے ساتھ باندھ لیا۔"

قہقہوں کا ایک طوفان تھا جو یک لخت امڈ پڑا۔ نانی اماں خود بھی ہنس رہی تھیں۔ ساری بچیاں اور آثم کے ساتھ ابا میاں اور امی بیگم بھی اس طوفان میں بہہ رہے تھے۔

"ہائے بے چاری! اتنے دن ان معمولی چیزوں کے لیے اتنی تکلیف اٹھاتی رہی۔" صنم اس پڑوسن کے لیے افسوس کا اظہار کرنے لگی۔

"جب اس ڈبے میں سے زیورات کے بجائے دوسری چیزیں نکل آئیں تو پھر کیا ہوا نانی اماں ۔۔۔؟" ارم اپنی آنکھوں کا پانی صاف کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ہونا کیا تھا بیٹی ۔۔۔ ایک دم اسے خیال آیا کہ اگر واقعی انہیں گھر چھوڑنا پڑ جاتا اور وہ ساتھ سوئیاں، دھاگے لے جاتی اور زیورات والا ڈبہ یہیں رہ جاتا ۔۔۔ تو تو دولت لٹ جاتی نا۔ تباہ و برباد ہو جاتی۔ اس ہونے والے نقصان، جس سے وہ بچ گئی تھی، کے متعلق سوچتے ہوئے وہ بے ہوش ہو گئی۔"

"بے ہوش ہو گئی ۔۔۔؟" ایک بار پھر قہقہے ابل پڑے۔

"ہاں ۔۔۔ اتنے سادہ لوگ ہوتے تھے ہمارے زمانے کے۔"

"ہائے نانی اماں! ایسی ہی مزیدار سی کوئی اور بات سنا دیجئے۔"

"اتنی ڈھیر ساری باتیں سنائی ہیں۔ اب تمہاری باری۔ سب ایک ایک بات مجھے سناؤ۔"

"ہم ۔۔۔ ہم سنائیں آپ کو ۔۔۔؟" وہ تعجب سے بولی۔ "مگر نانی اماں ہمیں ایسی باتیں کب آتی ہیں۔"

"جیسی بھی آتی ہیں بٹیا! ایسی ہی سناؤ!"

"ہاں بھئی انصاف تو یہی کہتا ہے۔" ابا میاں بھی بہت محظوظ ہو رہے تھے شاید اور بھی اس محفل کو ابھی گرم رکھنا چاہتے تھے۔

"لیکن ابا میاں! ہمیں ایسی مزیدار قسم کی باتیں بالکل نہیں آتیں۔"

ارم اس معاملے میں اپنی کم مائیگی کے احساس تلے پسی ہوئی بہت ہولے سے اور گھبرائی ہوئی سی آواز میں بولی۔

"ہمیں لطیفے آتے ہیں ابا میاں! اگر اجازت ہو تو ۔۔۔" انجم نے کچھ سوچتے ہوئے

آنکھیں جھپکیں۔ "وہی سنا دیں سب؟"

"ہاں ہاں۔ جسے جو کچھ آتا ہے وہی سنا دے۔"

"پھر ابا میاں! آپ اور امی بیگم بھی سنائیں گے نا۔؟" صنم ان کی طرف بڑے لاڈ اور اپنی بات منوا لینے والے وثوق کے ساتھ دیکھتے ہوئے بولی۔

"لیکن ہم۔" امی بیگم شاید کوئی عذر وغیرہ پیش کرنے والی تھیں مگر ابا میاں ان کی بات کاٹتے ہوئے جھٹ بولے۔ "ہاں بھئی ہم اپنی بیٹیوں کو کچھ نہ کچھ ضرور سنائیں گے۔ آخر اس محفل میں ہم بھی تو شریک ہیں اور انصاف کا تقاضہ یہی ہے۔"

سب لڑکیوں نے حیرت سے ابا میاں کی طرف دیکھا۔ صنم ان کی حیرت زدہ نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے قدرے فخر سے بولی۔ "دیکھا! میرے ابا میاں اتنے اچھے ہیں۔" وہ ہمیشہ چھوٹی بہنوں کو یہی یاد کرانے کی کوشش میں لگی رہتی تھی کہ یہ گھر، یہ خاندان اس کا تھا۔ صرف اس کا۔!

"پھر۔! سب سے پہلے کون باری دے گا۔" انجم نے بے تابی سے پوچھا

"چھوٹی سے شروع کریں۔" ارم نے نمو کی طرف دیکھا۔

"تو پھر شروع ہو جاؤ۔ قد کے لحاظ سے تو تم ہی سب سے چھوٹی لگتی ہو۔ بالشت بھر کی صرف۔" آثم نے عمر کے لحاظ سے کافی لیٹ دکھائی دینے والے ارم کے قد کا مذاق اڑایا۔ سبھی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

اور۔ ایسی نگاہوں سے سب کو اپنی طرف دیکھتے پایا تو ارم کے چہرے پر افسردگی سی پھیل گئی۔ اس کا قد چھوٹا تھا تو اس میں اس کا کیا قصور۔؟ اپنے بس میں ہوتا۔ تو جانے کیسا مناسب اور خوب صورت بنا لیتی، بالکل سرو کی مانند۔!!

"لڑکیو! تم نے کبھی کالی مرچ دیکھی ہے؟"

"ہاں کالی سی منی سی ہوتی ہے۔"

"ارم اس سے ملتی جلتی چیز نہیں۔؟ قد بھی اور مزاج بھی۔ ہیں نا۔!!"

سب ہنس رہے تھے اور مذاق کا نشانہ بننے والی ارم کے چہرے پر تاریک سے سائے

لہرا رہے تھے۔ ابا میاں ہنسنے والوں کی طرف دیکھنے کے بعد بڑے غور سے ارم کے افسردہ اور خاموش چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "سب سے پہلے ہماری باری ہوگی۔"

سب کی ہنسی کو جیسے یکایک بریک لگ گئے۔ ابا میاں بولنے لگے۔

"ایک انتہائی وجیہہ اور پرکشش شخصیت والا شخص ایک محفل میں بیٹھا بڑی دلچسپ باتیں کر رہا تھا۔ لوگ محظوظ ہو رہے تھے، لوگ ہنس رہے تھے۔" ابا میاں نے بات شروع کی تو سب پوری دلچسپی سے ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اسی محفل میں ایک بدہیئت سا شخص بھی موجود تھا اور وہی اس وقت موضوع سخن بنا ہوا تھا۔ پرکشش شخصیت والا شخص اس کی شکل و صورت کے متعلق ایسی ایسی تشبیہات دے رہا تھا کہ باقی سب لوگ ہنس ہنس کر دوہرے ہوئے جا رہے تھے اور اس کی بذلہ سنجی اور وجاہت بھری شخصیت کی بے تحاشا تعریفیں کر رہے تھے۔ اسی محفل میں موجود ایک بزرگ چپکے سے بیٹھے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ایک کو ذلیل کر کے وہ شخص دس کو ہنسا رہا تھا اور خود جانِ محفل بنا ہوا تھا۔ بزرگ اس کی پرکشش ہستی کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے پاس بیٹھے ایک اور شخص سے مخاطب ہوتے۔ "عمارت واقعی بڑی خوبصورت ہے۔ لیکن مکیں انتہائی بدصورت۔ اس بدصورت شخص سے کہیں زیادہ بدصورت کہ وہ کسی کو ذلیل تو نہیں کر رہا۔"

ابا میاں نے بات ختم کرتے ہی پھر ارم اور آثم کی طرف باری باری دیکھا۔

"اوہ۔!" ابا میاں کی بات کا اور نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہی آثم کی گردن ندامت سے جھک سی گئی۔ "معاف کر دیجیے ابا میاں۔! انشاء اللہ آئندہ ایسی حرکت مجھ سے کبھی سرزد نہ ہوگی۔ میں شرمندہ ہوں۔"

ابا میاں آثم کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے سے بولے۔ "مجھے تم سے یہی امید ہے بیٹے۔!"

"دیکھیے۔ ابا میاں۔" نمو کے مخاطب کرنے پر جلدی سے ابا میاں نے آثم کے کندھے سے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے رخ ادھر پھیرا۔ "آپ کے لطیفے پر کوئی بھی نہیں ہنسا

"—سب کتنے خراب ہیں — اور بس اک میں ہی اچھی ہوں — جو ہنس رہی ہوں — !"
توتلی زبان میں ہکلا ہکلا کر فقرہ مکمل کرتے ہی نمو نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اس کے خیال میں ابا میاں نے انجی بھائی جان کی طرح اک لطیفہ یا نانی اماں جیسی کوئی بہت ہنسانے والی بات ہی سنائی تھی۔ اور اخلاق کے مارے وہ اب ہنسے ہی جا رہی تھی۔ ابا میاں اور آثم کی سنجیدگی بھری گفتگو نے ہنستی محفل کو یکایک سنجیدہ کر دیا تھا۔ مگر نمو کی اس معصوم سی ادا نے وہ جمود توڑ دیا۔ بے اختیار ہر اک لب پر مسکراہٹ پھیل گئی اور نمو کی ہنسی کے ساتھ ساتھ وہ مسکراہٹ قہقہوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔

"چلو بھئی اب کس کی باری —" ذرا ہنسی کم ہوئی تو انجم سب کو پھر اصل موضوع کی طرف لے آئی۔

"امی بیگم کی — اصول کے مطابق ابا میاں کے بعد انہی کی باری آنا چاہیے —" ارم کا موڈ پہلے سے بھی کچھ زیادہ خوش گوار ہو چکا تھا۔

"نہیں بھئی —!" امی بیگم انہیں ٹالنے کی کوشش میں تھیں — "ابھی ان کی باری ختم نہیں ہوئی۔"

"کیوں جی — کیوں — ؟" ابا میاں نے بڑے انداز سے مسکرا کر اپنی حسین بیوی کی آنکھوں میں جھانکا۔

"وعدہ کسی ہنسنے ہنسانے والی خوش گوار سی بات کا تھا — اور آپ نے تو محفل کو ہنسانے کی بجائے سنجیدہ کر دیا تھا۔"

"نہیں امی بیگم! ہمارے ابا میاں کی بات تو سونے میں تولنے کے برابر تھی، ہزار لطیفے اور ہنسانے والی باتیں ایک طرف اور ایسی سبق آموز اور خوب صورت بات ایک طرف۔"

"ہاں — صنم ٹھیک کہہ رہی ہے، امی بیگم، اب آپ چپکے سے اپنی باری دے دیجیے —" آثم بھی صنم کا ہم زبان ہو گیا۔

"اس وقت مجھے کچھ یاد ہی نہیں آ رہا۔" امی بیگم نے بڑی بے بسی سے اک اک کو دیکھا

آخر میں نگاہیں شوہر پہ آ کر ٹک گئیں۔

"بھئی بچو! ہماری بیگم کو تنگ مت کرو۔ ان کی باری ہم دیے دیتے ہیں۔ اب لطیفہ سنائیں گے۔"

"سچ ابا میاں! آپ لطیفہ سنائیں گے۔؟"

"بس لطیفہ سمجھو یا حقیقت۔"

"ایسی ہی صبر کوئی بات نہ کر دیجیے گا کہ ہنستے کھیلتے بچے افسردہ ہو کر رہ جائیں"

"کمال کرتی ہو بیگم! ایک تو تمہاری باری ہم بھگت رہے ہیں اور تم ہو کہ بجائے احسان ماننے کے خواہ مخواہ کی پابندیاں عاید کیے جا رہی ہو۔"

"ہاں ساجدہ! یہ تمہاری زیادتی ہے —" نانی اماں کا فقرہ سن کر امی بیگم مسکرانے لگیں۔

"اماں! میں نے کچھ غلط تھوڑا کہا تھا۔"

"ایسے کھیل کھیل میں ہی اگر بچے اچھی باتیں سیکھ جائیں تو اس میں برا ہی کیا ہے۔ راشد میاں نے اچھے انداز میں انہیں سمجھایا ہے، محفل بھلا کیوں افسردہ ہو گی۔"

"ہائے نانی اماں! اب باتیں بس کریں نا۔ ہمیں ابا میاں کا لطیفہ سننے دیں۔"

"سناؤ بھئی راشد میاں بچیاں بڑی بے تاب ہیں۔"

"ایک دوست دوسرے کو کہنے لگا" کل میری بیوی کی آنکھ میں ایک ذرہ پڑ گیا اسے نکلوانے پر پورے بیس روپے اٹھ گئے۔" دوسرا دوست زہر خند سے بولا "تم بیس روپے کو رو رہے ہو، کل میری بیوی کی آنکھ میں اک ساڑھی پڑ گئی، میرے پورے پانچ سو روپے اٹھ گئے۔" اور دوسرا دوست بچو! میں تھا۔"

"کب — کب —؟ یہ مرد لوگ ہمیشہ عورتوں پر ایسے ایسے الزامات عاید کرتے رہتے ہیں۔ مگر اپنی طرف نہیں دیکھتے، ایک ایک سوٹ پر پانچ پانچ سو سے بھی لیں زیادہ خرچ ہو جاتے ہیں —" ہنسی کے شور میں امی بیگم کا احتجاج اور واویلا ابا میاں سن ہی نہ سکے۔

"یہ لطیفہ بڑا ہی مزے کا تھا۔ ابا میاں ایسا ہی کوئی اور سنائیے —" انجم نے پھر فرمائش

کی۔ ابا میاں اس وقت بڑے موڈ میں تھے۔

"آثم کی دادی اماں اور نانی اماں کا ایک لطیفہ سنا سکتا ہوں۔"

"ضرور۔ ضرور۔" سب بیک آواز بولیں۔

"لیکن بعد میں کوئی اعتراض نہ کرے۔" ابا میاں نے دزدیدہ نگاہوں سے نانی اماں اور امی بیگم کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا

"کوئی نہیں کرے گا۔" نانی اماں نے بڑی فراخدلی سے جواب دیا مگر ساجدہ خاموش رہیں۔ البتہ ہونٹوں پر بڑی خوبصورت سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

"ہماری اماں اور ان کی اماں اپنے بیٹے اور بیٹی کا رشتہ طے کرنے بیٹھیں۔"

"جو کچھ سنانے لگے ہیں سوچ سمجھ کر سنایئے گا۔" امی بیگم نے گویا ابا میاں کو فہمائش کی۔ "بچوں کے سامنے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے منہ سے غلط سلط نہ کچھ نکال دیجئے گا۔"

"بیگم! ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔"

"ہائے ابا میاں! سنایئے بھی نا۔"

"ہاں تو۔ ہماری اماں نے ہماری تنخواہ وغیرہ کے بارے میں سب کچھ بڑی تفصیل سے بتاتے ہوئے آثم کی نانی اماں سے کہا۔ "اتنی معقول تنخواہ ہونے کی وجہ سے اب تو یہ رشتہ کرنے پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میرے خیال میں ساجدہ کا گزارہ بڑی اچھی طرح ہو جائے گا۔" ساجدہ کی امی فکرمند لہجے میں بولیں۔ "ساجدہ کا گزارہ تو ہو جائے گا۔ مگر مجھے فکر اس بات کی ہے۔ کہ پھر راشد کیا کرے گا۔"

"توبہ، توبہ۔!" بڑی پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ امی بیگم کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں۔ "کیسے خراب ہیں آپ۔ کب میری اماں نے ایسی بات کہی تھی۔؟"

نانی اماں نے نہ کوئی ابا میاں کے اس گھڑے ہوئے لطیفے پر اعتراض کیا نہ برا منایا۔ بچوں کے ساتھ مل کر وہ بڑی فراخدلی سے بس ہنسنے لگیں۔

"امی بیگم اتنا خرچ کیا کرتی تھیں۔؟" ارم کے سوال پر امی بیگم چونکیں پھر بھڑک کر شوہر سے مخاطب ہوئیں۔

"میں کہتی تھی نا سوچ سمجھ کر بات کیجئے گا۔ اب دیکھ لیں بچیاں سچ سمجھ رہی ہیں۔"

"تو سچ کو سچ ہی سمجھیں گی نا۔ جھوٹ کیوں سمجھیں بھلا۔" ابا میاں پھر ہنسے۔

امی بیگم مزید جلال میں آتے ہوئے کچھ اور کہنے ہی والی تھیں کہ صنم جلدی سے بول پڑی۔ "اب امی بیگم کی باری۔"

"میری باری۔؟" امی بیگم کا جلال رخصت ہو گیا۔ چونک کر بھولے سے بولیں

"میری باری ہی تو انہوں نے دی ہے۔"

"تمہیں شکرانے کے طور پر یہ سب کچھ کہا جا رہا ہے۔"

"آپ نے ایسا غلط لطیفہ کیوں سنایا۔؟"

"چلو جی ٹھیک ہے۔ میں اپنے دونوں لطیفے واپس لیتا ہوں۔ چلو پھر اب تم اپنی باری خود دو۔"

"خواہ مخواہ ہی۔" امی بیگم کا جمال بڑی خوبصورتی سے مسکرا پڑا۔

"اتنی خوبصورتی سے مسکرا کر اور صرف خواہ مخواہ کہنے سے بات نہیں بنے گی بیگم۔ اب تو تمہیں بچوں کو کچھ نہ کچھ سنانا ہی پڑے گا۔"

"لیکن میں نے کہا نا کہ میرے ذہن میں اس وقت کچھ نہیں آ رہا۔" امی بیگم پریشان سی ہو ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

ابا میاں ان کا عالم دیکھ کر مسکرائے۔ "فیثا غورث کا فارمولا ہے کہ جس طرح حیوان پر بے شمار مشکلات اس کی بے زبانی کی وجہ سے آتی ہیں۔ اسی طرح عورت پر بے شمار مشکلات اس کی زبان کی وجہ سے آتی ہیں۔"

"نہیں ابا میاں! یہاں میں احتجاج کروں گی۔" صنم جلدی سے بولی۔

"فیثا غورث نے یہ نہیں کہا تھا کہ عورت پر بے شمار مشکلات اس کی زبان کی وجہ سے آتی ہیں، بلکہ یہ کہا تھا کہ انسان پر۔ اس نے حیوان اور انسان کا مقابلہ کیا تھا اور انسان مرد بھی ہے اور عورت بھی۔"

"ارے! ہم تو یہ بھول ہی گئے تھے کہ ہماری ایک ذہین سی بیٹی بھی یہاں پر موجود

ہے۔ اور وہ فٹافٹ ہماری شرارت پکڑے گی۔ اور پھر اپنی امی بیگم کی حمایت میں ہمیں پر بات پلٹ دے گی۔"

"چلو راشد میاں۔ باسز اکے طور پر اب تم ہی پھر کچھ سناؤ۔"

"اماں آپ نے اچھا فیصلہ دیا۔ ا" ابا میاں سر کو کھجلانے لگے۔

"اب یہی فارمولا میں آپ کو سناؤں۔" امی بیگم کو دوسری شہ مل گئی تھی مسکراتے ہوئے چہک کر بولیں۔ "جس طرح حیوان پر بے شمار مشکلات اس کی بے زبانی کی وجہ سے آتی ہیں اسی طرح ایک مرد پر بے شمار۔۔۔"

"ابا میاں کی نقل۔ ابا میاں کی نقل۔" ابا میاں پر تو ساری عورتیں یک دم حملہ آور ہو گئی تھیں۔ آثم بطور کمک جلدی سے ان کی حمایت میں بول پڑا۔ "کوئی اور بات کیجئے امی جگم۔ !"

"یہ آپ سب کیسی باتیں کیے جا رہے ہیں۔ بھئی لطیفہ سنا ئیے۔ اب کس کی باری ہے۔؟" انجم بور ہو رہی تھی۔

"بھائی جان کی۔ بھائی جان کی۔" ارم بلند آواز میں چلائی۔

"تمہیں تو بھائی جان کے سوا اور کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہے۔" صنم نے پاس سے کہنی کے ساتھ اسے ٹھوکا دیا۔ "اب بھاگنے کی کوشش مت کرو۔ واقعی اب تمہاری باری ہے۔"

"تم کہہ رہی ہو تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس نے سر اٹھایا اس کی آنکھیں ہیرے کی کنی کی طرح چمک رہی تھیں۔

"سنئیے ابا میاں! جس طرح ابھی ابھی آپ نے دو سچے لطیفے سنائے ہیں۔ اسی طرح میرا بھی ایک سنیں۔"

"نہیں، نہیں۔ سچی بات نہیں۔ ہم تو لطیفہ سنیں گے جھوٹ موٹ کا لطیفہ۔ سچے لطیفے کے بعد لڑائی ہو جاتی ہے۔" ارم کی بات پر سبھی ہنس پڑے۔

"سنائیے بھائی جان جو دل چاہے سنا دیجئے۔" انجم بے اختیار ہو کر بولی۔ "مجھے آپ

کی ہر بات اچھی لگتی ہے۔ سچی بھی، جھوٹی بھی۔ سبھی۔"

"تو پھر سنو۔ ایک بس میں دو لڑکیاں سفر کر رہی تھیں۔ ایک دوسری سے کہنے لگی۔ "جب کنڈیکٹر آئے گا، تو چپکے سے بیٹھی رہنا۔ ٹکٹ بالکل نہیں لینا۔ اس آتی بھیڑ میں اسے کیا پتہ چلے گا۔ اور ہمارے پیسے بچ جائیں گے۔"

"نہ بھئی۔" وہ لڑکی جلدی سے بولی۔ "میں تو ٹکٹ ضرور لوں گی۔ ایمانداری ہمیشہ فائدہ پہنچاتی ہے۔" اسی لمحے کنڈیکٹر آ گیا۔ ایماندار لڑکی نے بازہ دیڑھ سا کر جھٹ ٹکٹ خرید لیا۔ پھر مٹھی کھولی۔ اسے غور سے دیکھا۔ مسکرائی۔ خوش ہوئی اور پھر جھک کر بے ایمان لڑکی کے کان میں آہستہ سے بولی۔ "دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ ایمانداری فائدہ پہنچاتی ہے۔ دس پیسے کا سکہ میں نے کنڈیکٹر کو دیا۔ کنڈیکٹر نے دس پیسے کا ٹکٹ دے کر ساتھ نوّے پیسے بھی دے دیئے۔"

"ایمان سے۔" ساتھ ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔

"بالکل ایمان سے۔ اور ان دونوں لڑکیوں کے نام انجم اور ارم تھے۔"

ابا میاں، امی بیگم، نانی اماں اور صنم ہنس ہنس کر بے حال ہوئی جا رہی تھیں مگر انجم اور ارم آثم کے ساتھ جھگڑ رہی تھیں۔

"بھائی جان کو ہمارے ساتھ پتہ نہیں کون سی دشمنی ہے۔ ہمیشہ ہمارا لطیفہ ہی سناتے ہیں۔"

"تو یہ واقعی تم دونوں کا تھا۔" صنم نے ہنسی بڑی مشکل سے ضبط کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا تو پھر اک قہقہہ پڑا۔

"ہائے ہائے آپی! آپ بھی بھائی جان کے ساتھ مل گئیں۔"

"میں خواہ مخواہ ان کے ساتھ مل گئی۔ تم خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ جب بھی سناتے ہیں ہمارا لطیفہ سناتے ہیں۔"

"ہائے! ہمارا مطلب یہ تو نہیں تھا۔" دونوں بیک آواز بولیں۔

"عقلمند اور بے وقوف دونوں میں ہی کوئی نہ کوئی عیب ہوتا ہے۔ مگر عقلمند اپنا عیب

خود دیکھتا ہے اور بے وقوفوں کے عیب دوسرے دیکھتے ہیں۔"

"ابا میاں! دیکھیے یہ بھائی جان ہمیں بے وقوف کہہ رہے ہیں۔"

آثم اور صنم دونوں زور زور سے ہنس پڑے۔

"قسم کھا کر۔ میں نے تمہیں بے وقوف کہا ہے۔" آثم سنجیدگی سے بولا۔ "میں نے تو صرف تمہیں ایک زریں قول سنایا ہے۔"

"لیکن مطلب تو آپ کا یہی تھا نا۔"

"اب تم اسی پر اصرار کیے جا رہی ہو تو نکال لو یہی مطلب۔"

"چھوڑو بھی بحث۔۔۔ اب کس کی باری ہے۔۔۔؟" انجم ان کی چخ چخ سے زچ سی ہو کر بولی۔

"بس کرو اب۔۔۔ ممی انتظار کر رہی ہوں گی۔۔۔" صنم جیسے اس محفل کو برخاست کرنا چاہتی تھی۔

"واہ! اب آپ کی اپنی باری آئی ہے نا۔ تو بھاگنے لگیں۔" انجم نے احتجاج کیا۔

"ہاں بھئی! بھاگنے والی بات غلط ہے۔" آثم نے اسے گھورا۔

"میں بھاگ کب رہی ہوں۔ ممی کی جھڑکیوں کا خیال آ گیا تھا۔"

"بڑے اچھے وقت خیال آیا۔ دیکھیے ابا میاں! صنو کی اپنی باری آئی ہے تو یہ بھاگ چلی ہے۔"

"نہیں بھئی! میری بیٹی بڑی دیانتدار ہے یہ نہیں بھاگے گی۔"

"ارے ہاں! مجھے اب یاد آیا ہے۔ وہ ٹکٹ لینے والی دیانتدار لڑکی انجو نہیں دراصل صنم تھی۔"

"ہاں آپی۔ ہاں آپی۔" ارم کو آثم کی یہ بات بڑی پسند آئی۔

"اچھا اتنی یاد رکھنا۔" صنم ہولے سے بڑبڑائی۔

"تو پھر جانے کی بات کیوں کر رہی ہو۔ چپکے سے بیٹھی رہو۔" وہ بھی اسی طرح

مدہم سی آواز میں بولا۔ "تم چلی جاؤ گی۔ تو پھر میں بھی اٹھ جاؤں گا۔ اور میرا یہ محفل چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا۔ تم میرے اتنے قریب بیٹھی ہو۔"

"یہ کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے؟" انجم بلند آواز میں بولی۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔" صنم گڑبڑا سی گئی۔

"مجھ سے مشورہ کر رہی تھی کہ کون سا لطیفہ سنائے۔" آثم جلدی سے اس کی ڈھال بنا۔

"تو ہو گیا مشورہ۔۔۔؟"

"ابا میاں۔۔۔!" صنم کی آواز میں ابھی تک ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ "یہ ضروری تو نہیں نا کہ لطیفہ ہی سنایا جائے۔۔۔؟"

"ہاں بیٹی! کوئی اور اچھی سی بات سنا دو۔"

"ایک شخص دوسرے شخص کو گالیاں دے رہا تھا اور دوسرا اس کے جواب میں دعائیں دیے جا رہا تھا۔ تیسرا شخص پاس سے گزرا۔ چند لمحے کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا پھر حیرت سے بولا۔ وہ گالیاں دیے جا رہا ہے اور تم جواب میں دعائیں۔ عجیب انسان ہو تم بھی۔ وہ شخص بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔ جس کے پاس دینے کے لیے جو کچھ ہوتا ہے وہ وہی دوسرے کو دیتا ہے۔"

"ہائے ارم، اب میں تمہیں کبھی کچھ نہیں کہا کروں گی۔"

"اور میں بھی آئندہ ہر ایک کو دعا ہی دیا کروں گی۔"

"شاباش بیٹی!" ابا میاں اپنی جگہ سے اٹھے اور صنم کے پاس جا کر اس کے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے بولے۔ "بڑی خوب صورت بات تم نے سنائی ہے۔ بڑے ہی کام کی بات۔۔۔ میری اس بیٹی جیسا کوئی اور دنیا میں کم ہی ہوگا۔"

"ہاں تو۔۔۔ جیسے ہم بہت برے ہیں نا۔" ارم بڑبڑائی تو سب کو ہنسی آ گئی۔

"دوسرے کی تعریف ہو تو فوراً ہی جل کر راکھ نہیں ہو جایا کرتے، بلکہ اپنے میں بھی ایسے ہی اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔" آثم بڑی پیار بھری، ستائش بھری نگاہوں سے صنم کو دیکھتے ہوئے ہولے سے ارم کے کان میں بولا۔

"وہ تو بھائی جان میں پہلے ہی انجم سے وعدہ کرا چکی تھی کہ آئندہ جھگڑتے ہوئے بھی اسے خراب خراب نام دینے کے بجائے دعائیں ہی دیا کروں گی۔"

"شاباش!" ابا جان نے پیار سے ان کی طرف دیکھا۔ "جو انسان اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے آئندہ سے اصلاح کی کوشش کرے وہ سب انسانوں سے اچھا ہوتا ہے اور مجھے تو آج ہی اندازہ ہوا ہے کہ میرے سب ہی بچے بہت اچھے ہیں۔"

"میں اور نمو بھی ابا میاں۔۔؟" پونم کی کپکپاتی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے یکایک بڑے دلار سے بولے۔

"تم میری دونوں بیٹیاں تو ننھے ننھے معصوم سے فرشتے ہو۔ اور فرشتے صرف اچھے ہوتے ہیں۔"

"شکریہ ابا میاں۔۔!" پونم کے بجائے نمو نے جھٹ پٹ اک توتلا سا شکریہ ادا کر دیا۔ سب بے اختیار ہنس پڑے اور ڈھیروں ڈھیر پیار بھر کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ نانی اماں اس کی اس ادا سے کچھ زیادہ ہی اتھل پتھل ہو گئی تھیں۔ جلدی سے سینے کے ساتھ بھینچ کر اسے پیار کرنے لگیں۔

"نانی اماں۔۔!" ارم نے انہیں مخاطب کیا۔۔ "اب چھوڑیئے نمو کو اور سنیے انجم کیا کہتی ہے۔؟"

"میں کیا کہتی ہوں۔؟" انجم نے ارم کو گھورا۔ "کب میں نے کچھ کہا ہے۔؟"

"بھئی تمہاری اب باری ہے نا۔ کچھ نہ کچھ تو کہو گی ہی۔"

"اوہ ہاں۔ لیکن۔۔" وہ چھت کی طرف دیکھ کر دانتوں کو انگلی سے بجاتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ "کون سا لطیفہ سناؤں۔ کون سا والا۔؟"

"کیا بہت آتے ہیں تمہیں جو انتخاب میں مشکل پیش آ رہی ہے۔؟"

"ہاں آتے تو کافی ہیں۔" وہ جیسے فخریہ مسکرائی۔

"تو پھر ہر وقت مجھ سے لطیفہ سننے کی فرمائش کیوں ہوتی رہتی ہے۔؟" آثم نے آنکھیں نکال کر انجم کو دیکھا۔

"آپ سے ہی سن سن کر تو اکٹھے کیے ہیں۔" انجم سر جھکاتے ہوئے بھیگی بلی سی بن کر ہولے سے بولی۔

"تو پھر یہ جائز نہیں۔۔ تم میرے والا کوئی لطیفہ نہیں سناؤ گی۔ کوئی اپنا سناؤ۔"

"لطیفے کسی کی میراث نہیں ہوتے بیٹے۔! آخر تم نے بھی تو کسی دوسرے سے ہی سنے ہوں گے۔"

"میں نے کسی سے سنے نہیں تھے ابا میاں۔!" آثم زیر لب مسکرایا۔

"تو کیا پھر خود تخلیق کیے ہیں۔؟"

"نہیں۔ لطیفوں والی ایک کتاب میں پڑھے تھے۔"

"دیکھیے ابا میاں۔ دیکھیے۔" انجم جانے کیا شکایت لگانے لگی تھی۔ ابا میاں نے سننے سے پہلے ہی فیصلہ سنا دیا۔

"چلو بیٹے! تم سناؤ تمہیں جو کچھ آتا ہے۔"

"کھوں کھوں۔" انجم بڑے انداز سے کھنکھاری۔ سب مسکرانے لگے۔

"ایک دن تین آدمی نشے میں دھت گڑبڑ پھیلانے کی وجہ سے پکڑ کر عدالت میں میجسٹریٹ کے سامنے لائے گئے۔ پہلے سے میجسٹریٹ نے پوچھا۔ "تم کیا کر رہے تھے۔؟" اس نے جواب دیا۔ "جی میں تالاب میں تربوز پھینک رہا تھا۔" "یہ تو کوئی ایسی بات نہ ہوئی۔" میجسٹریٹ نے بڑبڑاتے ہوئے دوسرے سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بھی تالاب میں تربوز ہی پھینک رہا تھا۔ تیسرے کی طرف دیکھ کر میجسٹریٹ نے کہا۔

"غالباً تم بھی ایسا ہی کر رہے تھے۔" "جی نہیں۔" تیسرا میجسٹریٹ کی کم فہمی پر بڑے انداز سے مسکرایا۔ "دراصل وہ تربوز میں ہی تھا۔ جسے یہ دونوں تالاب میں پھینک رہے تھے۔" یکایک قہقہوں سے سارا کمرہ گونج اٹھا۔

"بھئی میری انجو بٹیا کا لطیفہ بڑا مزیدار رہا۔"

"میرا ہی سنایا ہوا تھا نا۔" آثم نے غصیلی نگاہوں سے انجم کی طرف دیکھا۔ اپنی تعریف

ابا میاں کے منہ سے سن کر اس کا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ آثم کی غصیلی نگاہ نے اسے ذرا نہیں سہمایا۔ اس کے برعکس بڑی خود اعتمادی کے ساتھ تن کر بولی ــ "دیکھیے بھائی جان کسی کی تعریف سے یکایک جل نہیں اٹھا کرتے ــ" اسی کا فقرہ اس نے اسی پر چست کر دیا۔

"اچھا ــ ہماری بلی اور ہمیں کو میاؤں ــ آئندہ کوئی لطیفہ سنانے کو کہنا ــ"

"یہ تم دونوں کیا جھگڑا لے بیٹھے۔ اب ارم کی باری ہے۔ دیکھیں اس کی پوٹلی سے کیا نکلتا ہے" صنم نے انہیں خاموش کراتے ہوئے ارم کی جانب متوجہ کرایا۔

"میری پوٹلی ــ؟ آپی میرے پاس تو کوئی پوٹلی نہیں ہے ــ" وہ گھبرا گھبرا کر اپنے ارد گرد اور اپنی گود میں اس پوٹلی کو تلاش کرنے لگی۔ جس کا ذکر صنم نے کیا تھا۔

"بے وقوف ــ!" آثم کے قہقہے کے ساتھ جب انجم اور صنم کا قہقہہ بھی ارم کے کانوں میں اترا تو اسے اپنی احمقانہ حرکت کا احساس ہو گیا۔ مگر وہ تیز طرار بہت تھی۔ پیشانی پر پھوٹ پھوٹ آنے والے پسینے کو اندر ہی اندر جذب کرتے ہوئے جلدی سے بولنے لگ پڑی۔

"ایک چھوٹی سی بچی نے فون میں پہلی بار اپنے ابو کی آواز سنی۔ تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ امی کے کئی بار پوچھنے پر آخر اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے وجہ بتائی ــ "اپنے ابو کو اتنے تنگ سوراخ میں سے اب ہم کیسے نکالیں گے۔"

سب ہنسنے لگے۔ لیکن آثم جلدی سے بولا ــ "ارے! یہ لطیفہ تو نمو کا ہے۔"

"کیا ــ؟" نمو نے چونکتے ہوئے آنکھیں جھپکیں ــ "سچی مچی میرے ڈیڈی فون میں گھس گئے ہیں ــ؟" اس کے معصوم چہرے پر فکر و تردد کی گہری پرچھائیاں یکایک رنگ گئیں۔

"ہاں سچی مچی ــ" آثم نے اپنی مسکراہٹ بڑی مشکل سے اس سے چھپائی ــ "تبھی تو نمو! اتنے دن سے وہ تمہیں دکھائی نہیں دیتے ــ"

"اوں اوں ــ" وہ دونوں ہاتھوں میں منا سا چہرہ لے کر سچ مچ رونے لگی۔

ہنسی کے مارے سب کا برا حال ہو گیا۔

"نہیں نمو۔ نہیں میری جان ــ! یہ اثمی بھائی جان تمہیں مذاق کر رہے ہیں ــ ڈیڈی تو دورے پر گئے ہوئے ہیں ــ" انجم لپک کر اسے گود میں بھرتے ہوئے تسلیاں دینے لگیں۔

"نہیں ــ آپ مجھے بہلانے کے لیے جھوٹ بول رہی ہیں۔ ڈیڈی سچ مچ فون میں گھس گئے ہوں گے۔ بھائی جان کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔"

"لو اثمی میاں! اب اسے سنبھالو اور سمجھاؤ کسی طرح۔ ننھی سی بچی کو کیسا پریشان کیا ہے ــ" امی بیگم نے آثم کو غصے سے گھورا۔

"ارے ارے نمو!" آثم نے بڑھ کر اسے جلدی سے گود میں لے لیا ــ "میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ سچ ہے ــ لیکن میری منی سی بیٹیا! یہ تو لطیفہ ہے اور لطیفے جھوٹ موٹ کے ہوتے ہیں۔ ان پر یقین نہیں کیا کرتے ــ"

"سچی مچی کہیے ــ کہیں پھر لطیفے جیسا جھوٹ تو نہیں بول رہے ــ اوں ــ اوں ــ" وہ روئے جا رہی تھی۔

"نہیں میری نمو نہیں ــ یہ سچی بات ہے ــ مجھ پر اعتبار کرو۔ کل دیکھ لینا تمہارے ڈیڈی دورے سے واپس آ جائیں گے ــ" آثم اس کے رخسار صاف کر رہا تھا۔ اور اسے یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا

"ایک کسان تھا۔" ابا میاں نے مسکرا کر آثم کی طرف دیکھا ــ "سال بھر اس نے بہت محنت کی۔ پھر جب فصل پک کر تیار ہو گئی تو اسے کاٹ کر اس کا بڑا ڈھیر لگا دیا۔ رات ہوئی۔ چوری چکاری کے خطرے کی وجہ سے اس کی حفاظت کے لیے رات اس نے وہیں اس ڈھیر کے پاس گزارنے کا فیصلہ کیا۔ سردی بہت تھی۔ آگ کا الاؤ جلا کر بیٹھ گیا۔ ہوا چلی اک چنگاری اڑ کر غلے کے ڈھیر پر جا پڑی۔ آگ سلگ اٹھی۔ چنگاری شعلے بنی اور تمام کا تمام غلّہ جل کر راکھ ہو گیا۔ ہمارے اعمال اس غلے کے ڈھیر کی مانند ہیں۔ گناہ کی اک چنگاری یوں نیکیوں کے اک پورے ڈھیر کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے ہمیں اس سے بچنا چاہیے۔"

ابامیاں بات سنا کر چپ ہو گئے۔

"اور اب دیکھ لو انشی۔!" امی بیگم مسکرائیں۔ "اتنے عرصے کے بولے ہوئے سب سچ آج ایک جھوٹ نے جلا دیئے۔ ممو کو اب اعتبار ہی نہیں آرہا۔"

"ہاں ابا میاں! آپ نے بڑی کھری بات سنائی۔" اَثم نے اعتراف کیا۔ "آئندہ ایسے معصوم جھوٹوں سے بھی احتراز کیا کروں گا۔"

"چلو بھئی بچیو! اب آج کی محفل برخاست کر دو۔ تمہاری ممی تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"ہاں۔" ابا میاں کی بات پر صنم چونکی۔ "انجو۔ ارم! چلو جلدی چلیں گیارہ بجنے والے ہوں گے۔ ممی سے ڈانٹ پڑے گی آج تو۔"

"میں انہیں جاتے ہی یہاں ہونے والی سب باتیں سنا دوں گی۔ پھر وہ یقیناً نہیں ڈانٹیں گی۔ آج ابا میاں نے اتنی کام کی باتیں ہمیں سنائی ہیں۔"

انجم نے ممو کو گود میں اٹھا لیا اور ارم نے نیند کے مارے لڑکھڑاتی پونہ کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔

"اَثمی! بیٹے لڑکیوں کو ان کے گیٹ تک چھوڑ آؤ۔"

"کچھ نہیں ہوتا امی بیگم! ہم چلی جائیں گی۔"

"چلی جائیں گی امی بیگم! بہادر بچیاں ہیں۔" اَثم بے پرواہی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر صنم کی طرف مڑا۔ "صنو! تم بھی جا رہی ہو۔؟"

"ہاں۔ کیوں۔؟" اسی کے سے مدھم لہجے میں اس نے جواب دیا۔

"ابا میاں سے وہ بات نہیں کرنا تھی۔؟"

"کرنا تو تھی۔ لیکن اس وقت۔؟"

"کیوں۔؟ وقت کو کیا ہے۔؟"

"یہ تم دونوں میں کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے۔؟" امی بیگم کی آواز پر دونوں چونکے۔

"وہ۔ وہ۔ ہم ابا میاں سے ایک ضروری بات کرنا چاہتے تھے۔" اَثم نے

آنکھوں کے گوشوں سے ابا میاں کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے ہکلا ہکلا کر امی بیگم کی بات کا جواب دیا۔

"کیا کہنا ہے بیٹے۔؟" ابا میاں نے سن لیا تھا۔ بڑے نرم سے لہجے میں پوچھنے لگے۔ صنم جلدی سے ان کے پاس ہی صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔

"کسے بات کرنی ہے۔ تمہیں یا اَثم نے۔؟"

صنم کھل کھلا کر زور سے ہنس پڑی۔ "یوں سمجھئے دونوں نے ہی ابا میاں۔"

"کیا ہے۔؟" امی بیگم نے اپنی سلائی رکھتے ہوئے قدرے تشویش سے ان دونوں کو باری باری دیکھا۔

"ابا میاں! بات یہ ہے۔" اَثم نگاہیں جھکاتے ہوئے ان کے سامنے نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔ "آپ کی خواہش تھی کہ میں ایم اے پاس کر لوں۔"

"اور۔ وہ تم نے کر لیا۔" ابا میاں نے اس کی جھجک دور کرنے کی خاطر اس کا فقرہ خود پورا کر دیا۔

"ہاں جی۔" اَثم مسکرا پڑا۔

"اور اب کوئی ملازمت کرنا چاہتے ہو۔؟"

"نہیں ابا میاں! یہی میں کہنا چاہ رہا تھا۔ کہ میں فی الحال کوئی ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔"

"تو نہ کرو۔ ملازمت کرنے کے لیے تو ہم بھی تمہیں نہیں کہتے۔ یہ اپنا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار اتنا وسیع ہے۔ اتنا کچھ دے رہا ہے۔ اسی کو تم سنبھال لو۔" پھر ابا میاں مسکرا پڑے۔ "ہم ریٹائر ہو جائیں گے۔ تم ہمیں پنشن دیا کرو گے نا۔؟"

"لیکن ابا میاں! میں ابھی آپ کو ریٹائر نہیں کرنا چاہتا۔"

"کیا مطلب۔؟" ابا میاں چونکے۔ "کھل کر کہو بیٹے۔"

"ابا میاں! ہم ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جو مسائل اور پریشانیوں میں گھرے سیدھے سادے اور مجبور لوگوں کی اس انداز میں راہنمائی کرے کہ وہ ان

سے نجات پا سکیں۔ ایسے غریب اور عزت دار لوگوں کی مشکلات کا حل ڈھونڈا جائے جو قانونی چارہ جوئی نہ کر سکیں، جن کے پاس ایسے وسائل نہ ہوں کہ اپنے چھنے ہوئے حق حقوق لینے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکیں اور پھر بے بس ہو کر رہ جائیں۔ لٹ جائیں، برباد ہو جائیں۔"

ابا میاں سیدھے اور چوکنے ہو کر بیٹھ گئے۔ آثم نے جلدی جلدی صنم کے کالج کی ٹک شاپ پر سموسے بنانے والی عورت کی داستان سنا ڈالی۔

"اب دیکھیے نا ابا میاں! بے شمار جائز حقوق رکھتے ہوئے بھی وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتی کہ اپنے باپ کی جائداد میں سے اپنا حصہ لے لے۔ اپنے بچوں کو عزت سے پالے اور اپنی بھی زندگی وقار سے گزارے۔ ان کے خاندان میں یہ رسم ہی نہیں ہے ویسے بھی ابا میاں رسم ہوتی بھی، اس کے بھائی اسے کچھ نہ دیتے تو تب بھی وہ بے بس تھی، اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا کہ قانونی چارہ جوئی کر کے ہی حق لے لیتی۔ یوں۔ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اک تباہ حال زندگی گزار رہی ہے۔ تین بچوں کا مستقبل خراب ہو رہا ہے۔"

"تم اس کی مدد آخر کس طرح کرو گے۔ کیا کرو گے۔؟؟"

"سب سے پہلے تو اپنے باپ کی جائداد میں سے اپنا حصہ لینے کے لیے اسے ذہنی طور پر تیار کریں گے۔ فاقوں کی ماری یقیناً بہت جلد راضی ہو جائے گی۔ تب ہم اس کے بھائیوں کو سمجھائیں بجھائیں گے کہ ان کی عزت بھی اسی میں ہے کہ ان کی بیوہ بہن اپنا حق لے کر اک باعزت زندگی گزارے۔ وہ اگر کسی بھی طرح کچھ دینے پر راضی نہ ہوئے تو"

"ہاں۔ پھر کیا کرو گے۔؟"

"ابا میاں! ہمارے پاس تو اتنا ہے کہ ہم اس کے لیے قانونی چارہ جوئی کر سکیں۔ ہم اس کا حق دلانے کے لیے اپنے وسائل اور ذرائع استعمال کر لیں گے اسی بیوہ عورت کے ہم باپ اور بھائی بہن بنیں گے۔ اس کی مجبوریوں کو ہم مجبور نہیں رہنے دیں گے۔"

"ہاں ابا میاں! ایسی صرف وہی عورت نہیں ہو گی۔ اور بھی لوگوں کو بہت

سارے مسائل ہوں گے، پریشانیاں ہوں گی۔ مگر وہ مجبور ہوں گے۔ ہم ان کی مدد کریں گے۔ جس طرح بھی ہو سکے۔ بہت سارے مسائل اور پریشانیاں تو مجھے یقین ہے کہ حکمت عملی سے ہی سلجھ سکتی ہیں۔" صنم آثم سے بھی زیادہ جوش اور ولولے سے کہہ رہی تھی۔

"تمہیں خود پر اتنا اعتماد ہے کہ بڑے سے بڑا معاملہ سلجھا لو گے، ادارے میں تو پھر ہر قسم کی پرابلمز سامنے آئیں گی۔ تم لوگوں کے پاس اتنی عقل ہو گی۔"

"ابا میاں! آپ اور ڈیڈی جیسے تجربہ کار بزرگ بھی تو ہمارے پاس ہیں۔ ہماری ناقص عقلوں میں اگر کسی مسئلے کا حل نہ آ سکا تو ہم آپ کا تجربہ اور عقل لیں گے آپ سے مشورہ کیا کریں گے اس کے علاوہ اور بھی کوئی ریٹائرڈ لوگ وقت گزاری کے لیے ہمارے ادارہ کی ممبر شپ لینا چاہیں گے تو لے سکیں۔ ان کے بھی ذہن اور مشورے کام آئیں گے۔ جو باحیثیت لوگ ہوں گے، وہ ایک چھوٹی سی رقم ہر ماہ اس ادارے کے لیے چندہ بھی دیا کریں گے تاکہ جو کسی کے مسائل حکمت عملی سے نہ سلجھ سکیں ان کے لیے قانون حاصل کیا جا سکے۔"

"تجویز تو بڑی نیک اور خوب صورت ہے۔" ابا میاں نے جیسے اپنے آپ سے بات کی۔

"ساری زندگی ابا میاں! جو میں نے چاہا۔ وہ پایا۔ اور چاہا بھی اپنی ذات کے لیے۔ اب تعلیم مکمل کرنے کے بعد یا نوکری کروں گا یا آپ کا کاروبار سنبھالوں گا تو وہ بھی صرف میرے اپنے ہی لیے ہو گا نا۔ زندگی میں مزید آسائشیں مہیا کرنے کے لیے صرف، ابا میاں! میں بہت دن پریشان رہا کہ کسی دوسرے انسان کے لیے میں نے کیا کیا۔؟"

"جزاک اللہ۔"

"میں نے اپنی سوچ صنم کو بتائی۔ پھر اس نے اپنے کالج کی اس عورت کا واقعہ سنایا یوں ابا میاں ہمیں ایسا ادارہ قائم کرنے کی ترغیب ملی۔"

"تو تمہارے ادارے کا پہلا کیس وہی عورت ہو گی۔؟"

"بالکل۔" آثم کی روشن آنکھوں میں ایک عزم تھا۔ "ہم ان شاء اللہ اس کا حق

اسے دلا کر رہیں گے۔"

"پھر ابا میاں! ہم قریبی دیہاتوں کے دورے بھی کیا کریں گے، کیونکہ وہاں کے لوگ غیر تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ یوں ان کے ہاں مسائل اور پریشانیاں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹی! سو اسولہ آنے ٹھیک۔"

"اور وہ لوگ ابا میاں! سادہ لوح اور ناسمجھ بھی ہوتے ہیں۔ جو چاہتا ہے انہیں آسانی سے ٹھگ لیتا ہے۔ دوسروں سے اپنے جائز حقوق بھی ناسمجھی اور کم علمی کی وجہ سے چھنوا لیتے ہیں۔"

"ہوں۔ بالکل درست۔"

"تو پھر ابا میاں۔؟"

"پھر کیا۔؟"

"کیا آپ ہمیں اجازت دیں گے۔؟"

"ارے بھئی ایسے نیک کام کی میں اجازت نہیں دوں گا۔؟ مجھے تو خوشی ہو رہی ہے کہ میرے بچوں کی سوچ ہم لوگوں سے زیادہ بہتر ہے۔ ہم نے تو اپنی ذات کے دائرے سے نکل کر یوں دوسروں کے لیے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ تم بیٹے! کل سے ہی اپنا مشن شروع کر دو۔ خدا تمہارے ارادوں کو استقامت دے۔ خدا تمہارے ایسے نیک خیالات کو وسعت دے۔ خدا تمہارے ایسے خوابوں کو تعبیر دے۔!!!"

"یہ کیا کھچڑی پک رہی ہے۔" امّی بیگم وہیں سے بولیں۔ "میں سن رہی ہوں سب کچھ۔ لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے اور میں اپنی زندگی میں ہی اس کے سر پر سہرا سجا دیکھنا چاہتی ہوں۔"

ابا میاں زور سے ہنس پڑے۔ آثم نے شرما کر سر جھکا لیا اور صنم آثم کے سہرے کی بات پر حیا سے دوہری سی ہو گئی۔ جانتی تھی آثم کے سر پر سہرا اسی وقت سجنا تھا جب وہ دلہن بنتی۔

"ارے بھئی بیٹے کی شادی کرنے سے تمہیں کون منع کر رہا ہے۔ تم اپنے کام میں

مگن رہو۔ کرو شادی کی تیاریاں اور ہم اپنے ادارے کی کامیابی کی صدق دل سے کوشش کریں۔"

"سچ ابا میاں! بن گیا نا ادارہ۔؟"

"ارے بیٹے! بالکل۔ بالکل بن گیا۔"

"میں پانچ چھ مہینے تک اُثمی کی شادی کر دوں گی۔" امی بیگم نے پھر اپنی کہی۔

"کر دینا بھئی کر دینا۔" ابا میاں انہیں جواب دینے کے بعد بعد پھر بچوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "تمہارا جو بھی پلان ہو گا وہ ابھی سے منظور سمجھو۔ جو رقم درکار ہو گی۔ وہ کل ہی مجھ سے لے لینا۔ بیٹے! ایسی زندہ سوچیں اگر باعمل ہوں تو انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ میرے بچو' خدا تمہاری زندگیوں کو ایسا ہی دوام بخشے۔" ابا میاں کی آواز جذبات سے بھاری ہو کر بھرا سی رہی تھی اور دونوں لرزتے ہاتھوں سے وہ آثم اور صنم کے سر سہلا رہے تھے۔

"یہ صنم بھی اس ادارے میں کام کرے گی۔؟" امی بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"جی امی بیگم! ارادہ تو یہی ہے۔"

"عورت ذات ہو۔ سوچ سمجھ لو۔"

"کیوں۔ ! عورت ذات کو نیکی کے کام کرنے سے گناہ ہوتا ہے۔؟"

"ابا میاں کی بات پر آثم اور صنم دونوں ہی بے اختیار ہنس پڑے۔ امی بیگم ہونٹ بھینچ کر مسکراہٹ دبانے کی کوشش کرنے لگیں۔ "میرا مطلب تھا اس نے اپنے والدین سے پوچھ لیا ہے۔؟"

"سب سے پہلے تو ہمیں اپنے ابا میاں سے اجازت لینا تھی۔ اور امی بیگم! آپ کو پتہ ہے ابا میاں جس کام کی اجازت مجھے دے دیں، پھر اس سے ڈیڈی بھی کبھی منع نہیں کرتے۔"

"ہاں بھئی ہاں۔ اس بٹیا پر ہمارا ان سے زیادہ حق ہے۔" ابا میاں نے اسے اپنے بازو میں لے لیا۔

"ابا میاں! میں صرف آپ کی بیٹی ہوں بس ۔۔!" اس نے ان کے کندھے کے ساتھ سر لگا دیا۔ "ڈیڈی کی وہ چار جو ہیں ۔"

"بالکل۔ بالکل۔ ٹھیک کہہ رہی ہے میری بیٹی ۔"

آثم، صنم اور ابا میاں کے لاڈ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ امی بیگم مسکرا رہی تھیں اور آنکھوں سے جیسے مامتا رس ٹپک رہا تھا۔ کچھ ایسی پیار برساتی ان کی نگاہیں صنم پہ ٹکی تھیں ۔

"خدا نے اگر ہماری وہ بیٹیاں لے لیں تو بدلے میں ہمیں صنو جیسی پیاری بیٹی بھی تو دے دی ہوئی ہے۔ شکر ہے اس پروردگار کا ۔۔!" امی بیگم نے اظہار تشکر کے طور پر نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

"اور اب جاؤ اپنے گھر ۔" آثم کی آنکھوں کی شوخی زبان پر اتر آئی۔

"اتنی رات ہو گئی۔ ہمارے ابا میاں کو گھیرے بیٹھی ہو۔ انہیں نیند آ رہی ہے ۔"

"ابے کب نیند آ رہی ہے۔ چل اٹھ تو بھاگ یہاں سے ۔ میری بیٹی میرے پاس بیٹھے گی ابھی ۔"

"ہاں ۔ یہ ابا میاں میرے ہیں ۔"

"بالکل بیٹی! صرف تیرے ۔ باپ بیٹیوں کے ہی ہوتے ہیں اور بیٹوں کو تو باپ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ۔"

"توبہ! توبہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ خدا آپ کو اثمی کے سر پر سلامت رکھے ۔"

"ایک تو یہ جو ہماری بیگم ہیں نا ۔ بات کو ذرا مشکل سے سمجھتی ہیں۔ اور جذباتی فٹافٹ ہو جاتی ہیں ۔؟"

"ابا میاں! اتنی جلدی تو ہر بات سمجھ لیتی ہیں ہماری امی بیگم ۔۔!"

"لو اب امی بیگم کی طرفداری ہونے لگی ۔۔۔ چل اٹھ بھاگ یہاں سے ۔۔۔ غدار کہیں کی ۔"

"ہاں بیٹی! اب تمہیں بھی جانا چاہیے ۔۔ اثمی! بیٹے ساتھ جاؤ اپنے گھر کے اندر

داخل ہو جائے گی ۔ تو تب واپس آنا۔ جوان لڑکی ہے ۔"

"اچھا امی بیگم! مصیبت ہی ہے یہ لڑکی ۔۔ !" بظاہر اس نے ناک بھوں چڑھائی مگر کمرے سے نکلتے نکلتے اس کے لبوں پر بڑبڑاہٹ تھی۔

"اپنی صنم کو گھر تک پہنچانے تو سر آنکھوں کے بل جاؤں گا۔ یہ تو میرا اپنا سرمایہ ہے۔ میری حیات کا انمول خزانہ۔ اس کی حفاظت تو جی جان سے کروں گا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو ۔؟"

"وہی کہہ رہا ہوں جو دل میں ہے ۔" آثم نے صنم کا ہاتھ تھام لیا۔ "صنو میری جان! زندگی کے ہر ہر قدم پر اسی طرح میرا ساتھ دو گی نا ۔؟"

"کس طرح ۔۔؟" وہ شوخی سے چہکی

"جس طرح آج ابا میاں سے بات کرتے ہوئے تم نے میرا ساتھ دیا۔ کئی دن سے سوچ رہا تھا۔ کیسے ان سے بات کروں۔ آج تم ساتھ تھیں تو حوصلے جوان رہے۔ اور ہمتیں بندھی رہیں ۔"

"تم ابا میاں سے اتنا ڈرتے کیوں ہو ۔؟"

"پتہ نہیں ۔ بس بچپن سے ہی ان سے ذرا جھجک سی محسوس کرتا ہوں ۔۔ بے تکلف ہو ہی نہیں سکا ۔"

"مجھے تو ذرا ابا میاں سے نہ کوئی جھجک وغیرہ محسوس ہوتی ہے اور نہ خوف ۔"

"تمہارا ان سے رشتہ مختلف ہے نا ۔" آثم نے صنم کی کمر کے گرد بازو حمائل کر دیا۔

"کیا مطلب ۔؟"

"وہ تمہارے سسر ہیں۔ اور تم بہو ۔ سنا ہے بہو اور سسر کی ہمیشہ بہت بنتی ہے، ساس کی نسبت بہو کو سسر سے زیادہ پیار ہوتا ہے ۔"

"ہائے اللہ ۔ !" صنم شرما دی۔

دونوں پھاٹک تک پہنچ گئے تھے۔ بے حد اندھیرا تھا وہاں۔ آثم نے شرم د

حیا میں ڈوبی صنم کو سینے کے ساتھ لگا لیا۔

"تمہارے بغیر تو رات کے یہ چند گھنٹے بھی مجھ سے گزارنا مشکل ہو جاتے ہیں، صنو! میں کیا کروں ـــــ ہوں"

○

"بہت بھوک لگی ہے امی ـــــ!" شہزاد نے گھر میں داخل ہوتے ہی شور مچانا شروع کر دیا ـــــ پھر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی ـــــ "دھنک کہاں ہے ـــــ؟"

"اپنے کمرے میں ہو گی ـــــ" امی ہاتھ میں پکڑا نیلا لفافہ اور ورق وہیں تخت پر ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں ـــــ "ابھی ابھی یہاں سے گئی ہے ـــــ" وہ نیچے فرش پر اپنے جوتے ڈھونڈنے لگیں۔

"یہ آپ کے چہرے سے پریشانی سی کیوں جھلک رہی ہے ـــــ؟"

"آؤ میں روٹی پکاتی ہوں۔ ساتھ ساتھ کھانا کھانا ـــــ ساتھ ساتھ بات کریں گے"

امی کی جوتی مل گئی تھی ـــــ پہنتے ہوئے باورچی خانے کی طرف چل دیں ـــــ شہزاد بھی پیچھے لپکا۔ "بیحد بھوک لگی ہے ـــــ"

"محنت بھی تو بہت کرتے ہو ـــــ" امی نے گیس کے چولہے کو کھول کر اسے دیا سلائی دکھائی ـــــ پھر توا اوپر رکھ کر آٹے کا پیڑا بنانے لگیں۔

"کاشی کے مقدمے کا کب تک فیصلہ ہو جائے گا ـــــ؟"

"کوشش تو اپنی پوری کر رہا ہوں کہ وہ جلد از جلد گھر آ جائے ـــــ آگے جو خدا کو منظور ـــــ!"

"دھنک کی ساس کا یہ تیسرا خط ہے"

"کیا کوئی فکر کی بات ہے ـــــ؟"

"شادی جلد کرنے پر مصر ہیں ـــــ آثم نے ایم اے پاس کر لیا ہے نا، اور نوکری وغیرہ کی انہیں ضرورت نہیں۔ باپ کا لاکھوں کا کاروبار ہے وہ سنبھال لیگا ـــــ"

"عجیب خود غرض سے لوگ ہیں ـــــ ہم ایسی الجھنوں میں پھنسے ہیں اور انھیں شادی کی پڑی ہے ـــــ"

"نہیں بیٹا! وہ لوگ خود غرض نہیں ـــــ ہم پر ڈھے جانے والے اس غم کے پہاڑ کا انہیں تو علم ہی نہیں ـــــ"

تو آپ انہیں لکھ دیتیں نا ـــــ"

"نہ بیٹے! بیٹی کی سسرال کا معاملہ ہے ـــــ اگر بات چھپی ہوئی ہے تو بہتر ہے چھپی رہے۔ سسرال کے گھر میں بھائیوں کا بڑا مان ہوتا ہے۔ دھنک کا یہ مان اور بھرم قائم ہی رہنا چاہیئے ـــــ"

"پھر کاشف کی غیر موجودگی میں شادی بھی تو نہیں ہو سکتی ـــــ"

"وہ تو نہیں ہو سکتی ـــــ اور میں یہی سوچ رہی تھی کہ ابھی انھیں کچھ دیر اور انتظار کرنے کا لکھوں تو عذر کیا پیش کروں ـــــ تین چار خط اسی مطالبے کے آ چکے ہیں ایک ہی ایک اولاد ہے نا بیچاروں کی ـــــ اس کی خوشیاں دیکھنے کو دل چاہتا ہو گا"

شہزاد چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا کھانا کھاتا رہا اور کچھ سوچتا رہا۔

"شہزاد بیٹے پھر تم نے کوئی مشورہ نہیں دیا ـــــ؟"

"اگر انھیں اتنی ہی جلدی ہے ـــــ خوشیاں دیکھنے کا ایسا ہی ارمان ہے تو اپنے بیٹے کی کہیں اور شادی کر لیں ـــــ"

"نہیں بیٹے ایسی بات تو اب سوچی بھی نہیں جا سکتی ـــــ دھنک آثم کی بچپن کی منگیتر ہے ـــــ یہ رشتہ تو اب چاہیں بھی تو نہیں ٹوٹ سکتا ـــــ اور ویسے بھی خدانخواستہ اگر ایسی کوئی بات ہو جائے تو ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ ان کا لڑکا خوبصورت ہے قابل ہے، دولت والا ہے، اسے لڑکیوں کی کمی نہیں ہو گی ـــــ مصیبت البتہ ہم پر آن پڑے گی ہماری ہی لڑکی کا پھر کہیں اور رشتہ نہیں ہو گا ـــــ"

"کیوں کیا عیب ہے اس میں ـــــ؟"

"عیب بے شک کوئی نہیں مگر ساری برادری میں یہ مشہور ہے کہ آثم کے ساتھ دھنک

کی منگنی ہوئی ہوئی ہے، ہمارے گھر تو کوئی پھیرا ہی نہیں ڈالے گا۔"

"اس کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ آثم سے زیادہ لائق لڑکا ڈھونڈ دونگا۔"

"نہ بیٹے جان چلی جائے بیشک، مگر زبان سے کیا ہوا وعدہ نہیں توڑتا۔ ان کیطرف سے اگر کوئی بات یا خدانخواستہ گڑبڑ ہوگئی تو پھر دوسری بات ہے۔ ہم اپنی طرف سے پکے ہی رہیں گے۔"

"آپ نے بھی تو پرانے زمانے کے جاہل لوگوں والی حرکت کی ہے۔ لڑکے نے آج تک لڑکی کو نہیں دیکھا۔ اور لڑکی نے لڑکے کو نہیں۔"

"کیوں نہیں۔" امی اس کی بات کاٹ کر مسکرا پڑیں۔ "آثم کی سینکڑوں تصویریں ہمارے ہاں ہیں اور ہماری لڑکی کی ان کے ہاں۔"

"شکل صورت کے علاوہ بھی انسان کی شخصیت میں کچھ ہوتا ہے۔ عادات و اطوار اخلاق کردار اور۔"

"سب کچھ ٹھیک ہے بیٹے! بہت مناسب ہے۔ شکل تصویروں میں دیکھ لی ہوئی ہے اور عادات و اطوار جب والدین کے اتنے اچھے ہیں تو اولاد کے کیوں نہ ہونگے"

امی نے روٹی توے پر سے اتاری تو شہزاد نے کھانا ختم کرنیکا اعلان کر دیا۔

"تم نے آج کم کھانا کھایا ہے۔"

"نہیں۔ بہت سیر ہو لیا۔" شہزاد اٹھتے ہوئے بولا۔ "کسی پیسے دھیلے کی، کپڑے وپڑے یا کسی اور چیز کی ضرورت ہو امی! تو آپ کو میری قسم، جھجکیے گا بالکل نہیں۔ بے تکلفی سے کہہ دیجئے گا۔"

"اے بیٹے! تم نے خود سے ہی کوئی کمی نہیں رہنے دی۔ بغیر مانگے ہی ہر چیز مہیا رکھتے ہو، خدا تمہیں برکت دے، کسی نیک ماں کا دودھ پیا ہے، ہمارے لئے رحمت کا فرشتہ ہو تم تو۔" امی ساتھ ساتھ چیزیں سنبھال رہی تھیں، ساتھ ساتھ شہزاد کو ڈھیروں ڈھیر دعائیں دیئے جا رہی تھیں۔ شہزاد سنتے ہوئے اور پھر مسکراتے ہوئے باورچی خانے سے باہر نکل آیا، ادھر ادھر دیکھا۔ دھنک اب بھی کہیں دکھائی نہیں

دی تو اس کے کمرے کیطرف چل پڑا۔

مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح بہت آہستہ آہستہ اس کی باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ گھر میں ان تینوں کے علاوہ اور تو کوئی متنفس موجود نہیں تھا پھر وہ کس سے محو گفتگو تھی؟ متعجب سا ہوتے ہوئے شہزاد نے تھوڑا سا پردہ سرکا کر اندر جھانکا۔ وہ تو اکیلی بیٹھی تھی۔ شائد وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ "بھولی لڑکی! تیرا بچپن ابھی بھی نہیں گیا۔" شہزاد پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ قدموں کی چاپ پر دھنک نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔

"اوہ! آپ۔" اس نے گھبرا کر جلدی سے اپنی گود میں کچھ چھپا لیا۔

"کیا ہے۔؟" شہزاد کا تجسس بےچین ہو گیا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔" زبان پر کچھ نہیں تھا، مگر انداز کہہ رہے تھے کہ بہت کچھ تھا جو اس نے گود میں چھپا رکھا تھا۔ شہزاد نے آگے بڑھ کر بڑی بے تکلفی سے اس کے ہاتھ پر سے ہٹانے کی کوشش۔

"دیکھئے۔ یہ بات غلط ہے۔" دھنک کو اس کی یہ بے تکلفی اچھی نہ لگی قدرے ناگواری سے بولی۔ "یوں ہاتھا پائی نہ کیجیے۔"

"پھر تم خود ہی بتا دو نا کیا چھپایا ہے۔؟"

اور دھنک نے اس ڈر سے کہ وہ دوبارہ چھینا جھپٹی نہ شروع کر دے، جو کچھ چھپایا تھا جلدی سے اس کے سامنے کر دیا۔ آثم کی ڈگری والی بیحد خوبصورت تصویر شہزاد کا منہ چڑا رہی تھی۔

"چاند اللہ کی طرف توجہ دیا کرو دھنک بی بی۔!"

"ہائے ہائے! یہ کیسی بات آپ نے کہہ دی۔" دھنک نے شہزاد کی بات کا جیسے برا منا لیا۔ "خدا آثم کو رہتی دنیا تک سلامت رکھے۔"

انتہائی عقیدت اور محبت بھری نگاہوں سے آثم کی تصویر کو دیکھتے ہوئے اسے سنبھال کر رکھنے کیلئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ شہزاد بڑے غور سے اس کی حرکات و

سکنات کو دیکھ رہا تھا۔ "آثم تمہیں بہت پسند ہے۔۔۔؟"

"پسند۔۔۔؟" دھنک کی خوبصورت آنکھوں میں جیسے کئی قندیلیں روشن ہو گئیں۔

"پسند تو بڑی چھوٹی بات ہے۔۔۔"

"ہوں۔۔۔" سجانے شہزاد کی اس لمبی سی ہوں کا کیا مطلب تھا وہ تو بس اپنے میں ہی ڈوبی رہی۔ معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی، پتہ نہیں اس کے ذہن میں کونسی سوچ تھی، ہونٹوں پر بڑی خوبصورت سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی اور آنکھوں سے جیسے ساغر چھلک رہے تھے۔ عقیدت و محبت کے نشے میں چور چور لڑکھڑاتی چال سے وہ تصویر ہاتھوں میں لئے اور بغور اسی کو دیکھتے دیکھتے الماری کی طرف بڑھی۔

"تمہیں کبھی اپنے کاشی جی کا بھی خیال آیا ہے۔۔۔؟" شہزاد کا یہ طنزیہ سا سوال اسے بڑا عجیب سا لگا۔۔۔ چونک کر دھنک مڑی۔

"اپنے کاشی جی کا خیال۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔؟"

"ہر وقت انہی تصویروں میں گم رہتی ہو۔۔۔" شہزاد نے بڑی تیکھی سی نگاہ سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"کاشی جی کیلئے جسطرح میں دن رات دعائیں مانگتی رہتی ہوں وہ کچھ میں ہی جانتی ہوں۔۔۔"

"اور جو ہر وقت ان تصویروں "

"دیکھئے شہزاد بھائی۔۔۔" اس نے شہزاد کی بات درمیان میں ہی قطع کر دی، اس کا یہ انداز یہ لہجہ اسے ذرا اچھا نہیں لگا تھا، مگر بڑے تحمل کے ساتھ دھنک نے اپنا لہجہ ہموار رکھا "کاشی جی کا اور میرا رشتہ آثم کے رشتے سے بہت مختلف ہے اور بیک وقت یہ دونوں رشتے، دونوں جذبے اپنی اپنی شدت کے ساتھ دل میں موجود رہ سکتے ہیں۔ اب بھی میں آثم کی تصویر کے ساتھ اپنے کاشی جی ہی کی باتیں کر رہی تھی۔"

"تصویر کے ساتھ کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔۔۔"

"اور اپنا ہے کون۔۔۔؟" دھنک کی آواز یکایک بھرا سی گئی۔

"کسی کو سمجھ کر تو دیکھو۔۔۔"

"آپ کا خیال ہے کہ میرا دل پتھر ہے شاید۔۔۔" جہاں ابھی ستارے جگمگا رہے تھے۔ وہیں جیسے اب بادل برسنے کو تیار تھے۔ بھیگی بھیگی سی پلکیں جھپکاتے ہوئے وہ شہزاد کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ کاشی جی کو میں کس طرح اپنا سمجھتی تھی اور اب ان کے بغیر مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔۔۔" اس نے ہاتھوں میں اپنا روشن چہرہ چھپا لیا۔۔۔ "کچھ بھی اپنا نہیں لگتا۔۔۔"

اتنی تم ان کے بغیر اداس ہو، چلو آج پھر ان سے ملوا لاؤں۔۔۔"

شہزاد نے بڑی ہمدردی سے اس کے بے کل وجود کو دیکھا۔

"جی تو بہت چاہتا ہے ایک نظر ہی سہی، ایک بار پھر اپنے کاشی جی کو دیکھ آؤں، مگر اب وہاں نہیں جاؤں گی۔۔۔ خواہ تڑپ تڑپ کر مر جاؤں۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"اس دن جب ان سے ملنے جیل میں گئی تھی تو کاشی جی نے کہا تھا کہ مجھے وہاں نہیں جانا چاہیئے تھا۔ جو بات انہیں پسند نہیں ہوتی میں وہ کبھی نہیں کیا کرتی۔۔۔"

"کیا نہیں کیا کرتیں۔۔۔؟" امی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"جو بات میرے کاشی جی کو ناپسند ہو۔۔۔"

"بڑے بھائی کا حکم مانا ہی کرتے ہیں۔۔۔"

"وہ تو میرے جانے کیا کیا ہیں۔۔۔ بڑے بھائی، باپ، دوست۔۔۔ میں تو آجتک سمجھ ہی نہیں پائی۔۔۔" اسکی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

"یہ تم رو کیوں رہی ہو۔۔۔؟" امی اس کے قریب آ کھڑی ہوئیں۔

"کاشی جی یاد آ رہے ہیں۔۔۔" دھنک کے بجائے شہزاد نے جواب دیا۔

امی چپ سی ہو گئیں۔ بیٹے کی یاد سے انکی آنکھیں بھی آب گوں ہونے لگیں۔

"ارے امی آپ بھی۔۔۔" شہزاد نے بڑے غور سے انکے چہرے کی طرف

دیکھا "آپ بھی یوں پریشان ہونے لگیں گی تو دھنک کا حال اور بھی خراب ہوگا۔ او امی! میرے ہوتے ہوئے بھی آپ کاشف کیلئے فکریں اور آنسو بہائیں۔ یہ تو پھر میرے ساتھ زیادتی ہوگی نا۔ کیا مجھ پر آپ کو بھروسہ نہیں ـــــ؟"

"ہے کیوں نہیں بیٹے! اسی لئے تو جو تم کہتے ہو وہی کرتی ہوں۔ سب کچھ تمہارے اوپر ہی تو چھوڑا ہوا ہے۔"

"شکریہ! اور یہ فکر، پریشانی اور آنسو بھی میرے لئے چھوڑ دیں۔ میں آپ کو صرف خوش دیکھنا چاہتا ہوں ـــــ"

"جگ جگ جیو بیٹے! خدا تمہارا بھلا کرے اور تمہیں ان نیکیوں کا اجر دے اور سدا خوش و خرم رکھے ـــــ" امی لگاتار دعائیں دیئے جارہی تھیں۔

"مجھے خوش رہنے کی دعا دے رہی ہیں نا تو پھر جلدی سے آپ اور دھنک تیار ہو جائیے ـــــ"

"کیوں ـــــ؟"

"آپ دونوں خوش ہوتی ہیں تو مجھے خوشی ملتی ہے ـــــ چلیئے تھوڑی سی آپ کو سیر کرا لاؤں ـــــ ذرا دل بہل جائے گا"

"لیکن بیٹے ـــــ"

"نہیں امی! لیکن ویکن کچھ نہیں ـــــ یوں ہر وقت گھر کے اندر گھسا رہنے اور غم فکر سے آپ کی صحت متاثر ہو رہی ہے۔ اور دھنک کا بھی رنگ روپ پہلے جیسا نہیں رہ گیا۔ آپ نے کبھی میرا بھی احساس کیا کہ کاشف جب بری ہو کر آیا تو مجھے بھی اسے منہ دکھانا ہے ـــــ"

"بیٹے! تو تو سرخرو ہی سرخرو ہے۔ اس کے لئے اتنی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ اس کا گھر بار سنبھالا ہوا ہے۔ اس کی ماں اور بہن کو ہر آسائش مہیا کرتے ہو ـــــ"

"لیکن اگر آپ دونوں کی صحت پہلے جیسی نہ رہی تو یہ میرے لئے بدنامی کی بات ہوگی ـــــ" شہزاد نے بڑھ کر بڑی محبت سے امی کا بازو تھام لیا اور قدرے

شاکی انداز میں بولا "کیا میرے ساتھ جانے پر آپ کو کوئی اعتراض ہے ـــــ؟"

"توبہ توبہ! کیسی باتیں کرتے ہو بیٹے؟ اگر ایسی بات ہوتی تو تمہارے مشورے پر اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آ بیٹھتے ـــــ تم پر تو ہمیں اس طرح اعتبار ہے جیسے کسی معاملے میں کاشف پر ہو ـــــ"

"تو بس پھر جلدی سے تیار ہو جائیے" شہزاد تاکید کرتے ہوئے کمرے سے باہر جاتے جاتے پھر بولا ـــــ "میں بھی ذرا ہاتھ منہ دھو کر لباس تبدیل کر آؤں"

"میں نہیں جاؤں گی ـــــ" اس کے کمرے سے نکلتے ہی دھنک اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے بلند آواز میں بڑبڑائی۔

"کیوں ـــــ؟"

"میرا جی نہیں چاہتا ـــــ"

"نہیں بیٹی! اسکی خوشی کی خاطر ہمیں ضرور جانا چاہیئے"

"لیکن میں اس کے ساتھ تو جانا نہیں چاہتی"

"کیا ـــــ؟" امی کی آواز میں برہمی تھی ـــــ وہ سہم گئی۔

"مناسب نہیں لگتا ـــــ"

"کیا مناسب نہیں لگتا ـــــ؟" امی نے قدرے الجھ کر پوچھا۔

"کاشی جی کی غیر موجودگی میں کسی غیر کیساتھ گھومنا پھرنا ـــــ"

"وہ غیر ہے ـــــ؟" امی تیکھے لہجے میں بولیں "ہمارے لئے جان تک دیئے دے رہا ہے بیچارہ اور پھر بھی غیر ہے۔ اچھا اس کے احسانوں کا بدلہ دے رہی ہو گڑیا ـــــ!"

"تو کیا اس کے احسانوں کا بدلہ صرف یونہی اتر سکتا ہے امی! کہ کاشی جی جیل میں پڑے رہیں اور ہم اس کے ساتھ سیر سپاٹے کرتے پھریں ـــــ"

"سیر سپاٹوں کی بات نہیں ہے۔ وہ تو ہماری ہی خاطر جانے کو کہہ رہا تھا کہ یوں ذرا دل بہل جائے گا ـــــ"

"مجھے اپنا دل بہلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ـــــ کہیں بھی چلی جاؤں کاشی جی

کے بغیر میرا دل نہیں بہل سکتا ـــــ" دھنک اٹھ کر بکھری چیزیں سمیٹنے لگی ـــــ "آپ چلی جائیں ـــــ"

امی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو لئے بڑبڑانے لگیں۔

"بیوگی بھی ایک عذاب ہوتی ہے ـــ نہ کوئی کمانے والا سر پہ نہ کوئی اور آسرا، اوپر سے یہ مصیبت آن پڑی ہے، اپنا گزارہ اگر سلائی کڑھائی کر کے کر بھی لیتی تو مقدمے کا خرچ تو چلنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اور اب جب خدا نے ہماری مدد کو یہ ایک فرشتہ بھیج دیا ہے تو اس کے ساتھ برا سلوک کر کے ہم خود اسے بھگائے دے رہے ہیں ـــ ٹھیک ہے وہ بھی ہمارے سلوک سے تنگ آ کر اک دن ہمیں ہمارے حال پہ چھوڑ دے گا، پھر بھائی پھانسی ......"

"امی ـــ!" دھنک یکایک چلا پڑی ـــــ "یہ آپ کیا کہے جا رہی ہیں۔؟"

"میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں ـــ؟" امی روتے ہوئے بولیں "جیسا سلوک تم اسکے ساتھ روا رکھتی ہو دیکھ لینا ایک دن یہی ہو گا ـــــ آخر کوئی کب تک برداشت کر سکتا ہے ـــ بیٹا میرا ہے ـــ بھائی تمہارا ہے۔ اس کا تو صرف دوست ہے نا، اور دوست دنیا میں بہت مل جاتے ہیں۔"

"امی پلیز! یہ کچھ مت کہئے ـــ اگر شہزاد کے ساتھ سیر کیلئے نہ جانے کا اثر کاشی جی کے مقدمے پر پڑ سکتا ہے تو میں چلونگی۔ ضرور چلوں گی ـــــ صرف اپنے کاشی جی کی خاطر ـــ" دھنک چپکے چپکے اپنی بھیگی آنکھیں صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی ـــ "چلیئے ـــ"

"امی تیار ہیں تو آجایئے ـــــ میں گیراج میں سے گاڑی نکالتا ہوں ـــ" باہر سے شہزاد کی آواز آئی تو دھنک خود ہی دوپٹہ ٹھیک طرح اوڑھتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ امی بھی پیچھے پیچھے چل دیں۔

برآمدے میں آئیں تو دھنک ایک ستون کے ساتھ لگی گم سم سی کھڑی تھی اور شہزاد گیراج میں سے گاڑی نکال رہا تھا۔

"جہاں یہ احسان کیا ہے وہاں اتنا اور کر دو کہ اپنا مزاج ذرا درست کر لو ـــ" امی کا لہجہ طنزیہ تھا جواب میں دھنک چپ رہی۔

"آیئے امی ـــ!" شہزاد نے گاڑی کی کھڑکی میں سے سر نکال کر آواز کے ساتھ ساتھ اشارے سے بھی بلایا۔

امی جلدی جلدی دروازے کو تالا لگانے لگیں اور دھنک خاموشی سے جھکے ہوئے سر کو مزید جھکائے برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گاڑی کیطرف چل دی۔

"ارے! یہ تیار ہوئی ہو ـــ؟"

"اس وقت لباس تبدیل کرنیکا موڈ نہیں تھا ـــ" بڑی کوشش سے دھنک نے اپنا لہجہ ہموار رکھا۔ حالانکہ دل چاہ رہا تھا اسے صاف کہہ دے۔

"میں تو جانا ہی نہیں چاہتی ـــــ" مگر امی کی باتیں کانوں میں گونج گئیں۔

"چلو موڈ نہیں تھا تو نہ سہی ـــــ یوں بھی ٹھیک ہے ـــ" شہزاد اسے غور سے دیکھتے ہوئے انتہائی خوشگوار لہجے میں بولا ـــ "ماشاء اللہ ہماری دھنک کی صورت ایسی ویسی چیزوں کی محتاج بھی تو نہیں۔"

بغیر کوئی جواب دیئے دھنک چپکے سے پچھلا دروازہ کھول کر گاڑی کے اندر بیٹھ گئی ـــ امی سب دروازے وغیرہ بند کر کے آئیں تو شہزاد انھیں اپنے پاس اگلی سیٹ پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

"اکیلا آگے بیٹھا رہ گیا تو میں آپ دونوں کا صرف ڈرائیور ہی لگوں گا۔" پھر شہزاد خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا "یوں تو میں اپنی امی کا ڈرائیور ہی بن جاؤں تو زہے نصیب۔"

"ڈرائیور کیوں ـــ تم میرے بیٹے ہو"

"شکریہ امی ـــ!"

شہزاد نے گردن پیچھے موڑ کر دھنک کو اک نظر دیکھتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

○

”نانی اماں کے گرد پھر غول بیابانی موجود ہے ۔“

” آپ بھول گئے گول بانی ۔ہم تو لڑکیاں ہیں ۔“ ننھی نمو نے جھٹ آثم کی بات کا بدلہ اتارا ۔” دیکھئے نانی اماں ! یہ بھائی جان ہمیں کیا کیا کچھ کہتے رہتے ہیں ۔“

”فوراً تو بدلہ اتار لیا تھا پھر شکایت کا مطلب ۔؟“ نانی اماں کی گود سے گھسیٹ کر آثم نے نمو کو اپنی گود میں بھر لیا ۔

” بڑی دیر کر کے آئے ہو ۔؟“ امی بیگم کی آواز پر آثم مڑا ۔ وہ کونے والے چھوٹے صوفے پر بیٹھیں بنائی کر رہی تھیں ۔

” السلام علیکم امی بیگم ۔ “ وہ نمو کو گود میں اٹھائے اٹھائے ان کے پاس چلا گیا ۔

” وعلیکم ۔ نو بجنے والے ہیں دوپہر بھی کھانے پہ انتظار کرتی رہی اور اب بھی انتظار کر کر کے ابھی کھایا ہے ۔“

” آپ کو تو میں نے کئی بار کہا ہے کہ انتظار نہ کیا کیجئے ۔“ آثم نمو کو پیار کرتے ہوئے بولا ۔

” ہائے ! مجھے اتار دیئے میں نانی اماں سے کہانی سن رہی ہوں ۔“ وہ آثم کے پیار سے قدرے الجھتے ہوئے بولی ۔

” کہانی ۔؟ آہا ! وہ تو ہم بھی سنیں گے ۔“ آثم اسے گود میں لئے لئے نانی کے پاس جا بیٹھا ۔

” آثمی !“ امی بیگم آوازیں دینے لگیں ۔” بیٹے ! کھانا تو کھالو ۔“

” امی بیگم بھوک نہیں ہے ۔“

” کیوں ۔؟ دوپہر کو بھی نہیں کھایا اور اب بھی بھوک نہیں ہے ۔؟“

” کس نے کہا دوپہر کو نہیں کھایا ۔ کھایا امی بیگم ! اور خوب ڈٹ کر کھایا ۔“

” کسی ہوٹل میں ۔؟“

” ہوٹل میں امی بیگم ! کون ڈٹ کر کھا سکتا ہے وہاں تو ہر نوالے کے ساتھ جیب کی فکر رہتی ہے ۔“

” مگر تمہیں تو تمہارے ابا میاں نے جیب کا فکر رہنے ہی نہیں دیا ہوا ۔“

” کیا کاٹ لی ہے ۔؟“

” یہ کیا بک رہے ہو ۔؟“

” آپ خود ہی تو کہہ رہی ہیں کہ جیب کا فکر رہنے نہیں دیا ۔“

امی بیگم بیٹے کی شرارت پر مسکرا پڑیں ۔” میرا مطلب تھا کہ ضرورت سے بھی زیادہ لے لیتے ہو ۔“

” لیتا نہیں امی بیگم ! خود ہی دیتے ہیں ۔ اپنے ابا میاں کی نیک اولاد ہوں“ آثم سینہ تانتے ہوئے بولا ۔

” ہم بھی بھائی جان ! نیک اولاد ہیں نا ۔؟“ پونہ نانی اماں کی کہانی کے بجائے انہیں کی باتیں شاید سن رہی تھی ۔

” نہیں ۔ تم سب میں سے صرف تمہاری صنم آپی نیک اولاد ہے ۔“

” کیوں ۔؟ وہ کیوں ۔؟ اور ہم کیوں نہیں ۔؟“ انجم چمک کر بولی ۔

” ایک فقرے میں تین کیوں ۔ یہ تم نویں جماعت تک کیسے پہنچ گئیں ۔“

” کیوں ۔؟“

” پھر کیوں ۔؟“ تمہیں کیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا ۔؟“

اور سبھی زور زور سے ہنسنے لگیں ۔

” یہ آثمی بھائی جان بھی بس ایسے ہی ہیں ۔“ انجم خفیف سی ہو گئی ، پھر قدرے توقف بعد اپنی خفت مٹانے کیلئے جلدی سے بولی ۔” بھائی جان ! آپ کو آج کا ایک بڑا ہی مزیدار واقعہ سناؤں ۔؟“

"ضرور، ضرور ——"

"آپ کو یہ تو پتہ ہی ہے نا کہ ممی کو اچھی اچھی نسل کی مرغیاں رکھنے کا بڑا شوق ہے!"

"ہاں —— نہ صرف مرغیاں رکھنے کا بلکہ تمہاری ممی کو اور بھی بے شمار قسموں کے جانور پالنے کا بڑا شوق ہے" آثم نے ایک معنی خیز سے تبسم کے ساتھ ساری بہنوں کو باری باری دیکھا۔

"اچھا۔ تو آپ ہم کو جانور کہہ رہے ہیں ——؟"

"بڑی سمجھدار ہو ——!"

"امی بیگم —— ! امی بیگم ——!!"

"ارے ارے! میری شکایت بعد میں لگا لینا، پہلے وہ مزے کی بات تو سنا لو جو سنانے لگی تھیں، ورنہ بیچ میں ہی رہ جائے گی ——"

"اوہ —— ! ہاں تو ہوا یہ کہ دو تین دن ہوئے ممی نے ایک مرغی بڑے مہنگے ولائیتی انڈے لے کر ان پر بٹھائی —— آج منو کھیلتی کھیلتی اس ڈربے کیطرف جا نکلی جہاں وہ مرغی انڈوں پر بیٹھی تھی۔ مس صاحبہ نے کیا کیا، مرغی کو انڈوں پر سے اٹھا کر سارے انڈے توڑ دیئے اور انکی جگہ باورچی خانے میں سے آلو لا کر رکھ دیئے اور پھر اسی طرح ان پر مرغی بٹھا دی ——"

آثم کے قہقہے تھم نہیں رہے تھے —— منو گود میں تھی —— اسے پیار کرتے ہوئے پوچھنے لگا —— "منو جی! آلو اچھی نسل کے رکھے تھے نا ——؟"

"بڑے شریر ہو آثمی!" امی بیگم بھی اسکی بات سن کر ہنس رہی تھیں۔

"اتنا ان کا نقصان ہوا اور تم ہنس رہے ہو ——"

"اور امی بیگم آپ بھی تو مجھے کچھ ایسی افسردہ دکھائی نہیں دے رہیں ——"

امی بیگم کی پھر ہنسی چھوٹ گئی۔

"جلدی سے کہانی ختم کیجئے نا نانی اماں! پھر مجھے ٹیسٹ کی تیاری بھی کرنا ہے ——"

ارم ادھر ادھر کی گفتگو سے بور ہو کر بولی۔

"ہو جائے گی تیاری —— اب میں آیا ہوں تو محفل برخاست نہیں ہونے دوں گا۔ بلکہ اب جمے گی زور شور سے —— یاد ہے نا آج لطیفوں کی باری ہے ——"

"کہیں سے کوئی نیا تازہ سن آئے ہوں گے نا ——" انجم مسکرائی۔

"بھئی میں تو آج کوئی لطیفہ نہیں سناؤں گی ——" ارم قدرے بدمزاجی سے بولی۔

"تمہیں ضرورت ہی کیا ہے —— تم تو بذاتِ خود اک بجد ہنسانے والا لطیفہ ہو —— تمہاری باری پر سب تمہیں ایک ایک نظر دیکھ ہی لیں گے تو ہنس ہنس کر دوہرے ہونے لگیں گے ——"

"کیوں امی بیگم ——؟" وہ بسورتے ہوئے امی بیگم کے پاس چلی گئی "میری شکل بڑی خراب ہے ——؟"

"نہیں تو بیٹی! کس نے کہا ——؟"

"بھائی جان کہتے ہیں ——"

"آثمی! یہ تم نے ارم کو کیا کہا ہے ——؟"

"کچھ نہیں امی بیگم! یہ تو ہے ہی بس لتری کن کتری ——"

"دیکھئے دیکھئے —— کیا کہہ رہے ہیں ——؟"

"آثم اٹھو وہاں سے —— اچھی بھلی لڑکیاں نانی اماں کے پاس بیٹھی تھیں تم تو نری فساد کی جڑ ہو۔ تمہارے آنے کے ساتھ ہی رونا دھونا شکوے شکایات شروع ہو گئیں ——"

"بھائی جان فساد کی جڑ —— ! بھائی جان فساد کی جڑ ——!" سب لڑکیاں تالیاں پیٹ پیٹ کر کورس کے انداز میں سر ملا کر گانے لگیں۔

"ہٹ چڑیلو! ایک تو میری اکلوتی نانی پر غاصبانہ قبضہ جما لیا ہوا ہے پھر اوپر سے یوں چڑاتی ہیں ——"

"آثم آؤ نا میرے پاس ——" امی بیگم نے اسے پکارا —— "آؤ مجھے بتاؤ، دوپہر کا کھانا تم نے کہاں کھایا تھا"

"وہ —— صنوکی کٹک شاپ والی صغرا کے گھر سے —— وہ آکر ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"اس کے گھر سے ——؟" امی بیگم جیسے اچھل سی پڑیں۔ "وہ تو کالج میں رہتی تھیں"

"مگر اب چلی گئی نا اپنے گھر ——"

"کون سے اپنے گھر ——؟"

"باپ کی جائیداد میں سے جو اس کے حصے میں آیا ہے ——"

"سچ مل گیا اسے اس کا حصہ ——؟" امی بیگم کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

"ہاں مل تو گیا —— لیکن ہمیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا —— کچھ نہ پوچھیے کس کس طرح اس کے بھائیوں کو راضی کیا ہے۔ قرآن و حدیث کی مثالیں دیں۔ عاقبت کا خوف دلایا، پورا مہینہ لگا ہے۔ انہیں سمجھانے میں۔ تب کہیں راہ راست پر آئے ہیں ——" پھر آثم قدرے تعجب سے بولا۔ "میں تو امی حیران رہ گیا۔ صغرا تو خاصی مالدار ہو گئی ہے۔ اس کا باپ بڑی جائیداد چھوڑ کر مرا تھا ——"

"اور وہ بیچاری کن حالوں میں گزارہ کرتی رہی ——"

"تو یہ امی! بعض لوگ پڑھے لکھے ہو کر بھی بڑے اجڈ اور جاہل ہوتے ہیں —— صغرا کے بھائی ایسے ہی تھے۔ قرآن کے حکم پر بھی اپنے خاندان کے رسم و رواج کو ترجیح دیتے تھے ——"

"چلو اس کا معاملہ تو سلجھ گیا —— خوش ہو گی بہت ——"

"بہت —— نہ صرف وہ، بلکہ اس کے بچے بھی اس اتنے بڑے گھر کے مالک بن کر اندر باہر گھوم پھر رہے تھے۔ اسی وقت محلے والے مبارک باد دینے آنا شروع ہو گئے۔ معمولی معمولی کام کرنے والے لوگ جو کل تک اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ باری باری سب اسے سلام کرنے آئے ——"

"چڑھتے سورج کا یہاں ہر کوئی پجاری ہے ——"

"افسوس ہوتا ہے لوگوں کی ایسی پست ذہنیتیں دیکھ کر۔"

"صنم کہاں ہے ——؟"

"اپنے گھر ——"

"کیا وہ بھی ابھی آئی ہے ——؟"

"ہاں ہم دونوں صغرا کے گھر سے ہی آ رہے ہیں —— ابا میاں کہاں ہیں ——؟"

آثم نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ "یہ ہماری پہلی پہلی کامیابی ہے۔ اور ابا میاں کی ہدایات کے تحت ہی سب کچھ ہوا ہے۔ انہیں تو سب سے پہلے یہ خبر سنانا چاہیئے تھی ——"

"اور تم تو آتے ہی بچوں کو چھیڑ چھاڑ میں لگ گئے تھے۔"

"وہ در اصل ——" آثم خجل سا ہو کر سر کو کھجلانے لگا۔ "یہ ساری مخلوق جب اکٹھی دکھائی دے جاتی ہے تو میرا دل انہیں ستانے کے لئے بے قرار ہو اٹھتا ہے۔"

"بڑی پیاری بچیاں ہیں۔ دیکھ لو ہماری کمی خدا نے کس طرح پوری کر دی ہوئی ہے۔"

"آثم بیٹے! تم کب آئے ——؟" ابا میاں تسبیح پھیرتے ہوئے اندر آ گئے —— بہت انتظار کرایا تم لوگوں نے ——"

"السلام علیکم!" آثم جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"وعلیکم السلام!" وہ امی بیگم کے ساتھ والے صوفہ پر بیٹھ گئے۔

"ابا میاں ——" خوشی کی اک طویل سی چیخ کے ساتھ ہنستا ہوا گلنار چہرہ لئے صنم اندر داخل ہوئی —— لپک کر ان کے صوفے کے پیچھے سے ان کے گلے میں دونوں بازو حائل کرتے ہوئے بولی۔ "سب ٹھیک ہو گیا ابا میاں ——! صغرا کو اس کے باپ کی جائیداد میں سے اس کا صحیح حصہ مل گیا —— ہائے! میں کتنی خوش ہوں ——"

"خدا تجھے سدا خوش رکھے بیٹی ——!"

"میں آپ کو کیسے بتاؤں ابا میاں کہ مجھے کیا محسوس ہو رہا ہے۔ صغرا کا ایسا بشاش چہرہ میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔ مجھے لگتا ہے —— مجھے لگتا ہے ——" وہ ہانپ رہی تھی۔ وفور مسرت اور جذبات کی شدت نے اس کے پورے وجود میں کپکپاہٹ سی پیدا کر دی تھی۔

"آجاؤ۔ یہاں میرے پاس بیٹھ کر بات کرو" ابا میاں نے لرزتا، کپکپاتا اس کا

ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا — امی بیگم اور آتم اس کے تمتاتے اور جگمگاتے چہرے کو تکے جا رہے تھے۔ بڑا سہانا منظر تھا۔ صنم جلدی جلدی خود ہی انہیں ساری واردات سنانے لگی۔

"چلو جی — ٹیپ ریکارڈر چل پڑا —" آتم نے فقرہ چست کیا۔

"چپ کرو، میں بھی سن رہی ہوں" امی بیگم نے ترچھی نگاہ سے اسے دیکھا۔

"عورتوں کو باتیں کرنے اور سننے کا بڑا چسکا ہوتا ہے" آتم بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر پرے نانی اماں والے گروپ میں جا بیٹھا۔

"کہانی ختم، پیسہ ہضم —" نانی اماں نے کہانی ختم کرتے ہوئے معمول کے مطابق اپنا آخری فقرہ بولا۔

"چلو بھئی اب لطیفوں کی باری"

"بھائی جان! سب سے پہلے میں سناؤں —؟" پونہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آتم کے عین سامنے منی سی آلتی پالتی لگا کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"بچیو! میں تو اب نماز پڑھنے چلی —" نانی اماں نمو کو گود میں سے اتار کر اپنے کمرے کو چل دیں۔ وہ جھٹ آتم کی گود میں جا بیٹھی۔

"میں تمہاری نانی اماں ہوں —؟"

"نانی اماں نہ سہی، نانا ابا تو لگتے ہی ہیں —" سب لڑکیاں انجم کی اس بات پر ہی ہی کر کے ہنسنے لگیں۔

"میں اتنا بوڑھا ہوں —؟" آتم نے گھور کر اک اک کو دیکھا "یہ دیکھو میرے بال کالے اور یہ میرے پورے کے پورے دانت — اتنے مضبوط ہیں کہ تم سب کو بغیر نمک مرچ لگائے کچا چبا جاؤں گا"

نمو اور پونہ بازو پھیلا کر چیخیں مارتی ہوئی امی بیگم کی طرف بھاگیں — "ہائے امی بیگم! یہ بھائی جان بغیر نمک مرچ لگا کے ہمیں بالکل کچا کھانے لگے ہیں"

"انجی! کچھ عقل کرو، کیوں بچیوں کو ڈرا رہے ہو" امی بیگم نے دونوں کو بازوؤں

میں بھر لیا۔ آتم بھی ہنستے ہوئے وہاں سے اٹھ کر انہیں کے پاس آ گیا۔

"اچھا پونہ اور نمو! چیخو چلاؤ نہیں۔ میں تمہیں کچا نہیں کھاؤں گا بلکہ پکا کر کھاؤں گا۔ انجو! انہیں روسٹ کر دو گی نا —؟"

"ہائے امی بیگم! ہم جل جائیں گی —" وہ پھر چیخیں۔

"کیا کر رہے ہو انجی —؟" امی بیگم نے اسے جھڑکا — "مجھے بات بھی نہیں سننے دیتے"

"صنو کی بات بھی کبھی سننے والی ہوئی ہے" اس نے شرارت سے صنم کی طرف دیکھا مگر وہ بڑی سنجیدگی سے ابا میاں کے ساتھ مصروف گفتگو تھی۔

"اب پچھلی بات کو چھوڑو اور نئے مسئلے کا حل ڈھونڈو —"

"نیا مسئلہ کون سا —؟"

"ابا میاں! مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اتنے ضرورت مند لوگ ہمارے ارد گرد بستے ہیں —"

"ہاں بٹیا! مہنگائی نے افلاس کچھ زیادہ ہی کر دیا ہوا ہے"

"افلاس نہیں ابا میاں!" آتم کے بجائے صنم جلدی سے بولی۔

"ضرورت مند سے امی کا مطلب ایسے لوگوں سے تھا جن کیلئے ہم نے ادارہ بنایا ہے۔ جو باعزت طریقے سے اپنی مشکلات کا حل چاہتے ہیں"

"اچھا اچھا —" ابا میاں نے سر ہلایا "اب کس نوعیت کا مسئلہ درپیش ہے"

"صغرا کے گاؤں کا ہی ایک بوڑھا ہے۔ اس کی ایک لڑکی اور لڑکا ایک ہی گھر میں بیاہے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں میں یہ رسم ہے کہ جس گھر میں لڑکی دیتے ہیں اسی گھر سے اپنے بیٹے کیلئے لڑکی لے آتے ہیں"

"اچھا — وٹے کا رشتہ کرتے ہیں —" امی بیگم سمجھ گئیں۔

"ہاں — وہی —" صنم نے سر ہلایا۔

"تو کیا ہوا پھر —؟"

"ہونا کیا ہے امی بیگم! ایسے رشتوں میں جو قباحت ہوتی ہے وہی ہوئی۔ صرف ایک

مہینہ بوڑھے خدا بخش کی بیٹی سکینہ اپنی سسرال میں رہی۔ اور ان کی بہو ریشماں ان کے گھر میں ــــ پھر خدا نے کیا ہوا۔ ایک دن ریشماں اپنے والدین کو ملنے گئی تو واپس سسرال نہ آئی۔

"کیوں ــــ؟" اس معاملے میں امی بیگم کچھ ابا میاں سے بھی زیادہ ہی دلچسپی لے رہی تھیں۔

"وجہ اس نے یہ بتائی کہ سسرال والے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے۔"

"نہیں کرتے ہوں گے نا۔ ورنہ کوئی لڑکی اپنا گھر اور شوہر یوں بے دریغ نہیں چھوڑ سکتی۔"

"نہیں امی بیگم! بوڑھا خدا بخش قسمیں کھاتا ہے کہ اس کے گھر میں کسی نے ریشماں کے ساتھ کبھی بدسلوکی نہیں کی۔"

"بلکہ خدا بخش تو یہ کہتا ہے کہ وہ خود ہی چپ چپ رہا کرتی تھی۔ اور اتنا عرصہ کسی کے ساتھ بے تکلف ہوئی ہی نہیں، یہاں تک کہ اپنے شوہر کو بھی اس نے ذرا لفٹ نہیں دی"

"کیا مطلب ــــ؟" امی بیگم نے تعجب سے آثم کو گھورا۔

"بس ہر وقت خاموش اور گم سم سی رہتی تھی ــــ نہ شوہر کے ساتھ بات کرتی تھی نہ گھر کے کسی اور فرد کے ساتھ۔"

"اس کا دل وہاں نہیں لگا ہوگا۔" انجم جانے کب کی آکر ابا میاں کی ٹانگوں کے پاس قالین پر بیٹھی تھی۔ اس نے لقمہ دیا تو آثم چونکا "تم بڑوں میں گھسی کیا کر رہی ہو ؟ جاؤ انجو گھر جاکر چھوٹوں کو سلاؤ ــــ دیکھو تو کیسے ننھے ننھے منہ پھاڑ پھاڑ کر جمائیاں لے رہی ہیں۔" صنم نے اسے وہاں سے اٹھانا چاہا، مگر انجم کندھے اچکا کر بولی "پہلے یہ بات پوری سن لوں۔"

"نانی اماں نے سب کو کہانیاں سننے کا بڑا زبردست چسکا لگا دیا ہے۔" آثم ہنسا

"چلو کوئی مضائقہ نہیں۔ گھر میں رونق لگی رہتی ہے۔" ابا میاں نے انجم کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ وہ اور بھی پھیل کر بیٹھ گئی۔ اور آنکھیں نچاتے ہوئے پھر اسی موضوع کو چھیڑنے کیلئے بولی "کسی غیر گھر میں جاکر دل مشکل سے ہی لگتا ہے نا ــــ بیچاری ــــ!"

"شوہر کا گھر غیر نہیں ہوتا۔ وہاں بیٹیا لڑکیوں کو دل لگانا ہی پڑتا ہے ــــ سب لڑکیوں کو ــــ" ابا میاں جیسے اسے ہی نصیحت کر رہے تھے۔

انجم اب بالکل بچی نہ تھی۔ ابا میاں کی بات سن کر اس کا سر جھک گیا۔

"پھر صنو بٹیا ــــ؟"

"ابا میاں بات تو میں سنا رہا تھا۔"

"یہ بیچ بیچ میں آپی بھی تو دخل دیتی جاتی ہیں۔ کل ممی انہیں بڑی جھڑکیاں دے رہی تھیں ــــ"

"کیوں ــــ؟" آثم، امی بیگم اور ابا میاں سبھی نے تقریباً بیک زبان پوچھا۔

"کچھ نہیں ابا میاں! امی تو ہر وقت جھڑکیاں ہی دیتی رہتی ہیں۔" فریادی انداز میں اس نے ابا میاں کی طرف دیکھا "بغیر کسی وجہ کے ہی ــــ"

"بغیر کسی وجہ کے ہی کب ــــ؟" انجم نے اسکی قلعی کھول دی۔

"ابا میاں! آپی نے کالج چھوڑ دیا ہے اور ممی کہتی تھیں کم از کم بی۔ اے تو کر لیتیں۔ یوں اچھا رشتہ ملنے کی امید زیادہ ہو جاتا تھی ــــ"

انجم نے کیسے صاف سب کے سامنے کہہ دیا تھا۔ صنم شرما گئی اور آثم کے ہونٹوں پر شوخی بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔

"لیکن بیٹے! تمہاری ممی ٹھیک کہتی ہیں۔ تمہیں تعلیم ادھوری نہیں چھوڑنا چاہیئے تھی۔"

"ابا میاں پھر دونوں کام نہیں ہو سکتے تھے نا، آپ کو کیا بتاؤں کہ صغرا کی بھابھیوں کو سمجھانے بجھانے کیلئے مجھے کتنے کتنے گھنٹے روزانہ صرف کرنا پڑتے تھے۔"

"بھابھیوں کو کیوں ــــ؟" امی بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"بھائیوں کی کنجیاں انہیں کے ہاتھوں میں تو تھیں ــــ وہ اس کا حصہ دینے پر راضی ہوئیں تو پھر ہی بھائیوں نے بھی حامی بھری۔ یوں پھر آپ ہی بتلایئے پڑھائی کیسے جاری رہتی ــــ؟"

ابامیاں کسی سوچ میں پڑ گئے — امی بیگم سنجیدگی سے بولیں — "انمی! کیا صنم کے بغیر تمہارا ادارہ نہیں چل سکتا —؟ اسے اپنی تعلیم تو مکمل کر لینے دو۔"

"امی بیگم! میں نے اپنی مرضی اور خوشی سے یہ ذمہ داری اٹھائی تھی۔ مجھے انمی نے تو کسی بات پر مجبور نہیں کیا، ویسے میں پرائیویٹ بھی امتحان دے سکتی ہوں ممی نے نجانے کیوں اسے پرابلم بنا لیا ہے۔"

"بیٹی! کچھ بھی ہو، ہمارا نام تو بدنام ہو سکتا ہے کہ انکی لڑکی کو غلط سلط راہوں پر چلا رہے ہیں —"

"امی بیگم! یہ غلط سلط راہیں ہیں —؟" صنم رونے لگی "اک دکھیاری کی مدد کرنا بری بات ہے —؟" وہ روتی جاتی تھی اور ساتھ سسکیوں کے درمیان ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بولے جا رہی تھی۔

"ایک بیوہ کی زندگی سے دکھ نکل گئے۔ یتیم بچے دربدر اور آوارہ بھٹکنے کے بجائے اک اچھے مقام پہ پہنچ گئے۔ ان کا مستقبل اب روشن ہوگا۔ آپ کو کیا بتاؤں کہ جب صغرا کو اس کا حق ملا ہے تو اس کے چہرے پر کیسی خوشیاں تھیں۔ وہ کیسے کیسے جھولیاں پھیلا پھیلا کر ہمیں دعائیں دے رہی تھی۔ کیا یہ نیکی کے راستے غلط ہیں —؟"

"ارے ارے! بٹیو —!" ابامیاں نے اس کا وجود اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اس کا سر سینے کے ساتھ لگا لیا۔ "یہ میری بٹیا اتنی بڑی ہو کر رو رہی ہے۔ ایسے اچھے اچھے اور نیکی کے کام کر کے تو انسان خوش ہوتا ہے۔"

"ابامیاں دوسرے بھی خوشی منانے دیں —!"

سبھی گم سم، چپ چاپ بیٹھے تھے۔

"ہم خوشی منائیں گے اپنی بیٹی کے ساتھ — ہم۔" ابامیاں نے اس کا سر تھپتھپایا "میں خود کل جا کر تیری ممی سے بات کروں گا۔ انہیں تو فخر کرنا چاہیے کہ ان کی بیٹی بیٹا بن کر دوسروں کے کام آ رہی ہے۔ غیروں کا دکھ درد اپنے سینے میں محسوس کر کے

انھیں راحتیں پہنچا رہی ہے۔ خود کو تکلیف دے کر بھی دوسروں کی پریشانیاں دور کرتی ہے۔"

"ہاں تو آپی —!"

"چپ کر نمتری! تو نے ہی بات شروع کر کے ہماری صنو کو رلا دیا ہے۔" آثم کو اس کے آنسو بڑا دکھ دے رہے تھے۔ سارا غصہ اس نے انجم کے سر پر ایک چپت لگا کر نکالنے کی کوشش کی۔

"امی بیگم! یہ بھائی جان مجھے مار رہے ہیں۔"

"انمی! عقل کرو —"

"امی بیگم! کوئی آپ کے آگے میری جھوٹی شکایت بھی لگا دے تو آپ میری عقل کو کوسنے لگتی ہیں۔ پتہ نہیں آپ کو میری عقل کے ساتھ اتنی دشمنی کیوں ہے —؟"

انجم زور زور سے ہنسنے لگی۔

"چپ کر مردار —!" آثم نے اسے گھورتے ہوئے دانت کٹکٹائے۔

"صنو بٹیا! چل میری بیٹی! اب وہ باقی بات سنا دے —"

ابامیاں اسے ہی ابھی تک بہلانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

"کہاں تک سنائی تھی وہ بات ابامیاں —؟" آنسو پونچھ پانچھ وہ جھٹ پٹ سنانے کو تیار بھی ہو گئی۔ اس کے آنسو تھمے تو آثم کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"وہی — ریشماں کا دل اپنے سسرال میں نہیں لگتا تھا۔"

"ہاں تو وہ میکے چلی گئی، اور چونکہ یہ رشتہ وٹے کا تھا، اس لئے خدا بخش کی بیٹی سکینہ کو اپنے میکے آنا پڑا۔ حالانکہ وہ سسرال میں رہنا چاہتی تھی۔ اسے اپنے شوہر کے ساتھ محبت بھی بہت تھی۔ مگر وہ زبردستی اس سے جدا کر دی گئی۔"

صنم اتنی بات سنا کر خاموش ہو گئی تو انجم جلدی سے بولی۔

"لو یہ کیا بات بنی — اس کہانی کا انجام کیا ہوا —؟"

"وہی تو اب ہمیں سوچنا ہے۔ خدا بخش کی بہو ریشماں کسی صورت اپنے سسرال آنا نہیں چاہتی۔ صاف کہتی ہے طلاق لے گی۔ اور اس نے طلاق لے لی تو مجبوراً سکینہ کے لئے بھی لینا پڑے گی۔ دونوں گھر اجڑ جائیں گے!"

"خدا بخش ہمارے آگے ہاتھ جوڑ رہا تھا ابا میاں! کہ جس طرح صغرا کو اس کے حقوق ملے ہیں بغیر لڑائی جھگڑے یا فساد کے، اسی طرح کوئی ایسا چارہ اس کے لئے بھی کریں کہ اس کے بیٹے اور بیٹی دونوں ہی کے گھر اجڑنے سے بچ جائیں، طلاق وں تک معاملہ نہ ہی پہنچے۔ ورنہ بڑی رسوائی ہو گی۔ یوں بھی اس کی بیٹی جیتے جی مر جائے گی، پاگل ہو جائے گی —" باقی بات آثم نے مکمل کر دی۔

"تو اب تم کیا کرو گے —؟"

"یہی آپ سے مشورہ لینا تھا نا کہ بتائیے کیا کریں —؟"

ابا میاں سوچوں میں کھو گئے۔

"ایک ہی گاؤں میں دونوں خاندان رہتے ہیں —؟" امی بیگم نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"نہیں — خدا بخش صغرا وا اپنے گاؤں میں اور وہ ادھر — چھانگا مانگا کی طرف ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، کیا نام بتایا تھا اس نے صنو —؟"

"عجیب سا تھا۔ مجھے بھی یاد نہیں رہا معلوم کر لیں گے —"

"تم یوں کرو بیٹے! اس لڑکی سے ملو —"

"میں ابا میاں —؟" آثم نے گھبرا کر پوچھا۔

"نہیں — تم نہیں — میں صنم سے کہہ رہا تھا —"

انجم ہی ہی کر کے ہنسنے لگی " اندر سے خوش ہوئے تھے کہ کسی لڑکی سے ملیں گے" اس نے شرارت سے آثم کے کان کے اندر منہ گھسیڑ کر فقرہ کسا۔

"ہمارے ہمسایوں نے ہماری لڑکیوں سے ملنے والی خواہش کا خاتمہ ہی کر دیا ہوا ہے دیکھو تو کتنی بکھری پڑی ہیں۔ کوئی چارم اب رہ ہی نہیں گیا —"

"ہائے کتنے چالاک ہیں — ہر وقت ہم بہنوں کو ہی گنتے رہتے ہیں۔ اور باتیں بناتے رہتے ہیں۔ نظر نہ لگا دیجئے گا ہمیں —"

"آثم! بیٹے سن رہے ہو —؟"

"جی ابا میاں —!"

"کیا سمجھے —؟" ابا میاں جانتے تھے کہ وہ انجو سے ہی کھسر پھسر لگا ہوا تھا۔ انہوں نے صنم سے جو بات کی تھی وہ اس نے نہیں سنی تھی۔

"جیسا میں نے کہا ہے — ویسا ہی کرو گے نا —؟"

"جی —؟ وہ — ہاں —" آثم کھسیانا سا ہو کر سر کو کھجلانے لگا۔

"ابا میاں! یہ انجو بک بک کئے جا رہی تھی۔ آپ ذرا دوبارہ فرما دیجئے کہ آپ نے کیا کہا تھا —"

"تمہارا دھیان تو شرارتوں کی طرف لگا رہتا ہے۔ تم کیا خاک کسی کے کام آؤ گے؟" امی بیگم خود اس معاملے میں بہت دلچسپی لے رہی تھیں، تبھی انھیں آثم کی بے توجہی پر غصہ آ گیا۔

"نہیں بیگم! سب کچھ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ میں نے کہا تھا بیٹے! کل ہی تم اور صنم ریشماں کے گاؤں جانا، پھر صنم ریشماں کی کسی سہیلی وغیرہ سے راہ رسم پیدا کرے اور باتوں باتوں میں پتہ چلائے کہ وہ کیوں طلاق لینا چاہتی ہے — وہ کیوں اپنے سسرال میں رہنا نہیں چاہتی — ہو سکتا ہے خدا بخش کے گھر والے واقعی اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرتے ہوں۔ ایک طرف کی بات سن کر کبھی بھی دل میں ہی یکطرفہ فیصلہ نہ کر لینا کہ فلاں ٹھیک ہے اور فلاں غلط۔ ہر کوئی اپنے نقطہ نظر سے اپنی زندگی کو دیکھتا، سمجھتا اور گزارتا ہے۔"

"ہاں انجی! ابا میاں کی بات ٹھیک ہے۔ ان لوگوں سے ہمیں ملنا چاہیئے۔"

"ان کے کوئی رشتہ دار کوئی بزرگ دونوں فریقوں میں مصالحت کرانے کی کوشش نہیں کرتے —؟" امی بیگم نے کہا۔

"بہت کوششیں ہوئیں لیکن امی بیگم! خدا بخش نے بتایا ہے کہ کوئی بھی کامیاب نہیں

ہو سکی۔ ریشماں کسی صورت سسرال آنا نہیں چاہتی۔ سب چھوٹے بڑے سمجھا سمجھا کر تھک ہار گئے ہیں۔"

"جہاں بڑے بڑے ہار گئے وہاں تم بچے پھر اس معاملے کو کیسے سلجھاؤ گے؟"

"نہیں بیگم! کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ اکثر سسرال میں بڑی بڑی تکلیفیں بھی سہنا پڑتی ہیں مگر لڑکیاں اپنے گھر بار کیلئے سب کچھ برداشت کرتی ہیں۔ لیکن ریشماں پر کسی کی بات کا کیوں اثر نہیں ہوتا۔ وہ اپنا اور بھائی کا گھر اجاڑنے پر کیوں تلی ہوئی ہے؟ اس کے پیچھے کوئی بہت بڑی بات ہوگی۔ وہ معلوم ہو جائے تو مجھے یقین ہے میرے بچے یہ معاملہ بھی سلجھا لیں گے۔"

"ہاں ابا میاں! یہ آپ نے ٹھیک کہا۔ بس پھر پہلے ہمیں وجہ معلوم کرنا ہوگی۔"

"ہاں ——"

"آپ بھی اپنا کاروبار چھوڑ کر ان کے ادارے کے ممبر بن جائیے ——" امی بیگم مسکرائیں

"کاروبار چھوڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو ویسے ہی خود کو ان کے ادارے کا ممبر سمجھتا ہوں۔"

"ہاں ابا میاں! آپ ممبر ہی تو ہیں —— اتنے اچھے اچھے ہمیں مشورے دیتے ہیں۔"

"اور اخراجات کے نام پر اتنے ڈھیر ڈھیر سارے روپے بھی دونوں لیتے رہتے ہیں اور گاڑی بھی لے جاتے ہیں۔ سیر سپاٹے کرتے ہوں گے ——"

"تمہیں جلن کیوں ہو رہی ہے ——؟" آثم نے انجم کا منہ چڑایا۔

"نہیں بھئی جلن نہیں —— یہ میری انجو بٹیا بھی تعلیم سے فارغ ہو لے، یہ بھی یونہی لوگوں کے دکھ درد بانٹا کرے گی۔ پریشانیاں رفع کیا کرے گی۔"

"ہاں ہاں —— لگا دیں سب کو اسی کام پر ——" امی بیگم قدرے تیکھے لہجے میں بولیں۔

"ہمارا تو بیٹا ہے اور مصیبت بیچاری انکی ماں کیلئے۔ جو ایک نہیں پانچ پانچ بیٹیوں کی ماں ہے۔ لوگ باتیں بنا بنا کر ہی ان کا جینا حرام کر دیں گے۔"

"کیسی باتیں ——؟ تم عورتیں بھی عجیب ہوتی ہو۔ ہر وقت لوگوں کی باتیں بنانے

کی فکر پڑی رہتی ہے۔ اور باتیں بنانے والے کون ہوتے ہیں؟ سب عورتیں خود ہی۔"

ابا میاں کی بات پر آثم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ابا میاں خود بھی مسکرا رہے تھے، امی بیگم جھینپ کر خاموش سی ہو گئیں۔

"ارے!" انجم ایک دم چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر زور زور سے ہنسنے لگی

"امی بیگم! ذرا اپنی گود میں تو دیکھئے۔"

امی بیگم نے سر جھکا کر دیکھا۔ پونہ اور نمو دونوں ان کی گود میں ایک ایک گھٹنے پر آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ وہ سب باتیں کرتے رہے اور یہ چپ چاپ سنتی رہیں۔ اور سنتے سنتے ہی جانے کب سو گئی تھیں۔ دونوں کے سر جھک کر پیشانیاں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائی ہوئی تھیں اور وہ گہری نیند میں غرق تھیں۔

"ہائے! کتنے پیارے انداز میں سو رہی ہیں۔"

"ارے انجو! ارم کہاں ہے ——؟" صنم نے پوچھا۔

"جب نانی اماں کہانی ختم کر کے نماز پڑھنے چلی گئی تھیں تو ارم اسی وقت گھر بھاگ گئی تھیں۔ اس کا کل ٹیسٹ ہے ——"

"چلو پھر پونہ کو میں اٹھا لیتی ہوں تم نمو کو اٹھا لو ——"

"یہ آثم اٹھا کر چھوڑ آئے گا۔ اندھیرے میں تمہیں کہیں ٹھوکر وکر نہ لگ جائے۔ جاؤ بیٹے! بہنوں کو چھوڑ آؤ ——"

"اچھا جی ——" امی بیگم کا حکم سن کر اس نے اک زوردار ٹھنڈا سانس بھرا۔ پھر بڑبڑایا —— "پیدا کوئی کرے اور سنبھالے کوئی۔ سنجانے اتنی ڈھیر ساری پیدا کس لئے کر لی تھیں ——"

"کیا بکواس کر رہے ہو —— پھر کیا ہو گیا جو اتنا کام کرنا پڑ گیا ——" امی بیگم نے آثم کو ڈانٹا تو صنم اور انجم منہ چھپا چھپا کر ہنسنے لگیں۔

ایک کندھے پر پونہ اور دوسرے کے ساتھ نمو کو لگانے کے بعد وہ صنم اور انجم کی طرف گھوما۔ "اے نازک بیبیو! آپ ابھی تشریف رکھئے۔ میں انھیں چھوڑ

آؤں تو پھر آپ دونوں کو بھی اسی طرح ایک ایک کندھے پر اٹھا کر گھر تک پہنچا آؤں گا — کہیں آپ کو اپنا وزن بھی اٹھا کر چلنے سے ٹھوکر وکر نہ لگ جائے۔"

امی بیگم نے رخ پھیر کر بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

○

امی بہت سارے کام نمٹا آئیں۔ اور وہ ہنوز اسی طرح سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال چہرے کے گرد بکھرے تھے۔ اور وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے نیچے فرش پر انگلیوں کے ساتھ بے نشان سی لکیریں کھینچے جا رہی تھی۔ یہ فعل اس کے ذہنی انتشار کا غماز تھا —!

"گڑیا —!" امی کی آواز پر چونک کر اس نے سر اٹھایا — رخساروں پر آنسوؤں کے نشان بھی نہیں تھے۔ پلکیں بھی خشک تھیں۔ پھر نجانے کیوں اس آنکھیں گلابی گلابی سی ہو رہی تھیں۔

"کیا ہوا —؟"

"کچھ نہیں —"

"تو پھر یہ تمہاری آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں۔ روئی تھیں —؟"

"کیا اندر گرنے والے آنسوؤں سے بھی آنکھیں لال ہو جایا کرتی ہیں —؟"

"کیا کہہ رہی ہو —؟" اس کی بڑبڑاہٹ امی سمجھ نہ سکیں۔

"کچھ نہیں امی —!" اس نے سر کو ایک ہلکا سا جھٹکا دے کر بال پیچھے ہٹائے۔

"پھر بھی —؟ تقریباً دو گھنٹوں سے اسی طرح بیٹھی ہو۔ کوئی تو بات ہو گی —؟"

"میں یہ سوچ رہی تھی امی! کہ تھوڑے سے ہاتھ پاؤں ہمیں بھی ہلانا چاہئیں۔ پروردگار نے ہمیں طاقت دی ہے، عقل دی ہے، بازو دیئے ہیں۔ ہم دونوں ماں بیٹی بہت کچھ کر سکتی ہیں۔"

"اس تمہید سے مطلب کیا ہے تمہارا —؟" امی نے تیکھی نگاہ سے اسے دیکھا۔

"ہم جو یوں اپاہجوں کیطرح کسی کی بھیک کے بھروسہ پہ بیٹھے رہی ہیں۔ تو کیا یہ مناسب ہے —؟ میں سلائی کڑھائی اچھی سے اچھی کر سکتی ہوں — نٹنگ بھی مجھے آتی ہے۔ اور آپ کی بھی بینائی ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ آپ بھی ایسے سب کام کر سکتی ہیں۔ اگر ہم دونوں مل کر کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

امی چپ چاپ اس کی بات سن رہی تھیں۔

"امی! یوں ہماری عزت اور خودداری بھی قائم رہ سکتی ہے۔"

"اور تمہارے بھائی کا مقدمہ —؟" اس کی بات ختم ہوئی تو امی نے بڑے طنز سے اس کی آنکھوں میں دیکھا "کیا اسے پھانسی کے تختے پر پہنچانا ہے —؟"

"ہائے امی!" اس نے آنکھیں میچ کر ایک دم سینے پر ہاتھ دھر لیا۔

"کاشی جی کیلئے ایک دم سے ایسے کلمات منہ سے نہ نکال دیا کریں — میں ان کی خاطر دن رات محنت کروں گی امی — مگر — یہ بے غیرتی مجھ سے نہیں برداشت ہو رہی کہ کوئی غیر ہمارا خرچ اٹھائے —"

"آفرین ہے بیٹی! تم سا احسان فراموش میں نے اور کوئی نہ دیکھا ہو گا۔ اس کا اپنے اپنے کہتے منہ سوکھتا ہے، اور تم اسے غیر کہہ رہی ہو۔ اس کے خلوص کو تم بھیک کہتی ہو۔ یہ تمہارے دماغ کو آخر ہے کیا —؟" امی کا لہجہ اور بھی طنزیہ ہو گیا۔

"تم کیا سمجھتی ہو کہ سلائی کڑھائی سے تم کاشف کا مقدمہ جیت لو گی؟ یہ تمہاری بھول ہے دھنک! باقی اخراجات تو علیحدہ رہے صرف اک وکیل کی فیس ہی نہ چکا سکو گی۔ قتل کا مقدمہ ہے —"

"امی کوشش کرنے میں کیا حرج ہے —؟"

"ہاں ہاں — جو کوئی پاؤ بھر عزت باقی رہ گئی ہے گھر گھر محنت مزدوریاں کر کے وہ بھی برابر کر لو — پھر بات تمہارے سسرال تک جا پہنچے۔ وہ اتنے بڑے لوگ ہم محنت مزدوری کرنے والوں کے گھر برات ہی تو لے کر آئیں گے۔"

"امی —!" دھنک چیخ پڑی — "محنت مزدوری کرنے سے کیا عزت ختم ہو جاتی ہے —؟"

"نہیں نہیں — اور بڑھتی ہے — بھائی نے بازار میں جھگڑا کر کے عزت پالی۔ اور بہن اب مزدوریاں کرے گی۔ خوب خاندان کا نام نکلے گا —" امی جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

"اگر وہ داؤد اور اقبال کوئی بات کر رہے تھے تو کرتے رہتے، کاشف کو جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی —؟"

"امی یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں، کوئی بھی بھائی اتنا بے غیرت نہیں ہو سکتا کہ بہن کے متعلق ایسی نازیبا باتیں چپ چاپ سن لے۔ اور میرے کاشی جی تو دنیا میں سب سے زیادہ باغیرت بھائی ہیں وہ کیسے خاموش رہتے؟"

"بس پھر باغیرت بن کر مزہ چکھ لیا ہے نا۔ اور تو بھی محنت مزدوریاں کر کے دیکھ لے کس بھاؤ بکتی ہے —؟"

"امی! آپ کو تو یکدم ہی غصہ آجاتا ہے —" دھنک نرمی اور ملائمت سے بولی۔ "میری پوری بات آپ نے سنی ہی نہیں —"

"سب سن رکھی ہیں، میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ تمہیں شہزاد بیچارے کے ساتھ روز اوّل سے ہی خدا واسطے کا بیر ہو گیا ہوا ہے۔ وہ اتنے خلوص سے ہماری ہر تکلیف، ہر پریشانی اپنے سر لے لیتا ہے۔ اور تم ہو کہ بجائے مشکور ہونے کے سو سو باتیں بناتی ہو —"

"امی! میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ سارا دن یوں بیکار بیٹھ رہنے سے بہتر ہے نا کہ کچھ کیا جائے — تعلیم میری اتنی نہیں کہ کوئی ملازمت وغیرہ کر لوں، سلائی کڑھائی کا میں نے اس لئے کہا تھا کہ مصروفیت میں دل بھی بہل جایا کرے گا۔ اور کچھ مالی فائدہ بھی پہنچ سکتا ہے دیکھئے نا اس سے شہزاد بھائی ہی کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے گا —" دھنک نے دوسرے رخ سے بات کی۔

"اچھا سوچوں گی —" امی اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔ دھنک پھر اپنی انہیں سوچوں کے ساتھ الجھنے، بکھرنے اور سمٹنے لگی۔

کوئی غمگسار نہیں تھا — کوئی چارہ ساز نہیں تھا — کسے اپنے اندر کے دکھ بتاتی — کس سے ان کی دوا پوچھتی — امی اپنی ہی سوچوں کو درست سمجھتی تھیں۔ اپنے ذہن میں علیحدہ ہی انہوں نے زندگی گذارنے کا اک باعزت طریقہ اور معیار ڈھالا ہوا تھا۔ اس انداز سے ذرا بھی ادھر ادھر سرکنا وہ عزت کے خلاف سمجھتی تھیں۔

یوں بھی — دھنک جانتی تھی — جب بیٹھے بٹھائے اعلیٰ سے اعلیٰ رہائش اور قیمتی سے قیمتی لباس اور اچھی سے اچھی خوراک مل رہی تھی۔ تو پھر ہاتھ پاؤں ہلانے کی بھلا ضرورت بھی کیا تھی۔ شہزاد ان کا بیٹا بنا ہوا تھا۔ امی امی کرتا رہتا تھا۔ اور وہ یہی سمجھ بیٹھی تھیں کہ کاشف کا نعم البدل جیسے انھیں مل گیا ہوا تھا۔

مگر — جانے کیوں دھنک ابھی تک ان سب حالات کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر پائی تھی۔ اسے یہ سب کچھ بالکل غیر مناسب لگ رہا تھا۔ اس کے خیال میں عزت اور وقار کے ساتھ زندگی گزارنے کی قدریں اور تھیں — انداز اور تھے۔

اور وہ انہی کو اپنانا چاہتی تھی — جانے کتنی دیر وہ انھیں خیالات میں کھوئی بیٹھی رہی تھی۔ سر کے اوپر بھاری ہاتھ کے لمس نے اسے چونکا دیا — اس نے سر اٹھایا — شہزاد اس کے عین سامنے پنجوں کے بل بیٹھا تھا۔ "کیا بات ہے —؟"

"بات کیا ہوگی — آج پھر دورہ پڑا ہوا ہے —" امی برآمدے کے پرلے سرے سے بولیں۔

"کاشی جی یاد آرہے ہیں —؟" شہزاد نے بڑے پیار سے پوچھا۔

کاشف کا نام کان میں پڑا تو دھنک کو رونا سا آگیا۔

"کتنی بار کہا ہے کہ ہفتہ پندرہ دن میں ایک آدھ بار مل آیا کرو مگر وہ بھی تم نہیں مانتیں"

"آج کے دورے کی نوعیت مختلف ہے — کوئی کام وام کرنے کا سودا سر میں سمایا ہے۔"

"کام وام —؟" شہزاد نے حیرت سے امی کیطرف دیکھا "کیا مطلب ؟"

"بیکاری ہوتی ہی اک بیماری ہے"

"میں سمجھا نہیں امی —!"

"کہتی ہے کوئی سلائی کڑھائی وغیرہ اجرت پہ کیا کرے گی —"

"میرے ہوتے ہوئے ایسا سوچتی ہو دھنک —؟ بڑے افسوس کی بات ہے —" شاکی انداز میں اس نے دھنک کیطرف دیکھا" مجھے آخر غیر ہی سمجھتی ہونا

وہ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی روتی رہی۔

"غیر نہیں سمجھتی —" امی نے جلدی سے اس کی طرف سے گویا صفائی پیش کی" — تمہیں بتایا نا — بیکار رہ کر ہر کوئی اکتا جاتا ہے"

"یہ معاملہ ہے تو بس پھر ٹھیک ہے، کل سے تم میرا ہاتھ بٹا دیا کرنا"

"تمہارا ہاتھ —؟"

"ہاں — کاشف کے مقدمے کے سلسلے میں یہ میری بڑی مدد کر سکتی ہے، سارا لکھنے لکھانے کا کام اگر یہ سنبھال لے تو مجھے اور کیا چاہیے —"

"تو جو کام ہوا کرے کہہ دیا کرو نا — اس طرح اسکا دل بھی لگا رہا کرے گا اور غلط سلط سوچیں بھی دماغ میں نہیں آئیں گی —"

"بس ٹھیک ہے —" اس نے دھنک کو مخاطب کیا — "کل سے تیار رہنا —"

"تیار رہوں —؟" اس نے بھیگی پلکیں جھپکائیں۔

"ہاں — میرے ساتھ میرے دفتر جایا کرنا —"

"آپ کے دفتر —؟"

"مقدمے کی ساری فائلیں، سارے کاغذات وہیں ہوتے ہیں —"

"لیکن —" اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی امی نے اس کی بات کاٹ دی

ہر وقت اس کی زبان کی درازی سے انھیں خوف ہی رہتا تھا نجانے کس وقت کیا منہ

سے نکال دے —!

"اب لیکن ویکن نہ شروع کر دو — تمہاری خواہش کے مطابق بند و بست ہو گیا ہے شکر کرو —"

"چلو بس اب یہ آنسو پونچھ لو — اور دیکھو میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں —؟"

شہزاد نے بغل میں دبا پیکٹ نکالا۔

"یہ امی کیلئے گرم چادر اور یہ تمہارے لئے مشینی بنی اونی شال۔ فارن میڈ ہے۔ ساڑھی پہن کر اوڑھو گی تو بہت اچھی لگو گی —"

"نہیں نہیں — مجھے کچھ نہیں چاہیئے —!" وہ گھٹنوں میں چہرہ دے کر اور بھی زور زور سے رونے لگی۔ اس کا سارا وجود کپکپا رہا تھا۔

"بھائی کے بغیر اداس رہتی ہے —" اس کے ان آنسوؤں کا مطلب سمجھتے ہوئے بھی امی نے جلدی سے بات بنائی۔

"میں نے ایسی شال کبھی نہیں اوڑھی —" امی کی وہ ہنسی ان سنی کرتے ہوئے ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان بول پڑی۔

"اب اوڑھا کرنا نا — روز دفتر جایا کرو گی تو لباس کا بھی تو کچھ خیال رکھنا پڑے گا۔ ورنہ تم تو بالکل ہی اپنی ذات کیطرف سے غافل ہو چکی ہو"

"ہاں تو شہزاد ٹھیک کہہ رہا ہے — اس نے تو اپنی حالت ہی بگاڑ رکھی ہے"

"دیکھئے نا امی —!" امی کو اپنا طرفدار پا کر وہ انہیں سے شکایت کرنے لگا —

"یہاں ارد گرد کی سب کوٹھیوں والے مجھے جانتے ہیں۔ وہ لوگ کیا سوچتے ہوں گے کہ اتنا بڑا وکیل ہے اور گھر والے کس حیثیت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ میری عزت کی خاطر ہی اسے اپنی حالت درست رکھنی چاہیے —" شہزاد اور بھی بہت کچھ کہتا رہا مگر دھنک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس گھٹنوں میں چہرہ گھسائے بیٹھی روتی رہی۔

"چلو اٹھو شاباش! ابھی جا کر وہ گہرے فیروزی رنگ کی جو ساڑھی ہے وہ پہنو۔ اس پر یہ سفید شال بڑی خوبصورت لگے گی —"

"نہیں نہیں ـــــ" اک لمبی سی سسکاری کے ساتھ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"امی! اسے کہیئے نا پہن لے۔ ذرا سا گھما پھرا لاؤں گا۔ طبیعت بحال ہو جائے گی "

میں کہیں نہیں جاؤں گی ـــ نہ میں ساڑھی پہنونگی ـــ نہ شال اوڑھوں گی "

اس کے کورے جواب پر شہزاد چند لمحے اسی طرح ساکت بیٹھا اسے دیکھتا رہا پھر اٹھ کر چپ چاپ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"بیٹے!" اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے امی اس کے پیچھے جا پہنچی تھیں "کھانا نہیں کھانا ـــ؟" وہ صوفے کی پشت کے ساتھ سر ٹکائے اور آنکھیں میچے خاموش بیٹھا تھا ـــ "آؤ میں گرم گرم چپاتیاں پکاتی ہوں تم کھانا کھالو ـــ"

"مجھے بھوک نہیں ہے ـــ" اس نے اسی طرح آنکھیں میچے میچے ہی جواب دیا۔ وہ تو اسوقت ہمیشہ بھوک کے مارے واویلا مچاتا ہی گھر میں داخل ہوا کرتا تھا۔ امی چند لمحے کھڑیں غور سے اس کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر ہولے ہولے قدم اٹھا کر واپس آگئیں ـــ دھنک ہنوز اسی طرح بیٹھی تھی۔ مسلسل روئے جا رہی تھی اور ہچکیوں کے ہچکولوں سے اسکا سارا وجود ہل رہا تھا۔

"اب کیوں رو رہی ہو ـــ؟ اس بیچارے کا تو دل تم نے توڑ دیا۔ اب خوش ہو۔ ہنسو۔ قہقہے لگاؤ ـــ"

دھنک نے تڑپ کر گھٹنوں میں سے چہرہ نکالا۔ بڑے تعجب سے ماں کو دیکھتے ہوئے سسکیوں کے درمیان بولی "میں نے کس کا دل توڑا ہے ـــ؟"

"بڑی بھولی ہو ـــ" امی کا لہجہ پھر طنزیہ ہو گیا۔

"شال نہیں لی اس لئے کہہ رہی ہیں ـــ؟"

"اتنے ارمان سے رقم خرچ کر کے وہ لایا ہے۔ اور تم نے ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کیا۔ اس کے اپنے گھر والے اتنی دور رہتے ہیں کیا پتہ تم جتنی ہی اس کی اپنی بھی کوئی بہن ہو اور وہی حسرت اس سے سب کچھ کرا رہی ہو۔ کیا ایسے خلوص کے جواب میں ایک بہن کا بھائی کے ساتھ ایسا ہی رویہ ہونا چاہیئے ـــ؟ اگر کاشف بڑے ارمان بڑے پیار سے ایسی کوئی

چیز تمہارے لئے لائے تو تم کیا اس کے ساتھ ایسے ہی کرو گی ـــ؟؟"

دھنک کی سسکیاں مدہم پڑنے لگیں۔

"چلو فرض کیا ـــ" امی کا لہجہ اب قدرے نرم ہو گیا ـــ "تمہیں یہ سب کچھ پسند نہیں لیکن گڑیا! کبھی کبھی مصلحت کے پیش نظر ہی اپنی مرضی کے خلاف بھی انسان کو بعض اوقات کچھ کرنا پڑتا ہے ـــ"

"آپ نے گھر چھوڑنے کو کہا، میں نے چھوڑ دیا ـــ کاشی جی مجھے حتی الوسع شہزاد کے سامنے نہیں جانے دیا کرتے تھے۔ آپ نے وہ حجاب ختم کیا۔ میں خاموش رہی۔ اسکے ساتھ گھومنا پھرنا مجھے پسند نہیں تھا۔ آپ کی مرضی کیمطابق میں وہ بھی کرنے لگی۔ اب آپ اور مجھ سے کیا چاہتی ہیں ـــ؟؟"

"اچھا ـــ تو یہ سب مجھ پر احسان ہو رہے ہیں ـــ؟" امی کے لہجے میں پھر کڑواہٹ گھل گئی ـــ "ٹھیک ہے تم اپنی مرضی پر چلو۔ آئندہ مجھ پر کوئی احسان نہ کرنا۔ بھائی پھانسی چڑھتا ہے تو چڑھے "

"ہائے امی ـــ!" اس کا لرزتا وجود بڑے زور سے کپکپایا۔ وہ مرتعش لہجے میں چیخ سی پڑی "آپ ہمیشہ ہی کاشی جی کیلئے ایسی بات بے دریغ منہ سے نکال دیتی ہیں۔ میں اپنے کاشی جی پر سے قربان ہو جاؤں "

"مر گئے قربان ہونے والے۔ اور پھر تم ـــ؟ اتنی ذرا سی، ایسی بے ضرر سی بات تو اسکی خاطر کر نہیں سکتیں، قربان ہو گی۔ زبانی زبانی تم جیسے قربان ہونے والے ہم نے بہت دیکھے ہیں ـــ"

"امی! میرے جذبوں پر یوں حقارت سے طنز نہ کریں۔ آزما کر دیکھ لیں۔ میں سچ مچ کاشی جی کیلئے اپنی جان بھی دے سکتی ہوں "

امی نے طنزیہ انداز میں اک زور کا قہقہہ لگایا۔

"شہزاد کاشف کا دوست ہے۔ وہ کئی سالوں سے ہمارے گھر آ رہا ہے بیحد شریف اور مخلص انسان ہے۔ صرف اپنے بھائی کی خاطر اک تم اس سے اچھا سلوک کر نہیں

سکیں جان کیسے دو گی ــــ؟ تم یہ جانتی بھی ہو کہ وہ تمہارے بھائی کا مقدمہ لڑ رہا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں تمہارے بھائی کا پھانسی چڑھنا یا بری ہونا ہے۔ اس کے باوجود تم اسے خوش رکھنے کی خاطر اس کی یہ چھوٹی چھوٹی باتیں تو مانتی نہیں اور دعوے کرتی ہو جان دینے کے ــــ جان دینا بہت بڑی بات ہے گڑیا ــــ!"

"امی میں شال لے لوں گی ــــ پلیز بس کیجیے اور طعنے نہ دیجیے ــــ" اس نے ماں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"بیٹی!" امی نے اس کے بندھے ہوئے ہاتھ تھام لئے "دنیا میں رہنے کے لئے تھوڑی سی دنیاداری بھی سیکھنا پڑتی ہے۔ تھوڑا سا مصلحتوں کو بھی سمجھنا پڑتا ہے۔ اس مشکل وقت میں ہمارا کوئی رشتہ دار ہمارا نہیں بنا، ہمیں شہزاد کے خلوص کی قدر کرنی چاہیئے۔ اس کی یہ چھوٹی چھوٹی بے ضرر سی خواہشات اور چھوٹی چھوٹی سی خوشیاں پوری کر دینے سے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا اور سوچو بن کتنا کچھ جائے گا، تمہارا جی نہیں چاہتا کاشی جلد سے جلد گھر آ جائے ــــ؟"

"چاہتا ہے ــــ"

"تو بس پھر ــــ آئندہ شہزاد کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا۔ اور جو وہ چیزیں لاتا ہے تم فکر نہ کرو ان سب کا بدلہ ہم اتار دیں گے۔ اور مقدمے پر جو کچھ خرچ ہو رہا ہے وہ مجھے یقین ہے کاشف ایک ایک پیسہ ادا کر دے گا۔ پھر تم کاہے کو کوئی پریشانی دل میں لاتی ہو ــــ" امی نے بڑے دلار سے اس کے چہرے کے گرد بکھرے بال دونوں ہاتھوں سے ہٹائے۔

"دیکھو تو ــــ یوں ہر وقت روتے رہنے سے تمہارا رنگ روپ بگڑتا جا رہا ہے۔ اگلے گھر جانا ہے۔ ایسا زرد چہرہ اور پھیکا پھیکا سا روپ لے کر سسرال جاؤ گی تو دیکھنے والے سب باتیں نہ بنائیں گے۔"

سسرال کے نام سے شرما کر اس نے نگاہوں کے ساتھ چہرہ بھی جھکا لیا۔

"جاؤ منہ ہاتھ دھو کر وہ ساڑھی پہن لو

"جی اچھا۔"

اتنا سمجھانے کے باوجود امی نے اندازہ لگایا کہ اس کے حکم ماننے میں بھی اک ناگواری سی تھی۔ اپنی مرضی اور خوشی خوشی کام کرنے والی بشاشت اس کے چہرے پر نہ تھی۔ چپکے سے کچھ سوچتے ہوئے دھنک نے شال اٹھائی اور کھوئے کھوئے سے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"شہزاد بیٹے ــــ!" امی پھر اس کے پاس گئیں، وہ ابھی تک اسی طرح پڑا تھا۔

"بیٹے! وہ ابھی ناسمجھ ہے۔ بے شک اس کی ناسمجھی کی عمر نہیں ہے مگر بھائی نے بیجا لاڈ کر کر کے اسے سمجھدار بننے ہی نہیں دیا۔ اس کی کسی بات کا برا مت منایا کرو۔"

صوفے کے پیچھے کھڑے ہو کر امی اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"میں برا تو نہیں مانتا امی! دراصل میں آپ کو بالکل اپنا سمجھتا ہوں۔ پھر جب جواب میں ایسی بے رخی ملتی ہے تو انسان ہوں نا آخر، دل دکھ ہی جاتا ہے ــــ"

"نہیں بیٹے! تمہیں ابھی تک اس کے مزاج کا شاید اندازہ ہی نہیں ہوا ــــ وہ گھڑی میں تولہ ہوتی ہے اور گھڑی میں ماشہ ــــ!! اب دیکھو ساڑھی پہننے چلی بھی گئی ہے۔ شال بھی اوڑھے گی۔ زبان پر جو آتا ہے بلا سوچے سمجھے کہہ دیتی ہے لیکن اسکے دل کے اندر کچھ نہیں ہوتا ــــ یوں بھی کاشی کے صدمے نے اسے بالکل ہی بولا دیا ہوا ہے ــــ"

"ہاں یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ اسے کاشف کے ساتھ بہت محبت ہے ــــ" شہزاد سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ــــ "امی! کاشف میرا بھی بہت پیارا دوست ہے میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ جلد از جلد اس کا مقدمہ ختم ہو۔ اور وہ باعزت بری ہو کر گھر آ جائے لیکن کیس سنجیدہ ہے۔ وقت تو لگے گا ہی ــــ"

"خدا تمہیں ان نیکیوں کا اجر دے بیٹے! میرا تو رواں رواں تمہارے لئے دعا کرتا ہے۔"

"بس امی! یہ ساری دعائیں بھی آپ فی الحال کاشف کیلئے وقف کر چھوڑیئے۔ خدا

میرا یہ فرض پورا کر دے تو میں سمجھوں گا، زندگی کا مقصد پا لیا۔"

"چلو آؤ اب کھانا کھا لو —— تمہاری پسندیدہ چیز آج پکائی ہے۔ بھلا بوجھو کیا —؟"

"مغز پکائے ہوں گے ——؟"

"ہاں —" امی مسکرا پڑیں "کیسے فٹافٹ بوجھ لیا ہے ——"

"ارے امی! زندہ باد ——" وہ نعرے مارتا ہوا ان کے ساتھ ساتھ باورچی خانے کی طرف چل پڑا۔

○

ایک بچہ دوسرے سے —"مرغیاں انڈوں پر کیوں بیٹھتی ہیں —؟" دوسرا —— "اس لئے کہ ان کے گھروں میں کرسیاں نہیں ہوتیں —" پونہ نے چمکتی آنکھوں سے ایک ایک کی طرف دیکھتے ہوئے ہکلا ہکلا کر اور گھبرا گھبرا کر لطیفہ سنایا۔ جو آج ہی اس نے سکول میں اپنی اک منی سی سہیلی سے سنا تھا۔ اور اب اتنے سارے اور بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر سنانے کا اس کا یہ پہلا اتفاق تھا۔

"بور —— بور ——!" انجم اور ارم نے ہنسنے کے بجائے اسکا مذاق اڑا لیا۔

آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو بھرے ہوئے وہ نانی اماں کے پہلو سے اٹھی اور امی بیگم کے پاس ان کی شکایت لگانے کے لئے جا پہنچی —— وہ سامنے ہی بیٹھیں ایک دوپٹے پر گوٹہ لگا رہی تھیں۔

"امی بیگم! انجو اور ارم آپی میرے لطیفے پر ہنستی نہیں ہیں۔ اور میں روز ان کے لطیفوں پر ہنستی ہوں —" بڑی معصوم سی شکایت تھی۔

امی بیگم نے دوپٹہ پرے ڈالتے ہوئے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔

"چل میری چندا! تو مجھے سنا دے۔ میں ضرور ہنسوں گی "

اور پھر اسی طرح چمکتی آنکھیں امی بیگم کے مشفق چہرے پر گاڑتے ہوئے تھوڑا

سا ہکلا ہکلا کر اس نے وہی لطیفہ انہیں سنا دیا۔

"واہ بھئی واہ! بیحد شاندار لطیفہ ہے —" امی بیگم سے پہلے ہی گونج اٹھنے والے اک مردانہ قہقہے نے پونہ اور امی بیگم دونوں کو ہی چونکا دیا۔

آثم ان کے عین سامنے قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔

"اب میں ایک لطیفہ سناؤں —؟"

جواب میں امی بیگم مسکرا دیں اور پونہ بڑے زور زور سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاں — اب آپ سنایئے، جتنے زور سے میرے لطیفے پر آپ ہنسے تھے نا۔ اتنے ہی زور سے میں بھی ہنسوں گی ——"

"بڑے مشروط طریقے سے ایک دوسرے کو لطیفے سنائے جاتے ہیں —" امی بیگم ہنسنے لگیں۔

"ایک تھا خان —— یہ بڑی بڑی مونچھوں والا کابلی پٹھان —" آثم نے اداکاری کے ساتھ لطیفہ سنانا شروع کیا۔ انجم، ارم نانی اماں کی محفل چھوڑ کر ادھر بھاگ آئیں۔ آثم نے آنکھوں کے گوشوں سے ان دونوں کو آ کر بیٹھتے دیکھا —— مسکرایا —— اور پھر سنانے لگا۔

"اس مونچھوں والے خان کو بڑی بھوک لگی، لیکن پیسے اس کے پاس ذرا کم تھے —"

"بیچارہ گریب ہو گا ——" پونہ نے ہمدردی کا اظہار کیا۔

"گریب نہیں تھا —" اسکی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے آثم مسکرایا۔

"یہ خان لوگ اندر سے بڑے مالدار ہوتے ہیں۔ صرف اوپر سے ہی ایسا ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے بڑے غریب ہوں —" انجم نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"کپڑے جو میلے کچیلے اور پیوند لگے پہنے رکھتے ہیں —" ارم کیسے خاموش رہتی۔ اس کی معلومات کسی سے کم تو نہ تھیں ——!

"لو جی —" آثم اٹھنے لگا — "تم دونوں بیٹھ کر اس لطیفے والے خان کے متعلق اپنے اپنے خیالات اور معلومات بیان کرو اور ہم چلے ——"

"نہیں نہیں —— سوری بھائی جان! اب ہم نہیں بولیں گی ——"

دونوں نے اس کا ایک ایک بازو تھام لیا۔

"سوری بھائی جان!" آثم نے ان کی نقل آتاری۔ "انگریزوں کی نانیاں —"

امی بیگم مسکرائے جا رہی تھیں۔ ماں کی طرف دیکھ کر آثم نے بھی مسکراتے ہوئے پھر لطیفہ سنانا شروع کر دیا — "ہاں تو اس بڑی بڑی مونچھوں والے خان کو بڑی بھوک لگی تھی۔ وہ چلا جا رہا تھا اور سوچے جا رہا تھا کہ ایسے کس ہوٹل یا تنور وغیرہ سے کھانا کھائے کہ جتنے اس کی جیب میں پیسے تھے۔ ان سے اس کا پیٹ بھر جائے"

"میں بھی تو سنوں یہ میرا انثی کیا سنا رہا ہے۔" منو کو انگلی سے لگائے نانی اماں بھی چلی آ رہی تھیں۔

"لطیفہ ہے نانی اماں! بڑی بڑی مونچھوں والے خان کا لطیفہ جسے بڑی بھوک لگی تھی۔ مگر پیسے اس کی پاس کم تھے" انجم نے جلدی جلدی مختصر سا انہیں بتا دیا۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گئیں اور منو کو اسی طرح گود میں بٹھا لیا۔ "پھر —؟"

"چلتے چلتے اس کی نظر سامنے ایک دوکان نما ہوٹل پر پڑی۔ جس پہ یہ بڑا بڑا تحریر تھا کہ سالن کی ایک پلیٹ کی قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ اور روٹیاں بالکل مفت — وہ جلدی سے اس چھوٹے سے ہوٹل میں گھس گیا۔ گندی گندی میزیں کرسیاں تھیں۔ مگر اسے تو اپنی بھوک مٹانے سے غرض تھی۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔ پھر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بیرے کو آواز دی۔

بیرے نے سالن کی ایک پلیٹ اور چار روٹیاں اس کے آگے میز پر لا رکھیں۔ خان مزے لے لے کر کھانے لگا — بھوک بہت تھی۔ دو منٹ میں ہی چاروں چپاتیاں کھا گیا۔"

"دو منٹ میں ہی —؟" ارم نے حیرت کا اظہار کیا۔

"وہ آدھی روٹی کا تو ایک نوالہ بناتا تھا"

"بڑی بڑی مونچھوں والے خان کا منہ بھی بہت بڑا ہوتا ہے —؟" پونہ نے پوچھا۔

امی بیگم اور نانی اماں ہنس پڑیں۔ اور آثم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا — "ہاں بہت بڑا ہوتا ہے — اتنا کہ اگر تمہیں بھی اٹھا کر منہ میں رکھ لے تو اس کا ایک گال بھی

پورا نہ پھولے —"

"ہائے!" پونہ سہم کر امی بیگم سے لپٹ گئی۔

"انثی! کیوں ہر وقت بچیوں کو دہلاتے رہتے ہو —"

آثم مسکرا کر پھر لطیفہ سنانے لگا۔

"چاروں روٹیاں کھا کر اس نے بیرے کو طلب کیا اور چار روٹیاں اور لانے کو کہا۔ اس نے لا دیں — تب وہ چاروں تو دو منٹ کے بجائے بالکل ہی ایک منٹ میں کھا کر اس نے پھر اور مانگیں"

"ہائے ہائے! اتنا کھاتا تھا وہ —" پونہ سہمی سہمی سی آواز میں بولی۔

"کھانا کہ تمہیں بھی سالم کی سالم ہڑپ کر جائے تو ڈکار نہ لے۔ آج وہ مجھے ملا تھا۔ کہتا تھا کل ہمارے گھر آئے گا —"

"ہائے امی بیگم! مجھے چھپا لیں — وہ خان مجھے کھا جائے گا —" پونہ چلاتے ہوئے امی بیگم کے سینے میں چہرہ گھسیڑنے لگی۔

"پاگل ہو گئی ہو منو بھی تو ہے — وہ کوئی ڈرتی ہے —" ارم نے اسے جھڑکا۔

"کم منو بیگم بھی نہیں —" آثم نے قہقہہ لگایا — "مگر وہ اس وقت اونگھنے میں مصروف ہیں — وہ کچھ سن ہی نہیں رہیں —"

سب نے جلدی سے منو کی طرف دیکھا۔ وہ نانی اماں کے گھٹنوں پہ بیٹھی تھی اور اونگھ میں اس کا سر اپنے گھٹنوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ انجم اور ارم زور زور سے قہقہے لگانے لگیں۔

"چلو بھئی ہم تو چل دیئے" آثم پھر اٹھنے لگا۔

"اور لطیفہ بھائی جان —؟"

"تمہارا اپنا ہی ارادہ سننے کا نہیں ہے"

"نہیں نہیں — اب نہیں بولیں گی"

"تم لڑکیاں اور چند لمحوں کیلئے خاموش بیٹھ جاؤ — ناممکن — ناممکن —!"

"نہیں انثی! اب نہیں بولیں گی —" نانی اماں خود بڑی دلچسپی سے سن رہی تھیں۔ جلدی

سے ان کی ضمانت دے دی۔ آثم پھر بیٹھ گیا۔

"انھیں کہئیے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ لیں۔"

نانی اماں کے اشارے پر انجم اور ارم نے ہونٹوں پر سچ مچ انگلیاں رکھ لیں۔

"ہاں تو یوں وہ خان چار چار کر کے بے شمار روٹیاں کھا گیا۔۔۔ ہوٹل کا مالک سامنے کاؤنٹر پر بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بیرے کو پاس بلا کر کہنے لگا کہ یہ تو بڑا گھاٹے والا سودا ہے۔ سالن کی پلیٹ کی قیمت زیادہ کر کے ہم نے روٹیاں ساتھ اس لئے مفت کر دی تھیں کہ دو نہیں تو زیادہ سے زیادہ کوئی چار کھا لے گا۔ مگر یہ گاہک تو ہمارا سارا آٹا ختم کئے دے رہا ہے۔ سالن اس نے اور لیا نہیں اور مفتو مفت روٹیوں پر روٹیاں کھائے جا رہا ہے۔"

"پھر۔۔۔؟" بیرے نے پوچھا۔ "تم یوں کرو جا کر اسے پانی کا گلاس دو شاید پانی پینے کے بعد وہ کھانا ختم کر دے۔" "جی بہت اچھا۔" بیرا جانے لگا۔ "وہ سب سے بڑا والا گلاس لینا۔" مالک نے پیچھے سے آواز دی۔ بیرا اک بہت بڑا گلاس پانی کا بھر کر خان کے پاس لے گیا۔ "لو خان۔۔۔!" "یہ کیا ہے۔۔۔؟" خان نے کھاتے کھاتے سر اٹھایا۔۔۔ "پانی ہے۔"

"اسے ابھی لے جاؤ۔۔۔" خان نے بیرے کو گھور کر دیکھا۔۔۔ "خوچہ تم ایسا ہی مالوم ام نصف میں پانی پیتا اے۔"

امی بیگم، نانی اماں، انجم اور ارم بڑے زور زور سے قہقہے لگانے لگیں اور۔۔۔ سب کی ہنسی ذرا تھمی تو دیکھا پونہ سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

"پونہ تمہیں کیا ہوا۔۔۔؟" امی بیگم نے پچکارا۔

"یہ انجو اور ارم آپی میرے لطیفے پر ہنستی نہیں اور بھائی جان کے خان والے خراب سے لطیفے پر زور زور سے ہنستی ہیں۔۔۔" وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔ سبھی پھر ہنسنے لگیں۔

"اچھا میرا لطیفہ خراب ہے اور تم خراب نہیں ہو جو میرے لطیفے پر ہنسنے کے بجائے رونے لگی ہو۔۔۔؟ حالانکہ میں تمہارے لطیفے پر بڑے زور زور سے ہنسا تھا۔ ٹھہر جا چڑیل! کل لاتا ہوں اسی خان کو۔"

"نہیں نہیں۔۔۔" وہ چیخنے لگی۔

"چپ بھی کرو پونہ۔۔۔!" انجم نے پھر اسے جھڑکا۔ "مذاق کو بھی نہیں سمجھتیں اور شور مچانا شروع کر دیتی ہو۔۔۔"

اس کی ڈانٹ سے پونہ چپ ہو گئی تو وہ آثم کی طرف جھکی۔

"بھائی جان ایک اور۔۔۔" بڑے ملتجی لہجے میں فرمائش کر رہی تھی۔

"ہاں جی۔ ایک اور۔۔۔ ایک اور۔۔۔" ارم نے اس کی پر زور تائید کی۔

"نہیں نہیں بس۔۔۔!"

"ایک اور۔۔۔ ایک اور۔" معمول کے مطابق وہ سر میں بولنے لگیں۔

"چلو سنا بھی دو اثمی! بہنیں خوش ہو جائیں گی۔۔۔"

"ان بہنوں کا تو لالچ بڑھتا ہی جایا کرتا ہے۔۔۔ البتہ آپ کہتی ہیں تو سر تسلیم خم ہے۔"

"شریر۔۔۔!" امی بیگم مسکرا پڑیں۔۔۔ "چل اب سنا دے۔۔۔"

"ایک عورت سر جھکائے چلی جا رہی تھی۔ اس کے کانوں سے ایک گداگر کی صدا ٹکرائی۔

"بی بی جی! اندھے کو کوایک روپیہ دے دو۔۔۔" وہ عورت رحم اور ہمدردی کے مارے رک کر اس کی اندھی آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ مگر دوسرے ہی لمحے حیران ہو کر بولی۔ "ارے! اندھا کیوں۔۔۔؟ تمہاری ایک آنکھ تو ٹھیک ہے۔۔۔" "تو پھر بی بی جی! پچاس پیسے ہی دے دیجئے۔۔۔" جلدی جلدی لطیفہ ختم کر کے آثم اٹھ کھڑا ہوا۔

"اتنا چھوٹا سا۔۔۔!" مسکراہٹ کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے ارم بولی۔ "آپ نے تو ہمیں ٹرخانے والی بات کی ہے۔"

"لطیفہ سنانا تھا کوئی الف لیلیٰ کی داستان نہیں۔"

"ہاں بھائی جان! یہ بہت چھوٹا تھا۔ آپ کو ایک اور سنانا ہی پڑے گا۔" انجم نے بھی ہنستے ہوئے ارم کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"یہ لڑکیاں ہیں یا مصیبتیں۔۔۔؟" آثم نے فریادی نگاہوں سے امی بیگم اور نانی اماں کی طرف دیکھا۔

"بہنیں ہیں بیٹے!! اور جو بھائی بہنوں کو خوش کرتا ہے خدا اسے خوشی اور برکت دیتا ہے"
نانی اماں بھی انہیں کی طرف داری میں بولیں ——— آثم واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

نانی کی سفارش ایسی تھی کہ اسے ٹال ہی نہ سکا۔ چہرہ اٹھا کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے وہ سنانے کے لئے لطیفہ کم مگر کوئی ایسی بات زیادہ سوچ رہا تھا کہ پھر اس کے بعد اس کا ان سے چھٹکارہ ہو جائے۔ لطیفوں سے ان انجم اور ارم کا پیٹ تو کبھی بھرا ہی نہیں کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایک اور سنانے کے بعد بھی یہ مطالبہ جاری ہی رہے گا۔ سوچتے سوچتے یکایک اس کی آنکھوں میں بڑی پیاری سی شوخی بھری چمک لہرائی۔

"صرف ایک لطیفہ یاد آیا ہے مگر ——" پھر اس نے آنکھوں کے گوشوں سے انجم اور ارم کی طرف دیکھا ——"اس میں بھی کسی نیازی صاحب کا ذکر ہے۔ اور یہ لڑکیاں ....."
"نہیں نہیں ——" اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی انہوں نے کاٹ دی "ہم کچھ نہیں کہیں گی ——آپ جس کا مرضی ہے لطیفہ سنایئے ——"

"انکل نیازی شروع سے ہی بڑے حساس تھے ——" آثم نے کھنکھار کر لطیفہ سنانا شروع کیا۔

"انکل نیازی ——؟" انجم چونکی۔

"جس آدمی کا لطیفہ سنانے لگا ہوں۔ تمہیں بتایا ہے نا اس کا نام نیازی صاحب تھا۔ اور انکل میں نے مارے ادب کے لگا لیا ہے کیونکہ اس کی بھی عمر اتنی ہی تھی، جتنی تمہارے ڈیڈی کی ہے"

آثم نے وضاحت کی تو امی بیگم کے ہونٹوں پر بڑی خوبصورت سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ایک دن انکل نیازی آنٹی کے قریب صوفے پر ان کے پہلو سے پہلو ملا کر بیٹھ گئے، آنٹی جانے کس موڈ میں تھیں ——"

"آنٹی ——؟ یہ آپ کس آنٹی کی بات کر رہے ہیں ——؟" ارم گھبرا کر پوچھنے لگی ——
"آپ تو ہماری ممی کو آنٹی کہا کرتے ہیں ——"

"بھئی اس لطیفے والے نیازی صاحب کی بیوی بھی تمہاری ممی کی ہم عمر تھیں۔ اس لئے

ان کو بھی مارے ادب کے میں نے آنٹی کہہ دیا ہے۔ اگر مسز نیازی کہتا تو بے ادبی ہو جاتی ——"

"اثمی! انسان بنو ——" امی بیگم نے اپنی واضح سی مسکراہٹ کو ہونٹوں میں دبانے کی اک ناکام سی کوشش کی۔

"پھر نہ سنیں لطیفہ ——" آثم اٹھنے لگا۔

"نہیں نہیں —— لطیفہ تو اب ہم بھی سن کر ہی چھوڑیں گی ——" دونوں نے پھر اس کا ایک ایک بازو تھام لیا۔

"ہاں تو ——" آثم امی بیگم کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پھر شروع ہو گیا۔

"آنٹی کہنے لگیں ذرا پرے ہٹ کر بیٹھئے ——" حساس انکل نیازی اسی وقت اٹھ کر کمرے سے ہی باہر نکل گئے —— تھوڑی دیر بعد آنٹی نے دیکھا وہ گھر کے کسی دوسرے کمرے میں بھی نہ تھے۔ سوچا —— کسی کام کیلئے بازار گئے ہوں گے۔ ابھی آ جائیں گے۔ مگر شام ہو گئی انکل نہیں آئے"

"اوں اوں ——" ارم نے شک بھری نگاہ سے آثم کو دیکھا —— "اب صرف انکل کہنے لگے ہیں"

"اوہو! بھئی عادی ہوں نا اپنے نیازی انکل کو صرف انکل کہنے کا۔ تبھی منہ سے نکل گیا ——" یہ کہتے کہتے آثم نے زردیدہ نگاہی سے امی بیگم کو دیکھا۔ اب ان کے ہونٹوں پر باقاعدہ ہنسی تھی۔

"پھر یہ لطیفہ نہیں سننا ——؟" آثم بڑے شوخی بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے جھک جھک کر ارم اور انجم کے چہروں کو دیکھنے لگا۔

"بھئی سناؤ نا اثمی! میں بھی تو سن رہی ہوں ——" ان دونوں کے بجائے نانی اماں بولیں۔

"اوہ —— یہاں سبھی ایک ہی کشتی میں سوار ہیں" آثم بڑبڑایا۔

"کیا کہہ رہے ہو بیٹے ——؟"

"کچھ نہیں —— کچھ نہیں —— سنیئے —— شام کے بعد رات آ گئی —— وہ تب بھی نہیں

آئے — پھر اگلا دن ہوا — پھر اگلی رات — وہ پھر بھی غائب رہے۔ اب تو آنٹی کو بڑی تشویش ہوئی۔ سارے رشتہ داروں، عزیز و اقارب اور دوستوں کے گھروں میں تلاش کیا گیا۔ مگر وہ کہیں نہیں ملے — آخر تیسرے چوتھے دن گھر میں سب اعزہ و اقارب جمع ہوئے کہ اس مسئلے کے متعلق کچھ سوچا جائے کہ بنا زی انکل چلے کہاں گئے تھے؟

سب بڑے پریشان تھے۔ عین اس وقت ڈاکیہ آ گیا۔ بڑا خوبصورت معطر سا لفافہ تھا۔ آنٹی کے نام۔ آنٹی نے جلدی سے لے کر کھولا — شکر کیا — وہ انکل ہی کا تھا جلدی جلدی پڑھنے لگیں — لکھا تھا — "اس وقت میں آپ سے تقریباً ساڑھے تین سو میل پرے ہٹ چکا ہوں۔ اگر یہ کافی ہے تو اپنی خوشنودی اور پانچوں لڑکیوں کی خیر خیریت سے مطلع کر دیجئے اور اگر اتنا فاصلہ بھی کافی نہیں تو پھر میں اور پرے ہٹنے کی کوشش کروں۔"

آثم نے لطیفہ ختم کیا — امی بیگم کا قہقہہ بڑا زوردار تھا۔ نانی اماں کا بھی پورا وجود ہنسی سے ہل رہا تھا۔ مگر ارم اور انجم خاموش سی تھیں۔

"تمہیں کیوں سانپ سونگھ گیا — ؟" آثم نے ہنستے ہوئے دونوں کی آنکھوں میں باری باری جھانکا۔

سوچوں میں کھوئی ہوئی انجم بولی "یہ آپ نے آخر میں پانچ کنواری لڑکیوں کا ذکر کیا ہے — ؟"

"اچھا — ؟" اب ارم بھی چونکی — "تو یہ آپ نے ہمارے ہی ڈیڈی اور ممی کا لطیفہ سنایا ہے۔ انہیں کی ہم پانچ لڑکیاں ہیں۔"

امی بیگم اور نانی اماں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ انجم اور ارم آثم کی شرارت سمجھتے ہی اس پر جھپٹنے کیلئے اسکی طرف لپکیں۔

"تو تم ہر وقت مجھے لطیفے سنانے کیلئے کیوں کہتی رہتی ہو — ؟" اپنے دفاع کے لئے آثم نے بھاگ کر نانی اماں کے پیچھے پناہ لے لی۔ "دو کانوں کو ہاتھ لگاؤ آئندہ مجھے تنگ نہیں کرو گی۔ ورنہ میں ایسے ہی کیا کروں گا۔"

"ارے — !" لپکتے لپکتے وہ وہیں ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ آثم نے نانی اماں کی پشت کی طرف سے سر نکال کر ان کے کندھے کے اوپر سے دونوں کو دیکھا — دونوں ہی حیرت و استعجاب بھری نگاہیں دروازے پر جمائے کھڑی تھیں۔

"امی بیگم! وہ کون ہے — ؟" بہت ہولے ہولے سے ساتھ پوچھ رہی تھیں۔ سب کی نظریں ان کی نگاہوں کے تعاقب میں اسی طرف اٹھ گئیں۔

خوبصورت سی ناک میں بڑا سا لونگ تھا۔ اور کانوں میں چاندی کے بڑے بڑے بالے۔ گلے میں چاندی کا چوڑا نیکلس اور سبک سی کلائیوں میں لاکھ کے موٹے موٹے کنگن۔ چٹخنے غنچوں ایسے نازک، نازک ہونٹوں پر دنداسے کا گہرا سا رنگ تھا اور نشیلی آنکھوں میں کاجل کے لمبے لمبے ڈورے — کھلے گلے والی اونچی اونچی سی چولی کے نیچے پڑے سے گھیر والا گھاگرا اس نے پہنا ہوا تھا — دروازے کے عین بیچوں بیچ کھڑی مسکرا مسکرا کر وہ سب کو دیکھ رہی تھی۔ آثم حیرت میں ڈوبا ہوا نانی اماں کے پیچھے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہائے! یہاں تو آثم بھی ہے —" ہاتھوں میں چہرہ چھپاتے ہوئے وہ یکایک پلٹ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

"ارے یہ تو آپی ہیں —" انجم اور ارم اس کی آواز پہچانتے ہی اس کے پیچھے ہی لپکیں — "آپی! کیا آپ کسی فینسی ڈریس کی تقریب میں جا رہی ہیں — ؟"

برآمدے تک پہنچتے پہنچتے ہی دونوں نے اسے جا لیا — "ہائے! کتنی پیاری لگ رہی ہیں —" دونوں ہی اس کے ساتھ لپٹ گئیں۔

"ارے چھوڑو! مجھے جانے دو —"

"امی بیگم کو تو دکھایئے —" وہ اس کے بازو پکڑ کر واپس کھینچنے لگیں۔

"انھیں ہی تو دکھانے آئی تھی —"

"پھر آیئے نا —"

"وہاں آثم بھی ہے —"

"ہائے! تو بھائی جان سے آپ کا کوئی پردہ ہے — ؟"

"اس لباس میں مجھے شرم آتی ہے۔"

"کیا کہنے ——— اور بھی کسی سے نہیں آتی سے شرم ———" آثم اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا ——— جانے کب آگیا تھا۔

"ہائے اللہ ——" صنم نے پھر ہاتھوں میں چہرہ چھپالیا۔ "تم یہاں کیوں آئے۔"

اس کے سوال کو نظر انداز کر کے وہ بڑی دلچسپی سے اس کے سراپا کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کس ڈرامے کی ریہرسل ہے ——؟"

"اسی ڈرامے کی ———" صنم اندر امی بیگم کے پاس بھاگ گئی ——— پاؤں میں پہنی ہوئی اس کی پازیب چھن چھن کر اٹھی۔

"یہ تو ہے صنو ——" امی بیگم حیرت اور دلچسپی سے اسے سر سے پاؤں تک گھور رہی تھیں ——— "کوئی قسم کھا کر بھی نہیں کہہ سکتا کہ تم ایک تعلیم یافتہ شہری لڑکی ہو۔"

"سچ امی بیگم ——؟"

"بالکل ——— کیوں اماں ——؟"

"کیا ——؟" نانی اماں نے پلکیں جھپکیں۔

"یہ اپنی صنم نہیں لگتی نا ——؟"

"تو یہ صنم ہے ——؟" نانی اماں کی معصومیت پر بڑے زور کا قہقہہ لگا۔

انجم اور ارم بھی واپس اس کے پیچھے ہی کمرے میں آچکی تھیں۔ لہرا لہرا کر بل کھا کھا کر ہنس رہی تھیں۔

"ہاں اماں! یہ اپنی صنو ہے ——"

"میں تو سچ مچ کوئی خانہ بدوش قسم کی لڑکی ہی سمجھی تھی اور پوچھنے ہی لگی تھی کہ یہ یہاں کیا مانگنے آئی ہے ———" نانی اماں نے بڑی تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"واہ بیٹی! تو نے تو خوب نقل کی ——"

"بس امی بیگم! مجھے یہی معلوم کرنا تھا ———" صنم کھل کھل کر کے ہنستے ہوئے واپس مڑی۔

"کہاں چلیں ——؟"

"امی بیگم! بہت کام ہیں اور پھر اپنا حلیہ بھی تو اب درست کروں ——— کہیں ابا میاں نہ آجائیں ——"

"لیکن معلوم تو ہو کہ آخر یہ بہروپ تم نے بھرا کیوں ——؟"

"ابھی واپس آکر بتاتی ہوں ———" چٹکی بجاتے ہوئے وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اپنے گھر جانے کیلئے وہ لان کی دیوار پر چڑھ ہی رہی تھی کہ پیچھے سے آثم نے اسے بازوؤں میں بھر کر واپس کھینچ لیا۔

"یہ کیا ———؟ ہمیں اچھی طرح دکھائے بغیر ہی بھاگی جا رہی ہو ——؟"

"میں تمہیں تو دکھانے بھی نہیں آئی تھی ——" وہ شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "تم نے کہا تھا ایک دوست کو ملنے جا رہے ہو ——— میں تو سمجھی تھی تم وہیں ہو گے ——"

"گیا تھا مگر وہ ملا ہی نہیں ——— شاید اسی لئے کہ تمہارے یہ سہانا سا روپ دیکھنا میرے مقدر میں بھی تھا ——" آثم اس کے دونوں کندھے تھامتے ہوئے اسے سر سے لیکر پاؤں تک بڑے غور سے دیکھنے لگا۔

"صنو! میری جان!! تم پر ہر روپ یوں کھلتا ہے جیسے تم اسی کیلئے تخلیق کی گئی ہو۔ میری اپنی صنم ———" آثم نے اسے بازوؤں میں بھر کر اپنی چوڑی چھاتی کے ساتھ لگا لیا۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں جو ......"

"اچھا اچھا بس ——— اور کچھ مت کہنا ———" صنم نے کسمسا کر اس کے بازوؤں کی مضبوط گرفت سے نکلنے کی کوشش کی ——— "کوئی آجائے گا ——"

آثم نے چونک کر اسے چھوڑ دیا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا ——— "ایک تو اب یہ آنے جانے والوں کا ڈر ہر وقت میری جان نکالے رکھتا ہے۔ بچپن کتنا اچھا تھا ——— سر عام ایک دوسرے کے بازوؤں میں بازو ڈالے گھنٹوں بیٹھے رہا کرتے تھے۔"

صنم زور سے ہنس دی ——— دنداسے کے گہرے گہرے رنگ والے ہونٹوں کے درمیان اس کے دانت یوں چمکے جیسے سچے موتیوں کی لڑی۔ آثم نے اس کے منہ پر

جلدی سے ہاتھ رکھ دیا ——" اتنی بجلیاں نہ گراؤ جان! کہ بالکل ہی راکھ ہو جاؤں "

" رومانس ختم —— میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں —" واپس جانے کیلئے صنم مڑی۔

" ڈیوٹی پر ہو —؟ کونسی ڈیوٹی —؟"

" میرا یہ بہروپ دیکھ کر بھی تم نہیں سمجھے —؟" صنم مسکرائی۔

" ارے وہی — ریشماں کے چوہدری کے ساتھ رومانس لڑانے والی ڈیوٹی "

" اوہ —" آثم نے سر ہلایا — پھر کچھ سوچتے ہوئے یکایک بولا۔

" نہیں نہیں —— بھاڑ میں جائیں وہ خدا بخش اور اس کی ریشماں وغیرہ میں تمہیں اس روپ میں کہیں نہیں جانے دوں گا —"

" آثمی! یہ کیا کہہ رہے ہو —؟"

" ہاں بس! تم میری ہو ناں — جو کہوں گا وہی کرو گی —" وہ اکھڑ پن سے بولا۔

" مگر آثمی! تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ یہ ناٹک کھیلنے سے دونوں خاندانوں کا بھلا ہو سکتا ہے۔ یہ تمہاری ہی تو تجویز تھی ——"

" لیکن اس وقت مجھے یہ اندازہ بالکل نہیں تھا کہ اس قسم کے روپ میں تم اتنی پیاری لگو گی ——"

" عجیب انسان ہو تم ——" شرمیلی سی ادا کے ساتھ صنم مسکرائی — پھر دوسرے ہی لمحے آثم کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

" پھر ٹھیک ہے ابا میاں کو بھی خود ہی جواب دے لینا اور جو اتنے شوق، اتنی محنت اور لگن سے ادارہ کھولا ہے وہ بھی بند کر دو ——" صنم اس کی طرف دیکھے بغیر نگاہیں جھکائے بڑبڑاتی چلی گئی ——" دل میں جو نیکیاں کرنے اور دوسروں کے کام آنے کے اتنے ڈھیر سارے عزائم رکھنے کا دعویٰ کرتے ہو نا — آئندہ وہ بھی نہ کرنا — میں سمجھی تھی کہ تمہارے دل میں سچ مچ دوسروں کیلئے کچھ کرنے کی تمنا ہے "

" تو اور نہیں ہے کیا —؟"

" ہوتی تو یوں تو نہ کہتے —"

" لیکن صنو تم خود ہی سوچو —— میں ایک مرد ہوں — تم سے محبت کرنے والا مرد —— پھر تمہیں میں کیسے کسی غیر کے پاس اس طرح، اس روپ میں جانے کی اجازت دے دوں۔ محبت کرنیوالا انسان بڑا شکی، بڑا حاسد ہوتا ہے "

" تو پھر یا محبت کر لو اور یا دوسرے انسانوں کا درد سینے میں رکھو، تمہارے دل میں اتنی وسعت نہیں ہے کہ اس میں سب کچھ سما جائے ——"

" یہ تم مجھے طعنہ دے رہی ہو —؟"

" طعنہ نہیں دے رہی — تمہیں احساس دلانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کچھ بھی پانے کے لئے انسان کو اس کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ ان کا کام بن گیا تو ہمیں بے شمار خوشی ملے گی۔ اور اس خوشی کی قیمت ہمیں ضرور چکانا بھی ہو گی — جسمانی محنت سے یا ذہنی کاوش سے یا پھر کوئی اور قربانی دے کر — مثلاً جس سے تم اب بھاگنے کی کوشش کر رہے ہو ——" صنم بولے جا رہی تھی اور آثم چپ تھا۔ بڑے غور سے اسے تک رہا تھا۔

" اب یہی دیکھ لو تھوڑے سے ہی عرصہ میں ہمارے ادارے اور کام کی کتنی شہرت ہو گئی ہے۔ لوگ کتنی ہماری تعریفیں کرتے ہیں۔ اور جن کے کام سنور گئے ہیں وہ کتنی ہمیں دعائیں دیتے ہیں —— ہم خوش ہوتے ہیں — ہمارے والدین خوش ہوتے ہیں — اس کے علاوہ کئی اور لوگوں کو اس راہ پر چلنے کی ترغیب ملی ہے۔ شوکت اور صبورہ بھی ہمارے ادارے میں شامل ہو گئے ہیں۔ کرنل صاحب، تلقین حیدر اور مولانا فیض الہٰی ہماری پشت پر ہیں۔ شہر کے بہت سارے دوسرے مخیر حضرات نے چندہ دینے کی بھی پیشکش کی ہے ——"

" تو تم اس کام کیلئے صبورہ کو بھیج دو ——"

" اسے ہی بھیج دیتی مگر وہ ابھی نئی نئی آئی ہے۔ ابھی تو وہ ہمارا طریقہ کار صرف سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے "

" مگر ایسا کام ——" آثم کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے " ایک عیاشی قسم کے

انسان کے ساتھ معاشقہ لڑا کر اسے شادی کے لئے تیار کرنا۔"

"اور کوئی حل ہی نہیں ہے۔ ابا میاں اور کرنل صاحب وغیرہ کا بھی متفقہ فیصلہ یہی ہے۔"

"ہم خدا بخش سے کہہ دیں گے کہ یہ کام نہیں ہو سکتا۔"

"اگر اوکھلی میں سر دیا ہے تو دھماکوں سے کیوں ڈرتے ہیں۔ اب تو جیسا بھی جس قسم کا بھی کسی کا مسئلہ ہو گا ہمیں ہاتھ میں لینا پڑے گا۔ اور پھر جس طرح اس کا حل ہو سکے گا وہ ہمیں کرنا ہی ہو گا۔"

آتم گم سم سا تھا۔ صنم کئی لمحات بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ "میرا تمہارا بچپن کا ساتھ ہے۔ کئی سالوں کا۔ اتنا پرانا۔ اتنا مضبوط۔ مگر تمہیں کسی پر اعتبار نہیں۔ مجھ پر۔ میری محبت پر یا اپنے آپ پر۔؟"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اتنا پرانا اور اتنا مضبوط ہمارا رشتہ ہے پھر اعتبار کیوں نہیں ہو گا۔"

"نہیں ہے۔ تبھی ایسا کہہ رہے ہو۔ اعتبار ہوتا تو اس چند روز کے ناٹک کیلئے ایسے بے اعتباری والے کلمات منہ سے نہ نکالتے۔ اتنے سالوں کی محبت پر ان چند گھنٹوں کے کھیل کو بھاری سمجھ کر تم تو شک اور حسد جیسے غلط قسم کے جذبوں تلے ابھی سے پسے جا رہے ہو۔"

"اوہو صنو! تم نے تو چھوٹی سی بات کو اتنا بڑا بنا دیا۔"

"میں آتمی! تمہیں سب سے بڑا دیکھنا چاہتی ہوں۔ ان چھوٹے موٹے جذبوں اور پست قسم کے خیالات سے بہت بلند۔ بہت عظیم۔"

اس نے ہاتھوں میں پکڑے آتم کے دونوں ہاتھ زور سے دبائے۔ پھر اپنے ہونٹ ان پر رکھ دیئے۔ "میں جنم جنم سے تمہاری ہوں اور زندگی کے آخری لمحے تک تمہاری رہوں گی اور۔ فرض، فرض ہے۔ ہم دونوں کو چاہئے کہ ایک دوسرے پر بھی

اس کو فوقیت دیں۔"

"تو پھر جتنے دن تمہیں وہاں جانا پڑا میں بھی ساتھ جایا کروں گا۔"

"یہ ہوئی نا مردوں والی بات۔ تم میرے آس پاس ہی کہیں موجود رہا کرنا۔ یوں میرے بھی حوصلے قائم رہیں گے۔ اور میں خود کو محفوظ بھی سمجھوں گی۔"

"تو پھر۔" آتم مسکرایا اور صنم کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا "اس عورت کا مرد جیسا ہونا چاہیئے۔ ویسا ہی میک اپ میرا بھی کر دو۔"

"اچھی بات۔" حجاب آلود مسکراہٹ کے ساتھ ڈھیروں ڈھیر پیار برساتی نگاہیں اس نے آتم کے چہرے پر گاڑ دیں۔ پھر قدرے توقف بعد شرمیلی سی آواز میں بولی۔ "میرے مرد کی مونچھیں تو بالکل ٹھیک ہیں بس اک ذرا سر میں ڈھیر سارا تیل ڈالنا پڑے گا۔ اور ایک میلی سی دھوتی اور واسکٹ کا بندوبست کرنا ہو گا۔"

"واہ واہ! عورت اتنی سجی سنوری اور مرد ایسا غلیظ سا۔" آتم نے احتجاج کیا۔

"عورت نے تو ایک مرد کو پھانسنا ہے۔"

"ہت چڑیل۔" آتم نے یکدم اس کے بال مٹھی میں جکڑ لئے۔

"خبردار! پھر کبھی ایسی بات نہ کہنا۔ تم کسی کو پھانسنے والی عورت نہیں ہو۔"

"ہائے اللہ! چھوڑو بھی۔ تم تو مذاق کی بات کو بھی سنجیدہ بنا لیتے ہو۔"

"تمہیں پتہ ہے نا اپنی صنم کے معاملے میں، میں کوئی مذاق میں بھی کی گئی ایسی ویسی بات برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اچھا معافی۔" صنم نے بڑی ادا کے ساتھ دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کی اس ادا سے محظوظ ہوتے ہوئے آتم نے اس کے بال چھوڑ کر ساری کی ساری کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

○

کھلے گلے اور بغیر آستینوں والی مہین سی سیاہ میکسی پر بے حد خوب صورت سفید تاروں کا کام تھا۔ وہ پہن کر دھنک قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔

"کیسی لگ رہی ہوں —— ؟" آئینے میں اس سے پہلو سے پہلو ملائے کھڑا آثم دکھائی دے رہا تھا، اس کا بے حد سمارٹ اور وجیہہ آثم —— ! جس کے پُرکشش چہرے پر بکھری مسکراہٹ بڑی دلنشین تھی "بتاؤ نا —— کیسی لگ رہی ہوں —— ؟" دھنک نے اک ادائے دلبری کے ساتھ اسے دوبارہ مخاطب کیا

آثم کی پرشوق نگاہیں دھنک کے چمکتے دمکتے چہرے پر گڑی تھیں —— چند لمحے اسی انداز میں کھڑا چہرے پر بے حد خوب صورت مسکراہٹیں لئے وہ اسی طرح والہانہ نگاہوں سے اسے گھورتا رہا۔ پھر —— دھنک کے بے حد حسین، پھولوں جیسے نازک اور معطر سے پیکر کو اپنے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے سرگوشی میں بولا ——

"تمہارا یہ مسحور کن حسن دیکھ کر دھنک ! میری تو قوتِ گویائی ختم ہو جاتی ہے۔ تم کیسی لگ رہی ہو —— ؟ جاننا چاہتی ہو تو آؤ میرے دل کی دھڑکن سنو —— میری آنکھوں کی زبان سمجھنے کی کوشش کرو —— تم ہی تو میرے جذبوں کی سچی داستان ہو —— میری آرزو، میری تمنا ہو —— تم ہی تو میری المول محبت ہو —— میری زندگی ہو، میرا ایمان ہو —— تمہارے وجود نے ہی تو میری تکمیل کی ہے میری بچپن کی منگیتر، میری زندگی کی ساتھی ! تم سا حسین اس پوری کائنات میں اور کوئی نہیں —— لیکن —— تمہارا یہ لباس —— صرف میری دید کی پیاسی آنکھوں کی پیاس بجھانے کے لئے اور یہ سج دھج صرف میرے جذبات کی تسکین کے لئے ہونی چاہیئے کہ تم میری ہو —— صرف میری —— !!"

"دھنک ! ابھی تک تیار نہیں ہوئیں —— ؟" امی کمرے میں آگئیں ——

وہ چونکی —— گڑبڑائی —— آثم کی شبیہہ آئینے میں سے غائب ہو گئی —— وہ اب وہاں اکیلی کھڑی تھی —— لیکن نہیں —— وہ صرف دوسروں کی نظر میں اکیلی تھی، ورنہ اس کا آثم تو ہر وقت اس

کے پاس ہی موجود رہتا تھا، اس کی دھڑکنوں میں، اس کی نگاہوں میں، اس کی آتی جاتی اک اک سانس میں !!

"تیار تو ہو چکی ہو —— پھر باہر کیوں نہیں آتیں —— ؟" امی نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا —— "شہزاد انتظار کر رہا ہے"

دھنک نے امی کے مجبور کرنے پہ یہ لباس پہن تو لیا تھا، مگر ہمیشہ کی طرح آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جب اپنے آثم سے مشورہ لیا کہ اسے یہ لباس، نیم عریاں لباس کسی غیر محفل میں پہن کر جانا چاہیئے بھی تھا یا نہیں۔ تو —— اس کا آثم ہمیشہ اس کے ضمیر کی آواز بن اسے مناسب اور درست مشورہ دیا کرتا تھا۔ پھر وہ اسی کی مانا کرتی تھی "ڈیئر امی ! مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا —— اسے بدلنے لگی ہوں ——"

"کیوں —— ؟" امی نے حیرت سے اسے گھورا، سفید تارے ٹکی سیاہ میکسی میں اس کا سڈول اور متناسب جسم اتنا خوب صورت لگ رہا تھا اور اس کا چہرہ یوں چاند کی طرح دمک رہا تھا کہ خود امی کی نگاہیں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں اور وہ کہہ رہی تھی کہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا —— !

کیسی بے وقوف اور خبطی سی لڑکی تھی —— ! امی نے قدرے تیکھی نگاہ سے اسے دیکھا "کیا ہوا اس لباس کو —— ؟"

"دوپٹے کے بغیر مجھے کہیں جانا اچھا نہیں لگتا، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ننگی ہوں ——" وہ مڑی۔

"اب کیا کرنے لگی ہو —— ؟"

سفید ساڑھی پہن لیتی ہوں ——"

"ہر موقع پر سفید ساڑھی —— اتنی اچھی تو لگ رہی ہو، یوں جیسے کوئی شہزادی ——" جانے شہزاد کب دروازے میں آکھڑا ہوا تھا —— دھنک نے گھبرا کر پیچھے دیکھا —— شہزاد کی نگاہیں اس کے سراپا پر جمی تھیں اور وہ ایک ٹک اسے تکے جا رہا تھا —— یکدم سینے پر دونوں بازو باندھتے ہوئے وہ ڈریسنگ روم کی طرف بھاگ گئی ——

"عجیب لڑکی ہے ——" امی بڑبڑائیں ——

"اسے کہیئے نا امی ! دیر ہو رہی ہے ——" شہزاد واپس جاتے جاتے بولا ——

"دھنک —— !" امی ڈریسنگ روم کے دروازے میں جا کھڑی ہوئیں۔ "اب آ بھی جاؤ نا"

"آپ چلیے ـــ میں دوسرے کپڑے پہن کر ابھی دو منٹ میں آئی ـــ" وہ الماری میں جلدی جلدی کپڑے الٹ پلٹ کر رہی تھی ـــ

"پہننے رہو نا یہی ـــ اتنے شوق سے وہ لایا ہے ـــ"

"امی!" دھنک نے گردن موڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔ "کسی دن اس نے بڑے شوق سے کہہ دیا کہ ننگی ساتھ چل پڑو تو پھر بھی کیا آپ مجھے ایسا ہی کرنے پر مجبور کریں گی ـــ؟"

"دھنک ـــ!" شدت طیش سے امی کا پورا وجود کپکپا اٹھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر بڑے زور سے ایک تھپڑ اس کے صبیح و چکیلے رخسار پر جڑ دیا۔ "تم اب بہت گستاخ ہوتی جا رہی ہو ـــ کیا مجھے ایسا ہی بے غیرت سمجھ رکھا ہے ـــ؟"

چوٹ کھائے رخسار پر ہاتھ رکھتے ہوئے پرنم آنکھوں سے دھنک نے ماں کو دیکھا پھر مدہم اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی ـــ "آپ پھر کیوں اس کا لایا ہوا ہر کپڑا مجھے پہننے پر مجبور کرتی ہیں" ـــ ساتھ ہی وہ رونے لگی ـــ یاد ہے ـــ؟ پہلی بار جب وہ میرے لیے ساڑھی لایا تھا تو کاشی جی نے کہا تھا۔ "ہمارے ہاں کنواری لڑکیاں ساڑھی نہیں پہنتیں ـــ" کیوں کہا تھا ـــ؟ صرف اسی لئے نا کہ وہ میرے لئے لائی گئی اس کی کوئی چیز لینا نہیں چاہتے تھے، اور اب جو کچھ وہ لاتا ہے آپ وہ لے بھی لیتی ہیں اور پھر مجھے پہننے پر مجبور بھی کرتی ہیں ـــ مگر امی! میری اپنی بھی کوئی سوچ ہے، ایک دل ایک دماغ رکھتی ہوں ـــ میں کیا کروں ـــ کیا کروں ـــ؟؟" وہ سسکیاں بھرنے لگی ـــ

"آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میں نے میکسی پہن تو لی تھی لیکن پھر آئینے میں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ شہزاد بھائی کے ساتھ کہیں جانے کے لئے یہ لباس مناسب نہیں ہے ـــ امی! ہر رشتے کا ایک علیحدہ مقام ہوتا ہے، کاشی جی نے تو ایسا ویسا لباس پہننے کو مجھے کبھی نہیں کہا تھا ـــ یہ شہزاد بھائی کیسے کہتے ہیں ـــ؟"

"چل ـــ پھر اس کے خلوص کو الٹے معنی پہنانا شروع کر دے۔" امی طیش بھری آواز میں پھنکاریں "برے لوگ ہمیشہ اچھی چیزوں میں بھی برائی تلاش کر لیتے ہیں، ایسے ہی جیسے مکھی سارا جسم چھوڑ کر زخم پر بیٹھتی ہے، اسی طرح تم ہو دھنک؟ اور مجھے افسوس ہے کہ ایسی بری اولاد کو میں نے جنم دیا ہے خود مجھی نے ـــ!" وہ کھڑی روئے جا رہی تھی ـــ سسکیوں کی وجہ سے اس کا وجود لرز رہا تھا۔ امی

نے نگاہ بھر کر اسے دیکھا، اشتعال کچھ کم ہو گیا، لہجے کو قدرے نرم کرتے ہوئے پھر بولیں ـــ "ہزار بار کہا ہے کاشی کا مقدمہ ختم ہونے تک ذرا سہولت سے وقت گزار لے، اپنے مزاج میں تھوڑی سی نرمی پیدا کر لے ـــ"

"امی! میں نے تو اپنی مرضی، اپنا مزاج کچھ رہنے ہی نہیں دیا ـــ میں تو جذبات و احساسات سے عاری ایک بے جان کٹھ پتلی ہوں امی! جس ناچ آپ نچاتی رہتی ہیں میں ناچتی رہتی ہوں۔" چہرے پر سے ہاتھ ہٹا کر اس نے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "آپ جو کچھ کہتی ہیں کیا میں ہمیشہ وہی نہیں کرتی ـــ؟"

"کرتی تو ہو ـــ" امی کی نگاہیں جھک گئیں ـــ مگر ساتھ ہی اڑیل ٹٹو کی طرح قدم قدم پر اڑتی بھی تو ہو ـــ یہ مجھے تھوڑی تکلیف ہے ـــ"

"آخر ضمیر کو بالکل ہی کیسے مار دوں ـــ؟"

"پھر وہی بات ـــ مطلب یہی ہے نا تمہارا کہ میرا ضمیر مر چکا ہے، دے لے دھنک! تو بھی جتنی چاہتی ہے مجھے گالیاں دے لے ـــ میں ہوں ہی اس قابل ـــ شوہر میرا سر پر نہیں ہے، بیٹا میرا جیل میں ہے، لے دے کر ایک تو ہی رہ گئی ہے ـــ تو بھی ہر وقت مجھے دکھی ہی کرتی رہتی ہے ـــ" امی دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں اور امی کے یہ آنسو ـــ یہ تو دھنک کو ہمیشہ ہی زیر کر دیا کرتے تھے، ہمیشہ ہی بے قرار و بے چین کر دیا کرتے تھے۔

"اوہ امی! پلیز چپ ہو جائیے۔" اپنی سوچیں اور اپنا رونا بھول بھال اس نے امی کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے ـــ "رو یئے نہیں امی! مجھے تکلیف ہوتی ہے ـــ"

"تکلیف ہوتی تو تو یہ سب نہ کرتی ـــ لاکھ بار تجھے سمجھایا ہے کہ شہزاد کے خلوص و ایثار کا اگر تمہیں احساس نہیں تو بھائی کے مقدمے وغیرہ کی مصلحت ہی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ذرا طبیعت بدل لے، تجھے زمانے کا پتہ نہیں، ابھی عزت کی روٹی کھا رہی ہو، اگر شہزاد پوچھنے والا نہ ہوتا تو پتہ نہیں ہماری کس بھاؤ بکتی ـــ" امی مسلسل آنسو بہائے جا رہی تھیں ـــ "اشارے کنائے یا ڈھکی چھپی کو اگر تم نہیں سمجھ سکتیں، تو آؤ تمہیں صاف صاف اور پوری طرح کھول کر بتاؤں کہ کسی نے بھی ہمیں ایسے ہی ایک کوڑی کی بھی امداد نہیں دے دینا تھی، ہر کسی کی نگاہ تمہارے حسن اور جوانی ہی پر ہونا تھی اور میرا

کمزور بڑھاپا اس خزانے کی حفاظت کرنے کی طاقت اپنے میں نہیں رکھتا۔"

"امی ——!" دونوں ہاتھوں میں اپنا چاند سا چہرہ چھپاتے ہوئے دھنک نے چیخ ماری۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ——؟

زبان کھلوائی ہے تو اب کھلے ہوئے زخموں کا منہ بھی دیکھ لو —— اگر شہزاد سے امداد لینا بے عزتی ہے تو یہ بے عزتی میں تمہاری ہی خاطر برداشت کر رہی ہوں —— کہ کچھ بھی ہو وہ کاشف کا دوست ہے، بچپن سے اس کا ہمارے گھر آنا جانا ہے، دوستی کے ناطے اس کی آنکھ میں کچھ لحاظ تو ہوگا —— اور میں کسی کو زبان دے چکی ہوں —— تم کسی کی امانت ہو —— اس ذمہ داری کے بوجھ نے نہ صرف میرے ناتواں کندھوں کو بلکہ میرے سر کو بھی جھکا دیا ہوا ہے ——"

"امی! مجھے معاف کر دیجئے ——" وہ امی کے قدموں میں بیٹھی آنسو بہائے جا رہی تھی

انہوں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا ——

"امی! آپ آ بھی جائیے نا ——" باہر سے شہزاد کی آواز آئی

"آ رہی ہوں بیٹے!" امی پلٹیں ——

"میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں ——" دھنک ہولے سے بولی ——

امی دوپٹے سے اپنی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

"آپ بڑھاپے کی کمزور نگاہ سے سب حالات کو دیکھتی ہیں امی —— لیکن میں تو جوان ہوں

دھنک نے اٹھ کر جلدی سے الماری میں سے ساڑھی نکالی۔

میں، میرا حسن، میری جوانی، سب کچھ آتم کی امانت ہے اور اس کی امانت کی حفاظت کرنے کی مجھ میں بہت ہمت اور طاقت ہے —— ٹھیک ہے آپ کے مجبور کرنے پر میں شہزاد کے ساتھ اس کے دفتر جانے لگی ہوں —— کہ میرے کاشی جی کا کام ہے دعوتوں اور تقریبات میں جانے لگی ہوں کہ مصلحت اسی میں ہے، اسے خوش رکھا جائے مگر —— میں ایسا نیم عریاں سا لباس کبھی کسی کی خوشی یا کسی مصلحت کی خاطر بھی نہیں پہنوں گی —— میں بناؤ سنگھار کسی اور کی خاطر کبھی نہیں کروں گی —— کبھی نہیں —— میرا جسم آتم کی امانت ہے میری جان آتم کی ملکیت ہے ——" وہ بڑبڑاتی رہی اور جلد جلد تیار ہوتی رہی میکسی اتار کر اس نے زرد ساڑھی پہنی —— بڑی سادگی سے بال بنائے —— کوئی میک اپ

نہیں کیا کوئی زیور نہیں پہنا —— بس اپنے چہرے پہ ہلکی سی خوشگوار سی، زبردستی ہی سہی اک مسکراہٹ لاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی ——

"ارے! شادی کی تقریب میں اتنی سادہ —— کوئی زیور ہی پہن لیا ہوتا ——"

امی کے غصیلے لہجے میں کئے گئے اس اعتراض کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ جا کر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔

"اس لڑکی نے تو میری زندگی اک مسلسل عذاب بنادی ہوئی ہے۔" اس نے میکسی نہیں پہنی تھی۔ امی کو سارا غصہ وہی تھا، بڑبڑاتے ہوئے گاڑی تک آ پہنچیں۔

"کیا ہوا امی ——؟" شہزاد نے ان کی بڑبڑاہٹ سنی ضرور مگر وجہ سمجھ میں نہ آ سکی ——

"دیکھو نا —— شادی میں جا رہی ہے —— اور حالت کیا بنائی ہوئی ہے ——؟"

شہزاد نے نگاہ بھر کر دھنک کے چہرے کی طرف دیکھا —— "مجھے تو امی! ٹھیک ٹھاک ہی لگ رہی ہے —— کوئی بھی تو کمی نہیں ——"

اس کا وجود ہی ایسا سجا سجایا تھا کہ نہ اُسے کسی چمکیلے بھڑکیلے لباس کی ضرورت تھی اور نہ زیورات وغیرہ کی —— اس کی سادگی میں بھی دلہنوں کا سا بناؤ سنگھار تھا —— شہزاد محسوس ہی نہ کر پایا —— نگاہیں دھنک کے چہرے پر ٹکی کی ٹکی ہی رہ گئیں۔

امی اسی کی خوشنودی کی خاطر تو یہ سب کچھ کہہ رہی تھیں۔ "تمہاری نگاہ میں ٹھیک ہے تو پھر چلو ——"

امی کی آواز پر شہزاد چونکا —— سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے اس نے جلدی سے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

○

ابا میاں ہی کے وسیع و عریض دفتر میں سے ایک چھوٹا سا کمرہ لے کر انہوں نے ایک میز دو کرسیاں اس میں رکھتے ہوئے اپنے ادارے کی بنیاد ڈال لی تھی، دل میں کچھ کرنے کا حوصلہ اور دوسروں کے کام آنے کی امنگ تھی اور رگوں میں جوانی کا گرم خون دوڑ رہا تھا —— عقل، محنت، ہمت اور بلند عزائم نے بہت جلد ان کے ادارے کو شہرت کی بلندیوں پہ لا کھڑا کیا۔

بہت سارے لوگ ان کے پاس اپنی اپنی الجھنیں، پریشانیاں اور مسائل لے کر آنے لگے، نہ صرف دیہاتوں سے ہی بلکہ شہر میں بھی ایسے ضرورت مند بہت تھے، کسی کو کاروباری مشورے کی ضرورت تھی تو کسی کو خاندانی اور گھریلو تنازعات کا پُرامن حل چاہیئے تھا۔

ادارے میں اب اور بھی بہت سارے لوگ شامل ہو چکے تھے، ادارے کا اب اپنا ایک سرمایہ بھی تھا، شہر کے بہت سارے مخیر حضرات چندہ دیتے تھے، پھر اسی میں سے بہت سارے ایسے حاجتمندوں کی ضروریات بھی پوری کی جاتی تھیں جن کی سب سے بڑی اُلجھن یا پریشانی معاشی حالات ہوتے تھے۔

یا پھر مالی بدحالی، مالی ضروریات ——— !!

جب اس میدان میں وہ اترے تو انہیں اندازہ ہوا کہ اس دنیا میں بسنے والے لوگوں کو کس کس قسم کے دُکھ اور پریشانیاں تھیں اور کیسے کیسے مصائب سے انہیں دوچار ہونا پڑتا تھا، ورنہ وہ تو اب تک زندگی کو اک بے حد سہانا اور رنگین خواب ہی سمجھتے تھے۔

اچھے سے اچھا کھانا پینا ——— قیمتی سے قیمتی پہننا اوڑھنا گرمیوں میں ٹھنڈے اور سردیوں میں گرم ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر گھنٹوں لطیفے بازی کرنا ——— گرما گرم چائے یا کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے گپیں لڑانا ——— پھر یہ لمبی سی گاڑی میں بیٹھ کر گھومنے نکل جانا ——— پکنکیں منانا ——— فلمیں دیکھنا ——— اور ——— فراغت کی، فرصت کی، سب سے بڑی عیاشی بھی انہیں میسر تھی ——— ایک دوسرے کی محبت، اعتماد، خلوص اور وفا ——— !!!

زندگی خوشبودار اور نرم و نازک پتیوں والے پھولوں کی اک سیج تھی، اِن کے لئے ——— لیکن نہیں ——— سب کے لئے نہیں ——— انہیں تو اب ہی معلوم ہوا کہ کسی کے لئے زندگی پھولوں کی سیج سے زیادہ کانٹوں کی باڑھ بھی تھی، تب وہ اسی باڑھ کو کاٹ کاٹ کر دوسروں کے راستے ہموار کرنے لگے ——— ان کانٹوں سے ان کے ہاتھ زخمی بھی ہوئے مگر وہ ہنس ہنس کر ان کی ٹیسیں سہتے رہے ———

خدا بخش کی بہو ریشماں والا معاملہ سب سے زیادہ ٹیڑھا ثابت ہوا ——— اس کے بتانے پر وہ ریشماں کی بے حد گہری اور واحد سہیلی نذیراں سے ملے، ایک بار نہیں کئی بار ملے ——— ریشماں کے سسرال نہ جانے کی وجہ کیا تھی ——— ؟

”بی بی! میں جانتی تو سب کچھ ہوں مگر ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ریشماں میری بچپن کی سہیلی ہے

اگر اس کا راز میں کھولتی ہوں تو ہماری دوستی کا منہ کالا ہوتا ہے، ہم دیہاتی لوگ بی بی! اک سہیلی یا دوست کے لئے جان تو دے سکتے ہیں مگر راز نہیں ——— “ چٹانوں ایسے سخت اصولوں والی جاہل اَن پڑھ نذیراں پر صنم کی منت سماجت کا بھی کوئی اثر نہ ہوا ——— مایوس ہو کر وہ ناکام اس کے گھر سے نکل آئے۔

چند قدم ہی چلے تھے کہ ——— جانے وہ کون تھی ——— دو بچوں کو روتے بلبلاتے بچوں کو مار مار کر گھسیٹ گھسیٹ کر کہیں لے جانے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ دو قدم آگے چلتے تھے تو ایک قدم پھر پیچھے ہٹ جاتے تھے، وہ خود بھی رو رہی تھی ——— جیسے بڑی مشکل یا کسی بڑی تکلیف میں مبتلا تھی، کسی کے ذاتی معاملات میں دخل نہ دینے والا اصول فراموش کرتے ہوئے صنم نے جا کر اس کا بازو تھام ہی لیا ———

اسی گاؤں میں رہنے والی وہ عورت رحیماں تھی، روتے ہوئے اس نے اپنا دکھ اسے کہہ سنایا ——— وہ دونوں بچے، جو اب سہم کر ایک دوسرے کا بازو مضبوطی سے تھامے چپ چاپ کھڑے تھے، وہ نابینا تھے رحیماں کے یہ دونوں بچے پیدائشی نابینا تھے، اپنی بیوگی تو وہ محنت مزدوری کر کے کاٹے جا رہی تھی مگر ان نابینا بچوں کے مستقبل کا غم اسے چین نہیں لینے دے رہا تھا ——— لڑکا دس سال کا اور لڑکی آٹھ سال کی ہو چلی تھی، جس تیزی سے دونوں کی جوانی سروں پر آ رہی تھی اسی تیزی سے ماں کا کمزور بڑھاپا ——— اور رحیماں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان معذوروں کے لئے کیا کرے جو ان کی زندگی سکھ سے گذر جائے، خود اس کی اپنی زندگی کا کیا اعتبار تھا، ایسا نہ ہو وہ نہ رہے تو ان بیچارے اندھوں کے لئے صرف ٹھوکریں ہی رہ جائیں ——— اس مسئلے کے متعلق اس نے کئی دن، کئی مہینے اور کئی سال سوچا تھا ——— مگر کوئی حل اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔

ان کے گاؤں سے دو کوس کے فاصلے پر گداگروں کا ایک ڈیرہ تھا ——— بیوگی کی مفلس اور بے سہارا زندگی بھی اس نے عزت اور خودداری سے کاٹنے کی کوشش کی تھی، کئی کئی راتیں وہ فاقے سے سوئی تھی مگر اس نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا کبھی گوارا نہیں کیا تھا ——— اور ——— آج ان بچوں کی خاطر وہ مجبور ہو گئی تھی، ان کا مستقبل بنانے کے لئے آخر اس کے قدم اس ڈیرے کی طرف اُٹھ ہی گئے۔

اِن گداگروں کو لوگوں کے دلوں میں رحم اور ہمدردی اور ترس کا جذبہ بیدار کر کے زیادہ کچھ حاصل کرنے کے لئے کیا کیا نہ ڈھونگ رچانا پڑتے تھے، کبھی مفلوج بنتے، کبھی معذور و اپاہج، کبھی اندھے اور کبھی گونگے بہرے ——— یوں خود ساختہ ڈھونگ میں کبھی کبھار کوئی غلطی بھی رہ جاتی، کوئی بھول بھی ہو جاتی مگر

رحیماں کے بچے تو سچ مچ ہی نابینا تھے، اک ڈھونگ نہیں حقیقت ـــ انہوں نے رحیماں سے کئی بار مل کر انہیں اپنے ساتھ کام پر لگانے کے لئے کہا تھا۔ اس کی فاقوں زدہ زندگی سے اسے ڈرا دھمکا کر ان کی پوری زندگی کے لئے پیٹ بھر کر روٹی، لباس اور رہائش کی ضمانت دی تھی، مگر وہ مانی نہیں تھی، کوئی لالچ بھی اس کی خودداری اور غیرت کو پسپا نہیں کر سکا تھا۔

اور ـــ وہ بیمار پڑ گئی ـــ پورا ایک ہفتہ بستر پر پڑی بخار سے پھنکتی رہی، اسے اپنا ہوش نہ تھا، ما بچوں کا کیسے رہتا ـــ اور اس کے علاوہ دونوں نابینا بچوں کا پرسان حال کوئی نہ تھا وہ خود معذور اور بے بس ـــ ان دنوں میں ان کا اگر ساتھ دیا تو صرف فاقوں نے ـــ چند دن لوٹ پوٹ کر رحیماں نے ذرا ہوش سنبھالا تو بچوں کا حال دیکھ کر تڑپ اٹھی ـــ اک ماں تھی یہ سب برداشت نہ کر سکی ـــ

گداگری ہی سہی ـــ کم از کم اس کے بچے بھوک کے مارے تو نہ جان سے جائیں گے، بھیک سے ہی سہی ـــ ساری زندگی انہیں پیٹ بھر کر روٹی، لباس اور رہائش تو ملتی رہے گی ـــ ان کے مستقبل کا فکر تو اس کا دُور ہو جائے گا۔

اور اب ـــ وہ خود گرتی پڑتی انہیں گھسیٹ گھساٹ وہیں لئے جا رہی تھی ـــ دونوں فاقہ زدہ بچے سہمے ہوئے تھے ـــ جانے سے انکار کر رہے تھے کہ نجانے ماں انہیں کہاں لئے جا رہی تھی ـــ اس کی چیخوں آہوں اور سسکیوں نے انہیں کچھ ایسا ہی احساس دلا دیا تھا کہ وہ اک قدم آگے نہیں بڑھا رہے تھے ـــ رو رہے تھے اور بلبلا رہے تھے۔

نابینا بچوں کا مستقبل صرف گداگری کی صورت میں ہی تو محفوظ نہیں ہو سکتا تھا۔ اور بھی کئی راستے تھے جن پر انہیں چلایا جاتا تو وہ اک باعزت زندگی گزارنے کے قابل ہو جاتے، مگر وہ تعلیم سے بے بہرہ، ناسمجھ اور سیدھی سادی عورت نہیں جانتی تھی ـــ آج تک اسے کسی نے ایسا کوئی راستہ دکھایا سوجھایا ہی نہ تھا، سوائے ان گداگروں کے ـــ اور آخر وہ اسی پر چل پڑی تھی۔

آتم اور صنم اسے اور بچوں کو واپس اس کے گھر لے گئے ـــ اسی وقت ان کے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کیا گیا، جب ان کے پیٹ میں روٹی پہنچی، عقل ہوش ٹھکانے پر آئے تو آتم اور صنم نے اسے سمجھایا بجھایا اس گاؤں کے قریب ہی شہر میں ایسے ادارے تھے جہاں نابیناؤں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ بہت سارے ہنر بھی

سکھائے جاتے تھے تاکہ ایسے معذور بھی معاشرے میں اک باعزت مقام پا سکیں، وہاں سے ہنر سیکھ کر وہ اک اچھے ذریعۂ معاش کے ساتھ باوقار زندگی گزار سکیں۔

غیرت مند اور خوددار رحیماں فوراً راضی ہو گئی ـــ تب اگلے ہی دن بچوں کو وہاں داخل کرا دیا گیا، رحیماں بہت خوش تھی ـــ جھولیاں پھیلا پھیلا کر آتم اور صنم کو دعائیں دے رہی تھی

بچوں کا فکر دُور ہوا تو رحیماں کو اپنی پڑوسن زینب کا خیال آگیا ـــ اس کا مفلوج شوہر کسی کام کاج کے قابل نہ تھا ـــ رحیماں تو گھر گھر جا کر محنت مزدوری کر لیتی تھی، مگر زینب کا خاندان چونکہ عزت دار مانا جاتا تھا اس لئے اس کا شوہر کسی ایسے مقصد کی خاطر اسے گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا، یوں دونوں میاں بیوی چپ چاپ کئی کئی دن فاقے سے گذار لیتے۔

کبھی کبھار جو دو نوالے روٹی مل جاتی تھی تو وہ بھی رحیماں ہی کے دم قدم سے ـــ وہ گھروں میں پھر پھرا کر لوگوں کی منت سماجت کر کے لحاف اور تو شکیں وغیرہ سینے کا کام زینب کو لا دیتی، یا پھر کسی گھر میں شادی ہوتی تو گوٹے ستارے کا کام مل جاتا۔

مگر یہ دونوں کام اتنا نہیں دیتے تھے کہ دونوں کی حیات کی شمعیں بڑی آسانی سے روشن رکھی جا سکتیں فاقوں کی آندھیاں انہیں بجھا ڈالنے کی اپنی سی پوری پوری کوشش کر رہی تھیں، چھ مہینے گرمی کے نکل جاتے لحاف وغیرہ کا کام کوئی نہ ملتا ـــ اور گاؤں میں شادیاں بھی تو روز روز نہیں ہوتی تھیں ـــ یوں ان کی زندگی تو رحیماں سے بھی زیادہ مجبور تھی۔

سب کچھ بتانے کے بعد رحیماں نے صنم کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے کہ وہ لوگ زینب اور اس کے شوہر کے لئے ضرور کچھ کریں، تب صنم خود اس کے گھر گئی ـــ باتوں باتوں میں اسے معلوم ہوا کہ وہ کپڑوں کی سلائی بڑی اچھی کر لیتی تھی مگر اس کے پاس مشین نہیں تھی اور آج کے مشینی دور میں ہاتھ کا سیا نہ کوئی پسند کرتا تھا اور نہ اب وقت اس کا متحمل تھا ـــ زندگی کی رفتار میں اتنی تیزی آگئی تھی کہ ہاتھ والی سوئی کے ساتھ اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اگلے ہی دن ادارے کے کھاتے میں سے جب زینب کے لئے کپڑے سینے والی اک مشین خرید کر آتم اور صنم لے آئے تو رحیماں نے اسی وقت گھر گھر پھر کر بہت ساری سلائی بھی اکٹھی کر دی، عجیب سی خوشی و مسرت دونوں کے چہروں پر تھی ـــ اور پاس بیٹھا زینب کا شوہر کبھی بڑے دکھ سے اپنے مفلوج ہاتھ پاؤں

کو دیکھ رہا تھا اور کبھی خوشی سے اپنی بیوی کی طرف جس نے مشین لے کر کپڑے سینے کا افتتاح بھی کر دیا تھا اور کبھی بے حد متشکرانہ نگاہوں سے صنم اور آثم کی طرف ــــ وہی تو ان فاقوں سے انہیں نجات دلا کر عزت کی بدولت کا سامان کرنے والے تھے ــــ کتنے اچھے تھے وہ ــــ جو ان کے دکھوں کو محسوس کر کے دکھی ہو گئے تھے ــــ تڑپ اٹھے تھے اور اب ان کی خوشیوں کو اپنے اندر محسوس کر کے مسکرا رہے تھے، بڑے خوب صورت انداز میں ــــ!

آن کی آن میں جلنے یہ خبر سارے محلے میں کس نے مشہور کر دی ــــ شاید رحیماں نے ــــ ارد گرد رہنے بسنے والی بہت سی عورتیں زینب کی چم چم چمکتی نئی مشین دیکھنے آ گئیں ــــ اسے سب مبارک بھی دے رہی تھیں ــــ وہ صنم اور آثم کی طرف دیکھتے ہوئے اک اک کی مبارک باد کا شکریہ ادا کر رہی تھی کہ ــــ

"بھا ٹیا جی ــــ!" ان عورتوں میں سے ایک عورت آ کر آثم کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی ــــ "میرا ایک کام ہے بھا ٹیا جی!" وہ جھجک جھجک کر دبی دبی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ــــ

"کہو بی بی!" آثم کے لہجے میں نئے حوصلے اور عزم کی پختگی تھی ــــ

"لیکن بھا ٹیا جی! میرے سائیں کو اس بات کا علم نہ ہو کہ میں نے کوئی بات آپ سے کی ہے ــــ وہ بڑا غصے والا ہے۔ مجھے جان سے مار ڈالے گا ــــ"

"نہیں نہیں ــــ تم بے تکلف کہو ــــ اسی مان اور اعتماد سے جیسے کوئی بہن بھائی سے اپنا حق طلب کرے"

"خدا آپ کو خوش رکھے ــــ بات یہ ہے" پھر اس نے ارد گرد دیکھا۔ جیسے ڈر رہی تھی کوئی اور بھی نہ سن لے یا آثم کے ساتھ بات کرتے ہوئے دیکھ لے، سب عورتیں زینب کی مشین پہ جھکی ہوئی تھیں اور اس سے جانے کیا کیا سوال کئے جا رہی تھیں۔ ان کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں تھا، اطمینان کا سانس لیتے ہوئے وہ کہنے لگی "پچھلی کئی نسلوں سے ہمارے خاندان کی ساتھ والے گاؤں کے ایک بہت بڑے زمیندار کے ساتھ دشمنی چلی آ رہی ہے۔ ہر سال دو سال بعد ایک خون ادھر ہو جاتا ہے اور پھر ادھر والوں کو موقع ملتا ہے تو وہ اپنا بدلہ ہمارے خاندان کے کسی مرد کا خون کر کے اتار لیتے ہیں ــــ یوں جانے کتنے بے گناہ اب تک قتل ہو چکے ہیں ــــ

میرا سائیں چار بھائی تھے ــــ مگر اب وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ انہیں دشمنوں نے باقی تین کی جانیں لے لیں مجھے اپنے سائیں کا تو خیال نہیں ــــ"

"کیا ــــ؟" آثم نے حیرت سے اس عورت کی طرف دیکھا

"ہاں بھا ٹیا جی! اگر ہمارے ہاں کوئی عورت مرد کو بدلہ لینے سے باز رکھے تو بے غیرت سمجھی جاتی ہے ــــ مگر" پھر وہ رونے لگی ــــ "میرے سائیں کے سب بھائیوں کی لڑکیاں ہی ہیں ــــ صرف میرا ایک بیٹا ہے ــــ اتنی ڈھیر ساری بہنوں کی عزتوں کا صرف ایک رکھوالا، پچھلے سال میرا ایک دیور مار ڈالا گیا ــــ اور اب میرا سائیں اس بھائی کا بدلہ لینے کے درپے ہے ــــ وہ ان کے کسی آدمی کو موقع ملتے ہی مار ڈالے گا تو پھر کہیں میرے بیٹے کا نام نہ آ جائے ــــ میری تو اور اولاد بھی کوئی نہیں ــــ میری کوکھ بالکل ہی اجڑ جائے گی ــــ" وہ اب سسکیاں لے رہی تھی ــــ

"اور میرا سائیں بدلہ لینے پر تلا ہوا ہے ــــ میری سب بیوہ دیورانیاں اور جیٹھانیاں، حتیٰ کہ وہ دیورانی بھی جس کا سائیں ابھی پچھلے دنوں ہی قتل ہوا ہے، وہ بھی یہ قصہ اب یہیں ختم کر دینا چاہتی ہے، ان کی لڑکیوں کو بھائی سے بڑا پیار ہے، یوں بھی پھر ہمارے خاندان میں کوئی مرد باقی نہیں رہے گا ــــ اور میرا سائیں بدلے کے لئے ایسا بے قرار ہے کہ اسے کچھ اور سوجھائی نہیں دے رہا ــــ یہ بھی نہیں کہ ان کے ہاں تو بہت مرد ہیں بہت ــــ اور ہماری نسل بھی نہ آگے چلے گی ــــ جوان جوان لڑکیاں اور بیوائیں باقی رہ گئیں تو ان کی عزتوں کا محافظ کون ہو گا ــــ؟"

"تم فکر نہ کرو بہن! میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا ــــ اپنی پوری کوشش ــــ"

"مشکل ہے بھا ٹیا جی! اس معاملے میں وہ کسی کی کچھ نہیں سنتا ــــ" اس عورت کی سسکیاں کچھ اور تیز ہو گئیں۔

چند لمحے آثم نے کچھ سوچا پھر کہنے لگا، "اگر وہ لوگ جن سے تمہارا مرد بدلہ لینا چاہتا ہے، وہ آ کر معافی مانگیں اور صلح کر لیں تو ــــ؟"

"ہاں ــــ" اس عورت کی سسکیاں یکا یک تھم گئیں ــــ "پھر شاید بات بن جائے۔ معافی مانگنے والے کو وہ بڑی جلدی معاف کر دیا کرتا ہے۔"

"تب تم مجھے ان لوگوں کے نام اور گاؤں کا پتہ وغیرہ بتا دو ــــ ہم ادھر سے کوشش کریں گے۔"

وہ عورت ڈھیروں ڈھیر دعائیں دیتے ہوئے ان کے نام، ذات، اور گاؤں کہاں واقع تھا، سب کچھ تفصیل سے بتانے لگی ــــ صنم بھی پاس بیٹھی سن رہی تھی۔

"بی بی! شہر والی بی بی جی! ایک بات سنئے گا۔" کندھے پر کسی ہاتھ کے ہلکے سے لمس کے ساتھ شہر والی

بی بی کہہ کے اسے مخاطب کیا گیا تو چونکتے ہوئے صنم مڑ کر پیچھے دیکھنے لگی ـــــ مخاطب کرنے والی نذیراں تھی۔ جس مقصد کی خاطر وہ اس گاؤں میں آئے تھے وہ تو اس نذیراں کی جھوٹی یا سچی اصول پرستی نے پورا نہیں ہونے دیا تھا، اب جانے کیا کہہ رہی تھی ـــــ؟ وہ قدرے بے دلی سے اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی، سب عورتیں مشین کی طرف سے نگاہیں ہٹا کر ایسے ہی سر سے پاؤں تک بغور دیکھنے لگیں، ان کے قریب سے گزریں تو کئی آوازیں ان کے کانوں سے ٹکرائیں ـــــ کوئی صنم کے حسن سے متاثر ہو کر تعریفی فقرے کہہ رہی تھی تو کسی کی نگاہوں میں اس کی مستانہ چال کھب کر رہ گئی تھی ـــــ ایک اس کے خوب صورت اور متناسب جسم اور اس پر سجنے والے لباس کے متعلق رطب اللسان تھی ـــــ نذیراں نے مسکرا کر صنم کی طرف دیکھا ـــــ وہ بڑی پیاری سی ادا کے ساتھ شرماتے ہوئے جلدی سے گویا ہوئی ـــــ

"ہمیں بڑی دور جانا ہے، جو کہنا ہے جلدی کہو ـــــ"

"میں بی بی! آپ سے معافی مانگنے آئی تھی"

"معافی ـــــ؟ کس بات کی ـــــ؟ تم نے تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑا ـــــ؟"

"وہ ـــــ میں نے آپ کو ریشماں کے متعلق کچھ نہیں بتایا نا ـــــ اس بے اعتباری کی ـــــ میں شرمندہ ہوں ـــــ"

"نہیں نہیں نذیراں! یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے، ہمیں کوئی غصہ یا گلہ نہیں۔"

نذیراں صنم کا ہاتھ تھام کر ہولے سے دباتے ہوئے بولی۔ "مجھے تو لگتا ہے بی بی! آپ لوگ فرشتے ہیں جو ہمارے گاؤں کی دھرتی پر ہمارے دُکھ درد کاٹنے کے لئے آئے ہیں، میری سہیلی ریشماں کا گھر بھی اگر اسی طرح بس جائے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔" تب اس نے اپنے گھر صنم کو لے جا کر علیحدگی میں بڑی رازداری سے سب کچھ بتا دیا۔

گاؤں کے بڑے چودھری کے بیٹے جمیل کے ساتھ ریشماں کی دوستی ہے ـــــ کیونکہ وٹے کا رشتہ تھا، ریشماں انکار نہ کر سکی، اس وقت سسرال چلی گئی اور اب"۔ وہ چپ سی ہو گئی ـــــ

"اب کیا ـــــ؟"

"اب بھی وہ جمیل ریشماں سے ملتا ہے۔ روز آدھی رات کو ـــــ وہ ادھر گاؤں کے باہر ٹوٹی حویلی کے کھنڈروں میں۔"

"ریشماں کو اپنے باپ کی عزت کا کوئی خیال نہیں ـــــ؟ اپنے بھائی کے گھر اجڑنے کا کوئی دُکھ نہیں ـــــ؟؟"

"عشق کا معاملہ ہے نا بی بی! کہا نا وہ تو شادی کرانی ہی نہیں تھی عین شادی کے دن باپ نے پگڑی پاؤں پر رکھ دی تو وہ ڈولی میں بیٹھ گئی ـــــ"

"اور جمیل کو معلوم نہیں کہ وہ اب اس کی نہیں کسی اور کی ہو چکی ہے ـــــ؟"

"کسی اور کی تو وہ اب بھی نہیں بی بی! جمیل کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اب بھی اسی کی ہے اور ساتھ یہ بھی کہ اس جیسی خوب صورت لڑکی اور کوئی اس پورے گاؤں میں نہیں ہے۔"

"دونوں کا آپس میں ایسا ہی پیار ہے، تو اگر ریشماں اپنے شوہر سے طلاق لے کر اس سے شادی کرے تو"

اس کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی نذیراں زور سے قہقہہ لگا اٹھی

"آپ بھی بی بی! کیسی بھولی باتیں کر رہی ہیں۔ وہ اونچی ذات والے لوگ اور یہ ذات کے ماچھی ـــــ تنور پہ روٹیاں لگانے والے ـــــ ایک نہیں دس طلاقیں ریشماں لے لے ـــــ کتنی ہی جمیل اور اس میں عشق عاشقی ہو، مگر ان کی شادی کبھی نہیں ہو سکتی ـــــ نہ بڑا چودھری اسے کبھی اپنی بہو بنانے پر راضی ہوگا اور نہ ہی جمیل اسے اپنی بیوی، وہ تو صرف اس کی خوبصورتی کے ساتھ وقت گزار رہا ہے۔"

پھر وہ صنم کے قریب ہو کر بہت ہی رازدارانہ انداز میں ہولے سے بولی۔

"ہم نے تو سنا ہے کہ جمیل چودھری شروع سے ہی بڑا آوارہ مزاج ہے ـــــ"

مگر یہ ریشماں مانتی ہی نہیں ـــــ اس کی نگاہ میں تو وہ کوئی دیوتا یا اوتار ہے ـــــ وہ تو سمجھتی ہے کہ جس طرح وہ خود اس کی وفادار ہے، شادی ہو جانے کے بعد اپنے شوہر کو بھی اس نے غیر سمجھتے ہوئے کبھی قریب نہیں آنے دیا، اسی طرح جمیل بھی اس کے سوا کبھی کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔"

"تو تجھے یقین ہے ـــــ؟"

"پورا یقین بی بی! جیسے کسی کو خدا پہ ہو ـــــ کئی بار میں نے خود بھی ریشماں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے مگر وہ کچھ بھی سننے کو تیار نہیں ـــــ"

"اچھا بھئی! شکریہ نذیراں ـــــ تمہارا بہت بہت شکریہ ـــــ! تم نے ہماری بہت مدد کی ہے بہت بڑی پریشانی دور کر دی ہے۔"

"بی بی! ایک بار پھر وعدہ کریں کہ ریشماں کو کبھی یہ نہیں پتہ چلے گا کہ میں نے آپ کو یہ سب بتایا ہے اور خدا گواہ ہے ——— میں نے اپنی سہیلی کے ساتھ بے وفائی نہیں کی، صرف اس کا بھلا چاہا ہے وہ کنویں میں گر رہی تھی ——— میں نے اسے ....."

"ہاں ہاں نذیراں! تم فکر نہ کرو ——— تم سرخرو ہو ——— تم نے اس کے ساتھ برائی نہیں بھلائی کی ہے، ہم گواہ ہیں اور خدا بھی گواہ ہے ———"

اور پھر نذیراں ہی کا وجود اور گھر ان کے بڑے کام آیا ——— وہ نذیراں ہی کی سہیلی بن کر اک خانہ بدوش لڑکی کے روپ میں چوہدریوں کے گھر تک پہنچی، وہیں جمیل نے اسے دیکھا اور واقعی پہلی ہی نگاہ میں ایسا اس پر فریفتہ ہوا کہ وہ چوہدریوں کے گھر سے نکلی تو اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا ——— نذیراں کے محلے تک اس نے اس کا تعاقب کیا ———

ریشماں واقعی اس گاؤں کی سب سے زیادہ خوب صورت لڑکی تھی، مگر صنم کے مقابلے میں وہ بالکل گہنا گئی ——— شہری رہائش والی اجلی اجلی سی اس کی جلد پر یہ خانہ بدوش قسم کی لڑکیوں کا لباس اور بناؤ سنگھار ——— جمیل سے تو ایک رات بھی کاٹنا مشکل ہو گئی ———

آندھی ہو، زلزلہ طوفان ہو ——— باد و باراں ہو ——— مگر کھنڈروں میں ریشماں سے ملنے کا کبھی ناغہ نہیں ہوا تھا اور صنم کو دیکھنے کے بعد پہلی ہی رات اس نے اس اجاڑ حویلی کے بجائے اپنے بستر پر کروٹیں بدل کر کاٹ دی ——— اور ادھر ریشماں نے ساری رات اس حویلی کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں کی آڑ میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے ہوئے ———

اگلے دن وہ نذیراں کے ساتھ کسی بہانے سے پھر چوہدریوں کے گھر گئی، جمیل شاید اس کی راہ دیکھ رہا تھا — نذیراں چوہدرانی کے پاس باتیں کرنے بیٹھ گئی تو جمیل صنم کے پاس آ کھڑا ہوا ——— بڑی پیار برساتی اور مخمور سی نگاہیں اس پر جمائے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں اسے گاؤں کے باہر بے آباد کنویں پر ملنے کی التجا کی ———

اس کا تو جیسے کام دھندا ہی بھولی بھالی لڑکیوں کے ساتھ عشق و عاشقی کرنا تھا، صنم بھی کام جلد نمٹانا چاہتی تھی ——— اپنی کامیابی پر دل ہی دل میں خوش بھی بہت تھی، مگر ریشماں معصوم کے دل کا خیال آتا تو لرز اٹھتی ——— وہ بیچاری تو اس معاملے میں سنجیدہ تھی اور پوری وفادار بھی ———

منجھے ہوئے عاشق نے دوسری تیسری ہی ملاقات میں جب صنم کو اپنے بازوؤں میں لے لینا چاہا تو گاؤں کی روائتی الہڑ دوشیزاؤں کے انداز میں بھڑک کر کئی قدم پرے ہٹتے ہوئے اس نے اک پتھر اٹھا کر اسے دے مارا ——— اور یوں بے دریغ پتھر مارنے میں اس کے دل کے اندر کی کھولن اور غصے کا جذبہ بھی کارفرما تھا ——— بلا سے وہ مر جاتا — کہ ایسے لوگوں کا دنیا سے اٹھ جانا ہی اچھا تھا وہ خدا کی پاک زمین کو یوں ناپاک کرتے پھر رہے تھے ———

"چوہدری! ہم شریف لوگ ہیں ——— زباں سے بات کیا کرو ———"

پیشانی سے بہنے والا خون تو جمیل نے صاف کر لیا مگر صنم کی یہ ادا اسے سینے میں ایسا زخم ایسی کسک دے گئی کہ وہ بسمل اس چوٹ سے تڑپ تڑپ اٹھا ——— اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا ——— "معاف کر دو ———"

"کر دیا ———" صنم کھل کھلا کے ہنس پڑی ———

وہ بالکل ہی گھائل ہو گیا ——— "مجھ سے شادی کرو گی ———؟"

"تو چوہدری اور ہم گاؤں گاؤں پھر کر روزی تلاش کرنے والے، تیرا میرا کیا جوڑ چوہدری!"

"مجھے تم سے پیار ہے ——— میں تمہارے بغیر جی نہیں سکوں گا ———"

"تو اپنی اماں باوا سے بات کرناں ——— ہمارے میں لڑکیاں شادی کے معاملات خود طے نہیں کیا کرتیں ———"

صنم کے اس روپ ایسی اداؤں نے کچھ ایسا اس پر جادو کیا کہ اسی شام اس نے اپنی ماں کو اپنے ارادے سے باخبر کر دیا ——— نہ ماں مانتی تھی نہ باپ ——— آخر ان کی بھی کوئی عزت تھی، کوئی وقار تھا۔ برادری میں کوئی مقام تھا ——— جمیل تو یکایک ان کی ناک کے درپے ہو گیا تھا ——— اور وہ لڑکیوں والے تھے ———

سب نے اسے سمجھایا ——— اونچ نیچ دکھائی ——— مگر اس پر کسی کی بات یا نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا ——— اس نے ماں باپ کو صاف کہہ دیا کہ اگر وہ نہ مانے تو وہ خود شادی کرے گا، وہ گھر چھوڑ دے گا ——— ماں باپ، بہن بھائی چھوڑ دے گا، مگر شادی اسی لڑکی کے ساتھ کرے گا ———

جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی ——— اک اک گھر میں انہیں کی باتیں ہونے

بگیں —— پچھلے کئی دن سے ریشماں اپنی محبت کو بہلاوے دے رہی تھی، جمیل اسے ملنے اس ویران حویلی میں نہیں پہنچا تھا، خدا خیر کرے، کہیں بیمار ویمار تو نہیں تھا، وہ انہیں وسوسوں میں گھلی جا رہی تھی کہ یکایک اس نے اس کی شادی کی بات سن لی ——

سارا معاملہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا —— اس نے تو اس کی خاطر نہ صرف اپنا شوہر چھوڑا ہوا تھا بلکہ اپنے بھائی اور بھاوج کی محبت اور گھر اجڑنے کی بھی اس نے پرواہ تک نہ کی تھی —— اور جمیل اس کی ان وفاؤں کے بدلے میں کسی دوسری لڑکی کی خاطر ماں باپ سے بغاوت کرنے پر آمادہ تھا، خود ریشماں کی خاطر تو آج تک اس نے ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا تھا —— آخر یہ سب کیا تھا ؟ کیا جمیل کو اس کے ساتھ محبت نہیں تھی —— ؟ اس نے اس کی جوانی اور خوب صورتی کو صرف دل بہلاوا ہی بنایا ہوا تھا —— ؟ او! یہ کیا ہو گیا —— ؟

کئی دن وہ اجاڑ صورت اور ویران دل لئے اپنی کوٹھڑی میں کھاٹ پہ پڑی رہی اور سوچتی رہی کبھی جمیل کی بے وفائی اسے خون کے آنسو رلاتی تو کبھی حسد اور جلن کے جذبے اسے جلا جلا ڈالتے، پھر ایک دن اس نے چپکے سے نذیراں کو اپنی کوٹھڑی میں بلایا

”نذیراں! میرے بابا سے کہہ دے کہ میری بھابی گھر میں لے آئے —— تاکہ میرے بھائی کا گھر آباد ہو جائے —— “

”لیکن ریشماں! جب تک تم اپنے سسرال جانے پر راضی نہ ہو گی تمہاری بھابی کس طرح اس گھر میں آئے گی —— ؟“

”میں جاؤں گی نذیراں! میں اپنے سسرال جاؤں گی —— “ وہ نذیراں کے گلے لگ کر رو دی

”میں بے وقوف تھی، غلط راستوں پر چل رہی تھی ——“

”ریشماں! یہ تم کہہ رہی ہو —— ؟“

”ہاں نذیراں! جا بابا سے کہہ دے کہ وہاں پیغام بھجوا دے —— جلد از جلد —— میں چاہتی ہوں جمیل کی شادی سے پہلے پہلے میں اپنے سسرال چلی جاؤں —— “

خوشی کی زیادتی سے نذیراں نے بے قابو ہوتے ہوئے ریشماں کو گلے سے لگا لیا ——

اسی رات ان کے گھر میں ڈھولک کی تھاپ گونج اٹھی —— پورے دو سال کی خانہ خرابی کے بعد ریشماں

کی بھابی گھر میں آنے والی تھی اور پھر اس سے اگلے دن خود ریشماں رخصت ہونے والی تھی ——

اس گاؤں میں خوشی کی دو تقریبات اوپر تلے دو دنوں میں منائی گئیں —— دونوں میں ہی آثم اور صنم شریک تھے، کل ان لوگوں کے ہاں دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور سارا گاؤں مدعو تھا جن کی خاندانی دشمنی جو سالہا سال سے چلی آ رہی تھی اور جس میں کئی جانیں بھی کام آ گئی تھیں، ان کی صلح ہو گئی تھی دونوں ہی طرف والے بہت خوش تھے —— اور برسوں سے دونوں فریقین کی یہ دلی خواہش تھی کہ کسی طرح یہ معاملہ ختم ہو —— اکلوتے بیٹے کی ماں چچیاں تائیاں اور ان کی بیٹیاں صنم کا بار بار شکریہ ادا کرتی تھیں اور ہر دم سر پر لٹکی رہنے والی اس پھانسی سے نجات پانے پر بے حد خوش بھی تھیں —— بہت سارے سر دے کر اس خاندان کی یہ آخری نشانی انہوں نے دشمنوں کو معاف کر کے بچائی تھی —— سبھی بہت خوش تھے —— !!

اور آج —— ریشماں کے گھر میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ اس کی بھابی دو دن پہلے ہی اپنے گھر آ چکی تھی اور آج خدا بخش، ریشماں کا سسر اپنی پوری برادری کے ساتھ اپنی بہو کو رخصت کرا کے لے جانے کے لئے آیا تھا۔

صنم اور آثم اپنے اصلی حلیوں میں اس گھر کی اس تقریب اور گہما گہمی میں موجود تھے ان کے چہرے دمک رہے تھے، دو سال سے یہ معاملہ لٹک رہا تھا، اب نجانے کیا ہو گیا، یکایک کیسے سلجھ گیا —— ؟ سب کو خوشی بھی تھی، مگر ہر دل میں یہ سوال سر بھی اٹھا رہا تھا —— لیکن زبان پہ لانے سے ہر کوئی گریز کر رہا تھا —— خدا بخش کو البتہ آم کھانے سے مطلب تھا پیڑ گننے سے نہیں —— اس نے اک بار بھی آثم اور صنم سے کچھ نہیں پوچھا —— خوشی کے مارے اپنی بوڑھی آنکھوں سے بہنے والے آنسو پونچھ پونچھ کر بس انہیں دعائیں ہی دیئے جا رہا تھا۔

تقریب ابھی ختم نہیں ہوئی تھی —— کھانے کے بعد گانے وغیرہ کا پروگرام تھا —— لیکن صنم اور آثم کو بہت دور جانا تھا —— آثم تو بڑے شوق سے مردانے میں بیٹھا بھانڈوں اور میراثیوں کے لطیفوں میں ڈوبا قہقہوں پہ قہقہے لگا رہا تھا، مگر مشکل صنم کے لئے تھی جو ایک کنواری لڑکی تھی —— اور شام گہری ہو رہی تھی —— !

آج اس نے سفید شلوار اور کرتہ پہنا ہوا تھا —— سفید دوپٹہ بڑی اچھی طرح سر اور کندھوں پہ لپیٹا

ہوا تھا ـــــ سوائے نذیراں کے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہی وہ چودھری جمیل کی پسند کی خانہ بدوش لڑکی تھی ـــ زیادہ دیر ہوئی تو وہ گھبرا کر باہر مردانے میں نکل آئی ـــــ چودھریوں کا خاندان بھی مدعو تھا ـــــ انہیں کے ساتھ ایک علیحدہ اور صاف ستھرے بستر والے پلنگ پر آثم تشریف فرما تھا۔ اسے ڈھونڈتے ہوئے صنم وہیں جا پہنچی ـــــ

"آثی! اب چلو بڑی دیر ہو گئی ـــــ میری تو پٹائی ہو جائے گی ـــ"

ساتھ ہی اس کی نگاہ آثم کے پہلو میں بیٹھے جمیل پر جا پڑی ـــ وہ بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ـــ صنم کا اشارہ پاتے ہی آثم جلدی سے کھڑا ہو گیا ـــــ

"اچھا چودھری صاحب! پھر ملاقات ہو گی ـــ"

"ضرور ضرور ـــــ" جمیل نے صنم ہی کو گھورتے ہوئے آثم سے ہاتھ ملایا پھر اس کی طرف جھک کر سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگا ـــ "میرا کام ضرور کیجئے گا ـــ"

"بہتر ـــــ" سب کو مل ملا کر آثم اور صنم پنڈال سے باہر نکل آئے ـــــ

"وہ جمیل تمہیں کس کام کی تاکید کر رہا تھا ـــ؟" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے صنم نے پوچھا ـــــ

"وہ کہتا تھا کہ چونکہ میری زبان میں بہت اثر ہے، ہر کسی کا معاملہ سلجھ جاتا ہے، اسلئے اس خانہ بدوش لڑکی سے شادی کی بات میں اس کے باپ کے ساتھ کر لوں۔ اسے سمجھاؤں کہ دل کا معاملہ ہے وہ گھر بار چھوڑ گیا تو تب بھی ان کی بے عزتی ہو گی ـــ خود اپنے ہاتھ سے ہی اس کی شادی کر دیں اسے پورا یقین ہے کہ میرے سمجھانے سے اس کا باپ سمجھ جائے گا ـــ"

"گھٹیا ـــ ذلیل ـــ" صنم نفرت سے بڑبڑائی ـــــ

"بھئی دل کا معاملہ ہے نا اور دل ایسی خانہ خراب چیز ہے کہ اس پر کسی کا بس بھی نہیں چلتا لہٰذا اب میں نے چودھری جمیل کا کیس ہاتھ میں لیا ہے ـــ" آثم نے کنکھیوں سے صنم کو دیکھتے ہوئے گاڑی کا موڑ کاٹا ـــــ

"ہاں ـــــ اللہ کرے یہ معاملہ بھی سدھر ہی جائے ـــ" صنم کے چہرے پر سنجیدگی تھی

"کیا ـــ؟" آثم نے کھا جانے والے انداز میں اسے گھورا ـــــ

"لگتا ہے اس خانہ بدوش لڑکی بیچاری کو بھی تو اس سے کچھ کچھ ہو گئی ہے ـــ" وہ اسی سنجیدگی

کے ساتھ بولی ـــــ

"کیا ہو گئی ہے ـــ؟" آثم نے گاڑی چلاتے چلاتے ہی یکلخت اس کے بال مٹھی میں جکڑ لئے۔

"محبت ـــ" صنم اپنے بال چھڑانے کے لئے کسمسائی "جسے دنیا نفرت کہتی ہے ـــ"

"اوہ ـــــ!" آثم نے جلدی سے اس کے بال چھوڑ دیئے "میں سمجھا تھا شاید کچھ اور کہنے لگی ہو ـــــ" پھر وہ بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا ـــــ

"مجھے بھی تو ابھی گھر جا کر ایک نیاز دینی ہے ـــ"

"نیاز دینی ہے ـــ؟ وہ کیوں ـــ؟"

"یہ معاملہ خیر خیریت کے ساتھ نمٹ گیا ہے ـ" پھر آثم سنجیدگی سے بولا ـــــ کچھ نہ پوچھو آج مجھے کس کس طرح اپنا غصہ ضبط کرنا پڑا ـــ ورنہ جمیل کے بچے کے منہ میں آج دانت کوئی نہ ہوتا ـــ"

"کیوں ـــ؟ کیا کیا اس بیچارے نے ـــ؟"

"اپنے عشق کی داستان مجھے سنائے جا رہا تھا ـــ"

"لو ـــ تو اس میں غصہ کرنے کی کیا بات ہے ـــ؟"

"بڑے چٹخارے لے لے کر تمہارے حسن کے متعلق قصیدہ گوئی کر رہا تھا۔ اور اس کے منہ سے نکلنے والے ہر فقرے کے بعد میرا جی چاہتا تھا اب ہی ایک مکہ مار کر اس کا جبڑا ہلا دوں، اب ہی ایک گھونسہ لگا کر اس کی بتیسی باہر نکال دوں ـــ"

"تم یوں کرنے لگے تو کر چکے خدا کی خلق کی خدمت ـــــ!"

"صاف کہہ دوں ـــــ اب ایسی کسی کی کوئی خدمت کرنے کو میں قطعی تیار نہیں ـــ اور بھی تو کئی معاملات ہم لوگوں نے سلجھائے ہیں ـــ مگر یہ ـــ توبہ توبہ ـــــ!"

"کیوں ـــ؟" صنم زور سے ہنس دی ـــــ

"جتنی دیر وہ تم سے عشق بگھارتا رہتا تھا صاف ظاہر ہے میں تم سے دور کہیں جا نہیں سکتا تھا ـــ آس پاس ہی کہیں چھپا ہوتا تھا۔ دل میں اک دھڑکا یہ کہ دیکھ نہ لیا جاؤں ـــ دوسرا اس کی باتیں سن سن کر بری طرح خون کھولتا رہتا تھا، ہر لمحہ یہی جی چاہتا اب نکلوں اور اسے گریبان سے پکڑ لوں ـــ یا پھر اگلی بار

مسلح ہو کر آؤں اور اِک گولی سے ہی اس کا کام تمام کر دوں —

صنم ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی تھی اور آثم ساتھ گاڑی چلا رہا تھا اور ساتھ ساتھ گھولنوں اور ڈزن گولی کا عملی طریقہ بھی بتا رہا تھا — یوں گھر پہنچنے تک وہ اسی کی باتیں کرتے رہے کہ اب باقی ساری زندگی وہ مجنوں بن کر جسم پر چیتھڑے لٹکا گلی گلی بازار بازار اپنی خانہ بدوش لیلیٰ کو ڈھونڈتا پھرے گا کیونکہ اس کے کہنے کے مطابق اسے عشقِ حقیقی ہو گیا تھا —

"تم اپنے گھر اترو گی — ؟"

"ہاں — اپنے گھر —" صنم مسکرائی آثم نے گاڑی صنم کے گھر کے آگے روک لی۔

"میرا گھر وہ ہے —" صنم نے آثم کا کان پکڑ کر ذرا سا کھینچ دیا — "جانے تم کب تک مجھے غیر سمجھتے رہو گے —"

"غیر سمجھتا ہوں — ؟" آثم نے دوبارہ گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے تیکھی مگر ڈھیروں ڈھیر پیار برساتی نگاہوں سے اسے دیکھا — "ہر وقت تو بٹوے کی طرح ساتھ لئے پھرتا ہوں —" پھر وہ یکایک مسکرا دیا — "خیال رہے اپنے اس عاشق کی کہانی ابا میاں اور امی بیگم کو نہ سنانے بیٹھ جانا پھر تمہارے ڈیڈی کو بھی پتہ چل جائے گا تو تمہیں آئندہ اجازت نہیں ملے گی اور میں تمہارے بغیر بالکل بیکار ہو جاتا ہوں، کچھ بھی نہیں کر سکتا —"

"کچھ عقل کرو اثمی! ایسی باتیں ابا میاں کو بتاؤں گی — ؟ کیا مجھے شرم نہ آئے گی — ؟"

"کیا پتہ اپنے حسن کی فسوں کاریوں کا اظہار کرنے کے لئے سنانے لگ ہی پڑو —"

"ہائے ہائے! ابا میاں اور امی بیگم کے سامنے ہی مجھے اپنا حسن ظاہر کرنا ہے —"

"ہاں — اس لئے کہ وہ صرف تمہیں ہی اپنی بہو بنائیں —" وہ اپنی مسکراہٹ کو ہونٹوں ہی میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا —

"تمہیں خدا سمجھے اثمی!" قہر ناک، لجا کر صنم نے ہاتھ میں پکڑا اپنا پرس ہی آثم پر دے مارا —

"تمہاری یہ بچپن کی دھینگا مشتی کی عادت ابھی بھی نہیں گئی —"

"تو تم مجھ سے ایسی باتیں کیوں کرتے ہو — ؟"

"تو اور کس سے کروں — ؟"

"ہونہہ!" صنم گاڑی میں سے نکل کر آثم سے پہلے پہلے اس کے گھر کے اندر چلی گئی —

"امی بیگم! ابا میاں!! کہاں ہیں آپ — ؟" وہ انہیں پکارتے ہوئے اک اک کمرے میں دیکھنے لگی —

"وہ تو آج گھر میں ہی نہیں ہیں —" آثم اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا — "مرزا شفیق کے گھر نہ جانا ہوتا تو ابا میاں آج خدا بخش والی دعوت میں ضرور شرکت کرتے — چلو — سنا دو ابا میاں اور امی بیگم کو سب کچھ اور جلدی سے پیٹ ہلکا کر دو —" آثم اسے چڑاتے ہوئے ٹھینگا دکھاتے ہوئے ڈرائینگ روم میں گھس گیا — صنم ابھی وہیں حیران پریشان سی کھڑی تھی کہ دوسرے ہی لمحے آثم واپس باہر نکلا —

"ستو" آواز دبا کر اس نے اسے مخاطب کیا — "ذرا جلدی سے آنا اک تماشہ دکھاؤں —"

وہ اس سے روٹھی ہوئی تھی مگر اس کی آواز پر اس کے قدم خود بخود اس کی طرف اُٹھ گئے —

"کیا ہے — ؟" پوری دلچسپی سے وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی —

"اِدھر آؤ — آواز نہیں نکالنا —" صنم کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے وہ اسے ڈرائینگ روم کے دروازے میں لے گیا — "وہ دیکھو —"

"ہائے اللہ —" ٹی وی کے عین سامنے بالکل تھوڑے فاصلے پر نانی اماں اپنے سے بھی کچھ زیادہ ہی اک بوڑھی اور پوپلی سی عورت کو لئے بیٹھی تھیں اور دونوں ہی بڑے غور سے ٹی وی دیکھ رہی تھیں —

"یہ کون ہے — ؟" صنم نے دوسری عورت کے متعلق استفسار کیا —

"یہ گلابو کی دادی ہے —"

"گلابو کی دادی — ؟" وہ مسکرائی "گلابو کی دادی ابھی بقیدِ حیات ہے — ؟"

"نہ صرف بقیدِ حیات ہے بلکہ ٹی وی دیکھ دیکھ کر پوری طرح اپنی حیات سے لطف اندوز ہو رہی ہے —" دونوں آواز دبا دبا کر ہنسنے لگے —

"پروگرام کون سا ہو رہا ہے — ؟"

"فلم لگی ہوئی ہے شاید —"

"ہائے بی بی جی! یہ اس عورت نے کپڑے کیسے پہنے ہوئے ہیں ۔۔۔؟" وہ چندھی چندھی آنکھوں کی پلکیں جھپکتے ہوئے نانی اماں سے پوچھ رہی تھی ۔۔۔ "بازو بھی ننگے ہیں، پیٹ پر سے بھی کپڑا غائب ہے اور پاجامے کا ایک پائنچہ بھی شاید نہیں ہے ۔۔۔ توبہ توبہ!" وہ اپنے کانوں کو کھینچ رہی تھی ۔۔۔

"گلابو کی دادی ۔۔۔۔!" آثم جلدی سے پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا ۔۔۔ "اتنی دور سے اور ایسی پتلی پتلی تاروں میں سے گزر کر آتی ہیں نا تو الجھ الجھا کر کپڑے پھٹ جاتے ہیں ۔۔۔" نانی اماں کے بجائے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے آثم نے اس بات کا جواب دیا ۔۔۔۔ "ہم سے اگلے گھر کے ٹی وی میں پہنچتے پہنچتے تو انکے اتنے کپڑے بھی نہیں رہ جائیں گے ۔۔۔"

"ہائے ہائے! وہ گھر تو لڑکیوں والا ہے ۔۔۔" وہ آثم کی بات کو سچ سمجھ کر یکایک چلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی ۔۔۔ "بی بی جی! لڑکیوں کو ادھر بلا لوں ۔۔۔۔؟"

آثم قہقہے لگاتے ہوئے جلدی سے باہر نکل گیا ۔۔۔ صنم ابھی تک وہیں دروازے میں کھڑی سارا تماشہ دیکھ رہی تھی ۔۔۔ "اُفّ! تم بڑے خراب ہو ۔۔۔"

وہ اپنی مسکراہٹ کو ہونٹوں میں چھپاتے ہوئے بولی ۔۔۔۔

"میں خراب کیوں ۔۔۔؟ یہ کل رات مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ ان تاروں میں سے گزر کر یہ سب مرد عورتیں اس ڈبے میں آ گھستے ہیں ۔۔۔؟ اب میں اس کو کیا سمجھاتا ۔۔۔ اس کی عقل میں تو کچھ آنا نہیں تھا میں جلدی میں تھا، اسے ٹالنے کے لئے کہہ دیا کہ ہاں تاروں میں سے ہی گزر کر سب آتے ہیں ۔۔۔"

"کیوں بھولی بھالی عورت کو ۔۔۔۔۔"

"بھولی بھالی نہیں ۔۔۔۔" آثم نے اس کی بات کاٹ دی ۔۔۔ "بے وقوف کہو ۔۔۔ ذرا عقل استعمال کرتی تو خود کو ہی سمجھ آ جاتی کہ اس اتنے سے ڈبے میں اتنے ڈھیر سارے مرد اور عورتیں کیسے داخل ہو سکتے ہیں بھلا اور یہ انٹینا اور بجلی کی پتلی پتلی تاروں میں سے کیسے گزر سکتے ہیں ۔۔۔"

"پھر نانی اماں ٹھیک ہی کہتی ہیں نا کہ آج کل کے لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں اور پچھلے زمانے کے بڑے بھولے بھالے تھے ۔۔۔"

"ارے! بھائی جان اور آپی تو یہاں ہیں ۔۔۔" انجم کی آواز پر دونوں چونکے۔ ارم بھاگ کر ان کے پاس آ گئی

"وہ میری لاٹری کا پتہ کیا ہے ۔۔۔؟" وہ آثم سے پوچھنے لگی

"توبہ ۔۔۔!" آثم نے اپنی پیشانی تھام لی ۔۔۔ "میں تو تمہیں ٹکٹ لا کر دینے کا مجرم ہو گیا ۔۔۔ روز پوچھتی ہے ۔۔۔"

"اور بھائی جان! مجھے ہر وقت سکول میں بھی اور گھر میں بھی بتاتی رہتی ہے کہ لاٹری نکلنے پر یہ کیا کیا کرے گی ۔۔۔"

"کیا کیا کرو گی ارمی ۔۔۔۔؟" صنم نے مسکرا کر پوچھا ۔۔۔

"بوبنا اور ممو کو یہ بڑی بڑی ان کے قد جتنی بولنے والی اور چلنے والی گڑیاں لے کر دوں گی ۔۔۔"

وہ جلدی جلدی بتانے لگی ۔۔۔ "انجم کو بلیٹ کا سوٹ بنوا کر دوں گی ۔۔۔"

"کل تو تم نے کہا تھا کوٹ لے کر دو گی ۔۔۔" انجم کے احتجاج پر ارم جلدی سے مصالحت بھرے انداز میں بولی ۔۔۔ "چلو اچھا ۔۔۔ کوٹ ہی سہی ۔۔۔"

"اور ہمارا اس نکلنے والی لاٹری میں کوئی حصہ نہیں ارمی ۔۔۔؟"

"ہائے آپی! کیوں نہیں ۔۔۔ ایک دولی کی ساڑھی آپ کو لے کر دوں گی اور بھائی جان کو" وہ سوچنے لگی کہ اس کے لئے کیا مناسب تھا ۔۔۔

"مجھے تو معاف ہی رکھو ۔۔۔" آثم نے اس کے ہاتھ جوڑ دیئے ۔۔۔

"ہاں تو ۔۔۔ آپ کو میری لاٹری نکلنے کی خوشی نہیں ہو گی نا ۔۔۔۔!" وہ بسوری ۔۔۔

"صنم ۔۔۔!" ارم کو کوئی جواب دینے کے بجائے آثم صنم سے مخاطب ہوا ۔۔۔

"ایک سائیکولوجسٹ تھا ۔۔۔ وہ پاگل خانے میں پاگلوں پر ریسرچ کرنے گیا ۔۔۔ اسے ایک پاگل دکھائی دیا جو ہو بہو اس لڑکی جیسی حرکات کر رہا تھا ۔۔۔" آثم نے ارم کی طرف اشارہ کیا ۔۔۔

"خواہ مخواہ ہی ۔۔۔" وہ چڑ کر بولی ۔۔۔

"خواہ مخواہ کیوں ۔۔۔ سنو تو سہی ۔۔۔" آثم نے اسے جھڑکا ۔۔۔ وہ چپ ہو گئی ۔۔۔

"سائیکولوجسٹ نے پاگل خانے کے انچارج سے پوچھا ۔۔۔ یہ آدمی کیوں پاگل ہوا ہے ۔۔۔؟ اس نے بتایا کہ اس کی لاٹری نہیں نکلی تھی ۔۔۔ اسی لمحے ایک اور پاگل وہاں آ گیا ۔۔۔ سائیکولوجسٹ نے اسے دیکھ کر پوچھا ۔۔۔ "اور اس کے پاگل پن کی کیا وجہ ہے ۔۔۔؟" "اس کی لاٹری نکل آئی تھی ۔۔۔" انچارج نے جواب دیا ۔۔۔۔" صنم اور انجم دونوں ہنسنے لگی ۔۔۔

"یہ انجام ان کا ارم کا ہوتا ہے ۔۔۔ اب بھی پاگل ہوئی پھر رہی ہے ۔۔۔ لاٹری نکل آئی تو تب

خوشی کے مارے پاگل ہو جائے گی — میں تو کل ہی جا کر اسے پیشگی ہی پاگل خانے میں جمع کرا آتا ہوں"

لطیفے سے زیادہ آثم کی اس بات پر صنم اور انجم قہقہے لگانے لگیں۔ اور ارم ان تینوں سے ناراض ہو کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے واپس اپنے گھر ممی کے آگے شکایت لگانے کے لئے بھاگ گئی

O

دھنک اور شہزاد اکٹھے ہی گھر میں داخل ہوئے —

"اسلام علیکم — !"

"اسلام علیکم — ارے! یہ آپ اس طرح سر کو کیوں تھامے بیٹھی ہیں؟"

امی کو اس انداز میں چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی —

"کچھ نہیں —" امی نے سر اٹھایا — ان کے ہاتھ میں اک نیلا لفافہ تھا —

وہی لفافہ — جسے دھنک نے شعور کی حدوں میں داخل ہوتے ہی ہر دوسرے تیسرے روز ماں کو وصول کرتے پایا تھا — وہی مانوس سی اس پر تحریر تھی — مگر — یہ خط ملتے ہی امی یوں پریشان تو نہیں ہو جایا کرتی تھیں — بلکہ — خوشی کے مارے ان کے کپکپاتے ہاتھ لفافہ کھولتے رہتے تھے اور آنکھوں میں بڑی خوبصورت سی چمک ہوتی تھی — پھر جلدی جلدی سارا خط پڑھ چکنے کے بعد وہ عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ دھنک کو دیکھتے ہوئے خط اس کے آگے ڈال کر خود کسی نہ کسی کام میں لگ جاتیں —

پھر دھنک ان کا ارادہ بھانپتے ہوئے بھی ان کی نظر بچا کر وہ خط مٹھی میں دبا تی کہ فطری شرم و حیا کی وجہ سے وہ ایسی چوری کرنے پر مجبور تھی — امی کے ہونٹوں پہ مچلتی مسکراہٹیں اسے وہ خط پڑھنے کو اور بھی بے تاب کر دیتیں — وہ جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی —

یہ خطوط امی بیگم کے ہوا کرتے تھے۔ جن میں آثم کے متعلق چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری بے شمار باتیں لکھی ہوتی تھیں اور آثم کی ہر حرکت، ہر ادا کے ساتھ ساتھ دھنک کی کسی نہ کسی بات کا بھی ذکر ضرور ہوتا تھا یوں جیسے اس کی امانت یا ملکیت ان کے پاس تھی اور وہ اس کے گزرنے والے ہر ہر لمحے کا حساب دینا گویا

اپنا فرض سمجھتی تھیں — دھنک کو امی بیگم کے خطوط پڑھنے میں بڑا مزہ آتا تھا یوں در پردہ امی سے زیادہ خود اسے ان کے خط کا انتظار رہتا تھا —

مگر آج — اس خط میں جانے کیا تھا جو امی یوں سر پکڑے بیٹھی تھیں — وہ کاشف یا شہزاد، کسی کے بھی سامنے آثم یا اس کے گھر والوں میں سے کسی کا بھی تذکرہ کبھی زبان پر نہیں لایا کرتی تھی، حالانکہ تصورات اور خیالات کے ذریعے وہ سارے لوگ ہر وقت اس کے آس پاس ہی موجود رہتے تھے — وہ انکی تھی اور وہ سب اس کے تھے، مگر دھنک کا ضمیر شرم و حیا کی مٹی سے اٹھا تھا — لیکن — اس وقت پریشانی میں اسے شہزاد کا بھی خیال نہ رہا —

"امی! کیا بات ہے —؟ لاہور میں سب خیریت سے تو ہیں نا —؟" وہ بڑی بیقراری سے پوچھنے لگی

"ہوں —؟" امی نے اس کی طرف دیکھا —

"امی! آپ پریشان لگ رہی ہیں —" دھنک نے پھر خط کی طرف اشارہ کیا۔

"پر تو ہے نا —؟"

اس کی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے امی مسکرا پڑیں — "ہاں سب ٹھیک ٹھاک ہیں"

"ہائے! آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا —" سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے دھنک ان کے پاس ہی بیٹھ گئی —

"آؤ بیٹے!" امی نے بڑے پیار سے شہزاد کی طرف دیکھا — "یہاں میرے پاس آ بیٹھو —" امی نے اپنی دوسری جانب اسے جگہ دی — "آج روز کی نسبت جلد آ گئے ہو —؟"

"یہ اپنی لاڈلی سے پوچھئے —" اس نے دھنک کی طرف اشارہ کیا —

"کیا ہوا —؟" امی نے گھبرا کر دھنک کی طرف دیکھا — کہیں اس نے شہزاد کے ساتھ پھر کوئی بدتمیزی تو نہیں کی تھی —؟ انہیں تو بس ہر وقت یہی فکر لگا رہتا تھا —

"کچھ نہیں امی! میں نے تو کچھ نہیں کیا —" ماں کی نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہی دھنک کے خوبصورت چہرے پر گھبراہٹ پھیل گئی —

"میں نہیں مان سکتی —" امی کی بے اعتباری پر شہزاد نے زور سے قہقہہ لگایا

”میں نے اس لئے کہا تھا اس سے پوچھئے کہ دفتر سے اپنا کام بھی ادھورا چھوڑ کر جلدی نکلا تھا کلفٹن کی تھوڑی سی سیر کرنے کی خاطر ـــــ مگر ان محترمہ کو اچانک کوئی ضروری کام یاد آ گیا ـــ چنانچہ کلفٹن کے بجائے گھر کی راہ لینا پڑی ـــ“

”کیا کام تھا گڑیا ـــــ؟“

دھنک گھبرا گئی ـــ کام کا تو اس نے محض بہانہ بنایا تھا، شہزاد کے ساتھ دفتر چلی جاتی تھی، اس کا لکھنے کا سارا کام کر دیتی تھی کہ یہ اس کے ڈھیروں ڈھیر احسانات کا اک تھوڑا سا بدل ہو سکتا تھا، مگر اس کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے جانا اسے اب بھی پسند نہ تھا، اس کا دل کسی بھی طرح یہ بات مانتا نہیں تھا، اور ـــ امی کام کے متعلق پوچھنے لگ گئی تھیں ـــــ امی سے وہ بہت خوف کھاتی تھی

”وہ ـــ امی ـــ!“ وہ گڑبڑائی ـــ ہکلائی ـــ پھر یک دم اک خیال بجلی کی مانند ذہن میں کوندا ـــ ”وہ میں شہزاد بھائی کا سویٹر بنا رہی تھی نا ـــ وہ آج ختم ہونا تھا ـــ سیر کرنے چلی جاتی تو کیسے ختم ہوتا ـــ“

بروقت اسے بات سوجھ گئی تھی ـــ شہزاد کے سویٹر کے نام پر تو امی بھی خوش ہو گئیں

”واہ واہ! اچھا مجھے دھوکے میں رکھا ـــ“ شہزاد جلدی سے بولا ـــــ

”دھوکے میں کیوں ـــــ؟ سچ مچ بنا رہی ہوں ـــ“

”وہ تو ٹھیک ہے ـــ بنا رہی ہو گی ـــ اس کا شکریہ بعد میں ادا کروں گا ـــ اس وقت افسوس ہو رہا ہے کہ وہاں اگر مجھے معلوم ہو جاتا نا کہ میرا سویٹر بنانے کی خاطر نہیں جا رہیں تو میں کبھی بھی یہ بہانہ نہ سنتا ـــ دیکھئے نا امی!“ پھر وہ امی سے مخاطب ہو گیا، یہ کام بہت کرتی ہے، اس کی صحت خدانخواستہ اگر کہیں خراب ہو گئی تو میں کاشف کو کیا منہ دکھاؤں گا ـــ“

”ہاں بیٹے! یہ بات تو تم نے ٹھیک کہی ـــ کاشف کے علاوہ مجھے اس کے سسرال والوں کا بھی فکر ہے ـــــ اب یہ دیکھ لو پھر خط آیا ہے ـــ اور اب تو شادی کا تقاضہ زبردست ہے“

”تبھی آپ ہاتھوں میں سر دیئے بیٹھی تھیں ـــ“

”تو اور کیا کروں ـــ؟ ہمارے حالات ایسے نہیں ہیں ـــــ“

”امی! میں چائے بنا لاؤں ـــــ“ دھنک اٹھتے ہوئے بولی ـــ ویسے بھی وہ خط

اب اس کی مٹھی میں تھا ـــــ اور وہ اپنے آتم کی باتیں پڑھنے کے لئے بے تاب تھی ـ کتنا اچھا تھا اس کا آتم ـــ! اور کیسے اچھے اچھے کام وہ آج کل کر رہا تھا ـ کتنے ہی لوگوں کی پریشانیاں اور مجبوریاں دور کر کے ان کی دعائیں لے رہا تھا ـــ اور انہیں کی مسم زبان ہوتی ہوئی وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی ـــــ

”آپ امی! حالات کی فکر کیوں کرتی رہتی ہیں ـــ؟“ دھنک کے چلے جانے کے بعد شہزاد بولا ـ ”میں نے کہا نا یہ شہزاد جو آپ کا بیٹا آپ کی ہر فکر، ہر پریشانی دور کرنے کو موجود ہے ـ کاشف کے بری ہو کر آتے ہی دھنک کی شادی کر دیجئے گا ـــ“

”خدا تمہیں سدا سلامت رکھے اور ڈھیروں سکھ دے، میں فکرمند اسی لئے ہوتی ہوں نا کہ کاشف کے آتے ہی فوراً شادی بھی تو نہ کر سکیں گے ـــ اور ان کے تقاضے شدید سے شدید تر ہوتے جا رہے ہیں ـــــ“

”کاشف کے آتے ہی کیوں نہ کر سکیں گے ـــ؟“

”بیٹے! کاشف جیل سے رہا ہو کر آئے گا، کوٹ، کچہری یا وکیل وغیرہ سے پیسہ کما کر تو نہیں لے آئے گا ـــ کہ میں اس کے آتے ہی دھنک کی شادی رچا بیٹھوں ـــ ابھی تو مقدمے کا فیصلہ پتہ نہیں کب ہو ـــ مہینے تک ـــ دو یا چھ مہینے تک ـــ پھر آ کر کوئی نوکری وغیرہ تلاش کرے گا فوراً ہی اگر ملازمت مل بھی جائے تو بھی ایک آدھ سال کی کمائی سے اتنا تو نہیں جمع ہو جاتا کہ ..“

”مگر امی ـــــ!“ شہزاد درمیان میں ہی بولا ـ ”وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ اپنے اس بیٹے کو کیوں بھولی جا رہی ہیں ـــ“ شہزاد نے اپنی طرف اشارہ کیا ـ ”بس کاشف کے آتے ہی دھنک کی شادی ہو گی اور انشاء اللہ ضرور ہو گی ـــــ کل سے ہی میں مقدمے کے ساتھ ساتھ شادی کے انتظامات کی طرف بھی توجہ دیتا ہوں ـــــ آپ کپڑے وغیرہ بنانا شروع کیجئے ـــ اور بھی شادی کے لئے جو کچھ ہوتا ہے سینا سلانا، کاڑھنا، بننا سب کیجئے ـــ میں آپ کو دو تین ہزار روپیہ کل ہی بنک سے نکلوا کر لا دیتا ہوں ـــــ“

”مگر بیٹے ـــــ!“ امی جانے کیا کہنا چاہتی تھیں ـــــ شہزاد نے انہیں وہیں ٹوک دیا ـ

”مگر وگر کچھ نہیں ـــــ“ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا ـــ ”دھنک کی چائے ہی ابھی تک تیار نہیں

ہوئی ——— ''بلند آواز میں بڑبڑاتے ہوئے وہ باورچی خانے میں جا گھسا ———

دروازے کی طرف پشت کئے پرلی کھڑکی میں کھڑی دھنک خط پڑھ رہی تھی اور چائے کا پانی کھول کھول کر کیتلی سے باہر گر رہا تھا

''یہ چائے پک رہی ہے ——— ؟'' شہزاد کی آواز سنتے ہی وہ گڑبڑا کر پلٹی ———

''اوہ ——— !'' کھولتے اور گرتے پانی کی کیتلی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے خط مروڑ کر جلدی سے مٹھی میں دبا لیا ——— اس کا چہرہ حیا سے گلنار ہوا اٹھا تھا مگر ہونٹوں پر اک انتہائی دلآویز تبسم پھیل رہا تھا اور اس کی روشن اور مخمور آنکھوں میں بڑی خوب صورت سی جوت جگمگ جگمگ کر رہی تھی ———

بے خم کھاتے ہوئے عنابی لبوں پر پھڑکتا تبسم، جسے وہ دبانے کی کوشش کر رہی تھی اور آنکھوں میں پھیلی یہ چمک جسے وہ لمبی لمبی پلکیں جھپکا جھپکا کر کھل کھل جانے والی چوری کو گویا شہزاد سے چھپانے کی کوشش میں تھی ——— یہ سب کتنا خوب صورت نظارہ پیش کر رہا تھا ———

کیسا حسین اور دل کو موہ لینے والا منظر تھا ——— شہزاد تکے ہی گیا ———

''میں بس ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں ———'' جھکی جھکی نگاہوں سے وہ شرم و حیا میں ڈوبی کپکپاتی آواز میں بولی ———

''خط میں کیا تھا ——— ؟''

''وہ ——— وہ ——— کچھ نہیں ———'' وہ ہکلائی ——— گھبرائی ———

''ان کے شادی کے تقاضوں سے خوش ہو رہی ہو ——— ؟'' شہزاد کا انداز عجیب سا تھا

''کیا ——— ؟'' دھنک یکدم سنجیدہ ہو گئی ——— پھر قدرے توقف بعد آہستہ سے بولی

''شہزاد بھائی! دلوں کے ملاپ کو شادی کہتے ہیں ——— اور میری شادی تو بہت عرصہ ہوا ہو بھی چکی''

اس موضوع پر آج پہلی بار دھنک نے اس کے سامنے زبان کھولی تھی ———

''ہمیں بھی تو بتاؤ کس کے ساتھ تمہارا دل مل گیا اور کس کے ساتھ تمہاری شادی ہو چکی ——— ؟'' شہزاد اس کے قریب آ کھڑا ہوا ———

''ایسی باتیں بہنوں کے ساتھ نہیں کیا کرتے ———'' دھنک کا لہجہ قدرے تلخ تھا مگر آواز میں چونکہ نرمی تھی، شہزاد نے محسوس نہ کیا ——— ''میرا دل جس کا تھا اسی کے ساتھ مل گیا ہے، شہزاد بھائی!

میں جس کی امانت تھی اسی کی ہوں ———'' وہ جلدی جلدی چائے بنانے لگی ———

''کل میں بنک سے پانچ ہزار روپیہ نکلوا لاؤں گا ——— شاپنگ کرنے چلیں گے ———''

''میرے پاس سب کچھ موجود ہے ——— ضروریات سے بہت زیادہ ———''

''تمہارے لئے تو شاپنگ نہیں کرنی ——— تمہاری شادی کے لئے ——— !''

''کیا ——— ؟'' دھنک نے تعجب سے شہزاد کی طرف دیکھا ———

''ایسے کاموں کے لئے بہت وقت درکار ہوتا ہے، ابھی سے تیاری شروع کی جائے گی تو کاشف کے آتے ہی تمہاری رخصتی ہو سکے گی نا ———''

''نہیں نہیں ———'' دھنک بلند آواز میں چلا پڑی ——— ''میں یوں اپنی شادی نہیں کراؤں گی ———''

''کیا ہوا گڑیا ——— ؟'' امی گھبرا کر اندر آ گئیں ——— ''یہ اس قدر بلند آواز میں کیوں بول رہی ہو؟''

''امی ——— ! امی ——— !!'' سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑ وہ لپکی اور جا کر ماں سے لپٹ گئی

''میں اس طرح شادی نہیں کراؤں گی ——— کبھی نہیں ———'' ماں کے کندھے کے ساتھ سر لگا کر وہ رونے لگی

''ارے ہوئے ——— ہوا کیا ——— ؟ کس طرح شادی نہیں کراؤ گی ——— ؟'' اس کے سر کو سہلاتے ہوئے امی نے شہزاد کی طرف استفسارانہ انداز میں دیکھا ———

وہ دھنک کی طرف دیکھ دیکھ کر بس کھڑا مسکرائے جا رہا تھا ———

''یہ شہزاد بھائی کہتے ہیں کہ کل سے میری شادی کے لئے شاپنگ شروع کر دیں گے اور پھر کاشی جی کے آتے ہی . . . .'' فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد وہ پھر بولی ——— ''میں یوں شادی نہیں کراؤں گی ——— میری شادی کے لئے شاپنگ کاشی جی خود کریں گے ——— اپنی کمائی سے کریں گے ———''

''پاگل ہو گئی ہے یہ لڑکی تو ——— !'' امی بات کو ٹالنے کے لئے زور سے ہنس پڑیں ———

''دیکھو نا شہزاد! مجھ سے بھی چار انچ اونچی ہے اور حرکتیں دیکھو ——— بالکل بچوں والی ——— یہ دیکھو میرا کندھا ——— آنسوؤں سے ساری قمیص تر کر دی ہے ———''

''آپ بات بدل رہی ہیں ———'' وہ خفا سی انداز میں ماں کو دیکھتے ہوئے پرے ہٹ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ——— ''لیکن میں نے کہہ دیا ہے ——— اگر اس طرح آپ نے میری شادی کرنے کی کوشش

کی تو میں نہیں کراؤں گی ـــــ کبھی نہیں ـــــ"

پھر اس نے رخ پھیر کر نرم سی آواز میں کہا ـــــ "شہزاد بھائی پہلے ہی ہم پر تھوڑا تو نہیں خرچ کر رہے مزید میں نہیں کرنے دوں گی ـــــ کوئی حد بھی ہوتی ہے ـــــ"

"او ہو! تو یہ محترمہ دھنک صاحبہ میری خیر خواہی کر رہی ہیں ـــــ ارے بھئی! مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ـــــ" وہ اس کے قریب جا کھڑا ہوا ـــــ "تم کیا جانو تم پر خرچ کر کے مجھے کتنی خوشی حاصل ہوتی ہے ـــــ" بات کرتے کرتے یک دم اس کا لہجہ مدھم پڑ گیا ـــــ "کاش! کبھی تم محسوس کر سکتیں ـــــ مگر یہ تو اک احساس ہے جو صرف روح سے محسوس کیا جا سکتا ہے اور تمہارے پاس وہ روح شاید ہے ہی نہیں"

شہزاد تیز تیز قدم اٹھاتا باورچی خانے سے باہر نکل گیا ـــــ

"یہ تو ہے ہی بے وقوف ـــــ" بڑبڑا کر اسی کو سناتے ہوئے امی اس کے پیچھے چلیں، وہ یک دم بڑا سنجیدہ ہو گیا تھا ـــــ! دو قدم جا کر رک گئیں ـــــ

پھر اک تیکھی سی نگاہ دھنک کے سراپا پر ڈالتے ہوئے بولیں ـــــ

"اور اب یہ بے جا اور بے وقت کا رونا دھونا ختم کر کے چائے لے آؤ ـــــ" اور باورچی خانے سے باہر نکل گئیں ـــــ

○

امی بیگم لمبے لمبے غیر ہموار اور بے ترتیب سے سانس لیتے ہوئے تیزی سے آ کر نانی اماں کے نماز والے چھوٹے تخت پر بیٹھ گئیں ـــــ نماز ختم کر کے سلام پھیرنے کے بعد وہ ہمیشہ بڑی بڑی دیر تسبیح پھیرتی رہا کرتی تھیں مگر ـــــ بیٹی کے کپکپاتے اور لرزتے وجود کو یوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے دیکھ کر تسبیح وغیرہ چھوڑ چھاڑ ادھر ہی متوجہ ہو گئیں ـــــ انہیں تو دعا مانگنے کا بھی ہوش نہ رہا ـــــ

"کیا ہوا ساجدہ ـــــ؟" جانماز لپیٹتے ہوئے انہوں نے انتہائی تشویش سے بیٹی کو دیکھا ـــــ ان کے انداز تو یہی بتا رہے تھے کہ کوئی بہت ہی زیادہ سنگین معاملہ تھا ـــــ وہ فکر مند نگاہوں سے انہیں گھورنے لگیں ـــــ "ہوا کیا ـــــ؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ ـــــ"

"وہ ہو گیا اماں! جو نہیں ہونا چاہیئے تھا ـــــ" وہ مرتعش لہجے میں بولیں ـــــ

"پہیلیاں مت بوجھواؤ ساجدہ ـــــ! میری عمر اس کی متحمل نہیں ہو سکتی ـــــ"

"اماں! کیا بتاؤں اماں ـــــ؟" ساجدہ بیگم نے سر اٹھایا ـــــ اماں کانپ کر رہ گئیں ـــــ وہ تو برسوں کی بیمار لگ رہی تھیں ـــــ

"کچھ بولو بھی ـــــ؟" اماں تقریباً چیخ پڑیں ـــــ

"وہ ـــــ اماں! میں نے اپنے اشی کو صنم کے ساتھ دیکھا ہے ـــــ"

"کیا کہہ رہی ہو ـــــ؟ اشی کو صنم کے ساتھ دیکھا ہے تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کون سی بات ہے روز ہی دونوں اکٹھے آتے جاتے ہیں ـــــ اکٹھے بیٹھتے اٹھتے ہیں ـــــ آج کیا انوکھی بات ہو گئی ہے ـــــ"

"اماں! میں آج تک یہی سمجھتی رہی تھی کہ اشی کی کوئی بہن نہیں ہے اور وہ صنم کو اپنی بہن ہی سمجھتا ہے مگر ـــــ" وہ خاموش ہو گئیں ـــــ

"ہاں ہاں ـــــ مگر کیا ـــــ؟" انہوں نے بے قراری کا اظہار کیا ـــــ

"مگر میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ بہن والا معاملہ نہیں ہے اماں ـــــ!" انہوں نے پھر ہاتھوں میں سر تھام لیا ـــــ

"اوہ ـــــ!" ماں بھی سر جھکا کر کچھ سوچنے لگیں ـــــ

"میں تو دھنک کی ماں کو پرسوں دوسرے دن ان کی شادی جلد کرنے کے لئے خط بھیج رہی ہوں اور ادھر یہ گل کھل رہے ہیں ـــــ" ساجدہ بیگم اسی طرح ہاتھوں میں سر لیے بڑبڑائے جا رہی تھیں ـــــ "لیکن ایسا کبھی نہیں ہو گا ـــــ کبھی بھی نہیں ـــــ اٹھارہ سال پہلے کا جوڑا ہوا رشتہ، جو اتنا مضبوط ہے اتنی سب کو گرہیں لگی ہوئی ہوں، وہ بھلا ٹوٹ سکتا ہے ـــــ"

"جذبات کی مچلی بپھری آگ سے دامن بچانا مشکل ہو جاتا ہے ساجدہ! اور پھر اس جوانی کی عمر میں ـــــ؟ یاد ہے ـــــ میں نے تمہیں پہلے ہی دن کہا تھا کہ جوان لڑکیوں والے گھر میں کسی جوان لڑکے کا کھلے بندوں آنا جانا اور جوان لڑکے والے گھر میں جوان لڑکیوں کا اچھا نہیں ہوتا ـــــ"

"مگر اماں! صنم تو پلی بڑھی اسی گھر میں ہے ـــــ"

"کچھ بھی تھا ـــــ سگے بہن بھائی تو نہیں تھے ـــــ پھر تم نے کیوں آنکھیں بند کر چھوڑیں ـــــ"

"میں تو اپنے حساب سے اماں! بچپن سے اثمی کا رشتہ طے کیے بیٹھی تھی۔"

"غلطی پر غلطی تو تم خود کرتی رہی ہو ——"

"میں —— ؟" ساجدہ بیگم نے تعجب سے ماں کو دیکھا۔ "آپ اماں! کبھی ایک نظر دھنک کو تو دیکھتیں پھر آپ کو معلوم ہو جاتا کہ میں نے غلطی کی ہے یا جو کچھ کیا انتہائی مناسب تھا۔ اماں! وہ اتنی خوبصورت ہے، اتنی خوب صورت ہے کہ یقین کیجئے میرے اثمی کو اس جیسی خوب صورت اور کوئی لڑکی نہیں مل سکتی اگر اسی عمر میں اسے مانگ نہ لیتی تو یقیناً وہ مجھے پھر حاصل نہیں ہونا تھی —— کوئی بھی بیٹے والی ماں اسے ایک نظر دیکھ کر اپنے بیٹے کا سوال ڈالے بغیر رہ نہ سکتی تھی، وہ اتنی خوب صورت ہے اماں —— !"

"میں غلطی سے یہ نہیں کہہ رہی ساجدہ! کہ وہاں کیوں رشتہ کیا —— ؟"

"پھر —— ؟ میں آپ کا مطلب سمجھی نہیں —— ؟"

"تم نے اثم کو اس رشتے سے بے خبر رکھا —— یہ تمہاری غلطی ہے ——"

"وہ تو اماں! میں نے اس لئے اسے نہیں بتایا تھا کہ ——" ساجدہ بیگم مزید کچھ کہنے کے لئے تھوڑا سا جھجکیں، پھر سر جھکاتے ہوئے مدھم سی آواز میں بولیں "اثمی کے ابا میاں کا جو واقعہ ہوا تھا وہ تو آپ کو یاد ہی ہوگا —— تعلیم ادھوری چھوڑ بیٹھے تھے کہ شادی جلدی کر دیں ——"

گزرا وقت یاد آیا —— اماں مسکرا پڑیں، جھریوں بھرے چہرے پر بڑی خوب صورت سی چمک لہرائی —— "سجو! تم بھی جوانی میں بس ایسی ہی تھیں ——"

"کیسی اماں —— ؟"

"جیسا تم دھنک کو کہہ رہی ہو ——"

"چھوڑیئے بھی اماں —— !" ساجدہ بیگم کے چہرے پر سرخیاں پھیل گئیں۔

"تبھی تو راشد میاں کو شادی کی جلدی پڑ گئی تھی ——"

"بس! اسی لئے اماں —— !" ساجدہ بیگم نے جلدی سے ان کی بات پکڑ لی —— "میں نے اثمی کو بتایا نہیں تھا —— اس کے ابا میاں کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ ایم اے پاس کر لے —— میں نے سوچا ایسا نہ ہو تاریخ پھر اپنا آپ دہرا دے —— باپ کی طرح خوب صورت منگیتر پا کر بیٹا بھی تعلیم ادھوری چھوڑ چھاڑ شادی کے پیچھے پڑ جائے ——"

"اب تو ایم، اے بھی کئے اسے ڈیڑھ دو سال ہو گئے شاید —— ؟"

"ہاں —— دو اڑھائی سال ہو گئے ہیں ——"

"اماں! کچھ عجیب سا ہی وقت گزرتا رہا ہے، کبھی مجھے خیال نہیں رہا —— کبھی سوچا مگر موقع نہیں ملا —— آپ نے ہم ماں بیٹے کو اکٹھے اور تنہا بیٹھے دیکھا بھی ہے کبھی —— ؟ اسے تو مجھ سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی —— دن سارا دفتر میں یا دفتر کے کاموں میں پھر کر گزار دیتا ہے رات کو آتا ہے تو یہاں لڑکیوں کے میلے لگے ہوتے ہیں ——"

آج زندگی میں پہلی بار لڑکیوں کے ذکر پر ساجدہ بیگم کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے —— "میں بھلا بات کس وقت کرتی —— ادھر وہ دھنک کی ماں بیچاری نے کیوں شادی کو التوا میں ڈالے جا رہی ہیں —— لکھتی ہوں انہیں آج ہی ایک اور خط ——"

"ہر گھر کے اپنے مسائل ہوتے ہیں —— وہ جو ابھی نہیں کر رہے یقیناً کوئی مجبوری ہی ہو گی —— ورنہ لڑکی جوان ہو، مناسب رشتہ بھی موجود ہو تو پھر کون ماں ہے جو جلد از جلد اپنے کندھوں کو بیٹی کے بوجھ سے آزاد نہ کرنا چاہے گی ——"

"پھر اماں! آپ ہی بتائیے میں کیا کروں —— ؟" وہ بالکل رونے والی ہو رہی تھیں —— "مجھے تو اماں کچھ سوجھائی نہیں دے رہا —— میری آنکھوں کے آگے تو اندھیرے پھیل رہے ہیں ——"

"اور کرنا کیا ہے جتنی جلد ہو سکے اثمی کو بتا دو کہ بچپن سے ہی اس کی نسبت دھنک کے ساتھ طے پا چکی ہے اور اب تم شادی کی تیاریاں کر رہی ہو —— ادھر ادھر اس کا کہیں خیال ہو گا تو تمہاری مرضی جان کر خود ہی دل سے وہ خیال نکال دے گا ——"

"اثمی! اثمی بیٹے —— !" انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی آواز کو نارمل کرتے ہوئے اسے پکارا —— وہ اس وقت اپنے کمرے میں تھا ——

"آیا امی بیگم —— !"

"اسے معلوم نہ ہونے پائے کہ تم کچھ جانتی ہو ——" اماں نے ساجدہ بیگم کو فہمائش کی ——

"ہائے اماں! میرے تو ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں ——"

"ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں — ؟" اماں نے تعجب سے ساجدہ بیگم کو گھورا —

"تم ماں ہو — وہ اولاد ہے — یہ کیا بات ہوئی ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں"

"اماں! میں ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی —"

"آج کے زمانہ میں ساجدہ! ہر انوکھی بات کی توقع رکھنی چاہیئے —"

"جی امی بیگم! فرمائیے —" آثم مسکراہٹوں کے نور سے چمکتے چہرے کے ساتھ ان کے پاس آگیا — "آہا! یہاں تو ہماری نانی اماں بھی تشریف فرما ہیں — لگتا ہے کوئی کانفرنس ہوئی ہے —" دونوں کے درمیان پھنس کر بیٹھتے ہوئے آثم شگفتگی سے بولا" اور یہ ہماری امی بیگم بڑی سنجیدہ دکھائی دے رہی ہیں!" شوخی بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے اس نے جھک کر ماں کی آنکھوں میں جھانکا —

"کوئی پٹائی وٹائی والا معاملہ تو نہیں ہے — ؟ پہلے ہی بتا دیں تاکہ بھاگنے کو تیار رہوں —"

امی بیگم اب بھی خاموش تھیں — شاید ساتھ چھوڑ جانے والی قوتوں کو مجتمع کر رہی تھیں —

"بھاگو گے —" نانی اماں نے اس کا کان پکڑ لیا — ساجدہ بیگم تو کچھ کہہ ہی نہیں پا رہی تھیں — انہیں اخلاقی سہارا دینے کے لئے وہ جلدی سے بول پڑیں "آخر کب تک بھاگتے رہو گے — ؟ اب ہم نے تمہیں مت بھاگنے دیا —"

"نانی اماں! معاملہ کیا ہے — ؟" آثم نے کان چھڑانے کی کوشش کی —

"سمجھو! اب تم ابھی دوا ہے — کیوں بیچارے کو تڑپا رہی ہو — جرم بتا کر آخر میں عمر قید کی سزا تو تم نے اسے سنا ہی دینی ہے —"

"جل تو جلال تو — مولا کریم رحم فرما تو جانے کون سا جرم مجھ سے سرزد ہو گیا ہے"

اماں نے بات تو شروع کر دی تھی — امی بیگم کی بے زبانی کو زبان مل گئی —

"تم سے یہ جرم ہو گیا ہے کہ تم جوان ہو گئے ہو، تعلیم مکمل کر لی ہے — اور اب میں اور انتظار نہیں کروں گی — ایک ہی ایک میری اولاد ہو — زندگی کا پل بھر کے لئے بھی بھروسہ نہیں ہوتا — جی چاہتا ہے اپنی آنکھوں سے اپنے بچے کی خوشی دیکھ لوں —"

"بسم اللہ — بسم اللہ — !" آثم شوخی سے بولا — پھر نانی اماں کو آنکھ ماری — "کیوں نانی اماں! آپ نے میری سفارش کی ہے — ؟ چلیئے کل ہی آپ کی ایک عدد دعوت پکی — چائنیز کھانا — پھر کوہِ نہر — پھر فلم اور واپسی پر کریم والی گرما گرم کافی — بن گیا نا پکا پروگرام — ؟"

اس نے زبردستی نانی اماں سے ہاتھ ملا کر زور زور سے ہلایا —

"دیکھو آثمی! بات مذاق میں مت ٹالو — میں سنجیدہ ہوں —"

"تو امی بیگم! میں کب غیر سنجیدہ ہوں —"

"پھر ٹھیک ہے میں کل ہی دھنک کی امی کو خط لکھے دیتی ہوں —"

"کیا — ؟" آثم چونکتے ہوئے اچھل سا پڑا — اس کی شادی اور دھنک کی ماں کو خط — اس کا ماتھا ٹھنکا — "انہیں کیوں خط لکھ دیں — ؟"

"یہی کہ شادی کی تاریخ مقرر کریں —"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ — ؟ میرے پلے کچھ نہیں پڑا — ؟" وہ بہت سٹپٹایا ہوا تھا

"شادی ہی کی بات کر رہی ہوں — کوئی چینی جاپانی نہیں بول رہی جو تمہارے پلے کچھ نہیں پڑا —" آثم کے چونکنے سے، اس کی گھبراہٹ سے امی بیگم کو غصہ آگیا — تو گویا جو کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ ایک کھلی حقیقت تھی —

"تم چھ سال کے تھے جب تمہاری منگنی دھنک کے ساتھ ہو گئی تھی —"

"دھنک کے ساتھ — ؟"

"ہاں ہاں — دھنک کے ساتھ — !"

"لیکن امی بیگم! مجھ سے پوچھے بغیر ہی — ؟"

"چھ سات سال کے بچے سے کیا پوچھتی — ؟"

"تو چھ سات سال کے بچے کی منگنی کرنے کی ضرورت بھی کیا پیش آگئی تھی — ؟" آثم کا لہجہ قدرے ترش تھا —

"ضرورت اس لئے بیٹے —!" نانی اماں نے ذرا ملائمت اور حلیمی سے بات کرنے کی کوشش کی — ورنہ وہ ماں بیٹا تو دونوں ایک دوسرے کے ساتھ الجھنے ہی لگ پڑے تھے اور یہ معاملہ

نرمی سے سلجھانے کا تھا ـــــ سختی سے نہیں ـــــ

"دھنک بڑی خوب صورت ہے، ایسی ہمارے سارے خاندان میں کوئی لڑکی نہیں ہوگی۔

"لیکن نانی اماں! صرف شکل و صورت دیکھ کر ہی تو رشتے طے نہیں پا جایا کرتے ـــ"

"بیٹے!" نانی اماں اسی نرمی سے بولیں۔ "ان کا خاندان بھی دیکھا بھالا ہے ـــــ پورے دس سال ساجدہ اور دھنک کی ماں ایک دوسرے کی ہمسائیگی میں رہی ہیں ـــــ اور لڑکی کی عادات بھی بڑی اچھی ہیں ـــــ جیسی صورت ویسے گن ـــ"

"سات آٹھ سو میل کا فاصلہ ہے۔ آپ کو کیا پتہ اس کے گن کیسے ہیں ـــــ؟"

"ہاں ہاں ہم اندھے ہیں نا ـــــ جو وہاں سے ہو بھی آئے ـــــ لڑکی کو اچھی طرح دیکھ بھال بھی آئے ـــ پھر بھی اس کے گنوں کو نہ جان سکے ـــــ اور اسے گھر بیٹھے ہی سب کچھ معلوم ہے ـــــ"

ساجدہ! یہ تم تلخ کیوں ہوئی جا رہی ہو ـــــ؟"

"اماں! مجھے اس کی باتوں سے نافرمانی کی بو آ رہی ہے ـــــ"

"نافرمانی کیسی امی بیگم۔؟ خود ہی سوچئے میرا پوری زندگی کا معاملہ ہے ـــ"

"یہ میں بھی جانتی ہوں کہ تمہارا پوری زندگی کا معاملہ ہے اور ہم بھی تمہارے دشمن نہیں ہیں کہ کوئی غلط انتخاب کر کے تمہاری پوری زندگی کے ساتھ کھیل جائیں گے ـــــ"

"لیکن امی بیگم! میں صاف کہہ دوں کہ میں وہاں شادی نہیں کروں گا ـــــ"

"وہ تو تمہارے پہلے فقرے سے ہی مجھے علم ہو گیا تھا، لیکن ہم بھی زبان دے چکے ہیں ـــ"

"اور میرا بھی یہ آخری فیصلہ ہے ـــ" آتش نے انہیں کے انداز میں صاف جواب دے دیا ـــــ

"شاباش آتش! خوب کالک تھوپو ہمارے چہروں پر ـــــ اسی دن کے لئے ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا اور پڑھا لکھا کر، ہر آسائش دے کر اسی دن کیلئے اتنا کیا ہے"

"امی بیگم! یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں ـــــ؟"

"کچھ غلط نہیں کہہ رہی ـــــ اندھیر خدا کا ـــ اٹھارہ سال سے جڑا ہوا رشتہ اور لڑکے نے منٹ نہیں لگایا توڑنے میں ـــــ"

"کم از کم مجھے تو آپ کو بتانا چاہیے تھا ـــــ"

"پہلے اس لئے نہیں بتایا تھا کہ مردوں کی قوم کا کوئی پتہ بھی تو نہیں چلتا کہ کب کس راستے پہ مڑ جاؤ تعلیم ختم ہونے سے پہلے بتا دیتی تو یہ بھی تو خدشہ تھا کہ پڑھائی کی طرف سے ہی غافل ہو جاتے"

"پڑھائی کی طرف سے غافل ہونا ہوتا تو کب کا ہو چکا ہوتا ـــــ میں ایسا غیر متزلزل ارادوں والا انسان نہیں ہوں ـــ"

ہاں ہاں ـــــ وہ تو ہم ہیں ـــــ اٹھارہ سال رشتے کو پکا کرتے رہے اور اب تمہارے کہنے سے فٹافٹ یہ منگنی توڑ دیں گے ـــ" یکایک ان کے لہجے میں چٹانوں ایسی سختی آ گئی ـــ" میں کہے دیتی ہوں آتش! ایسے جیتے جی تو یہ ہوگا نہیں ـــــ تمہاری شادی ہوگی اور صرف دھنک کے ساتھ ہوگی ـــ"

"مگر امی بیگم! پلیز ذرا سوچیے تو ـــــ"

"میں کچھ بھی سوچنے کو تیار نہیں ہوں ـــــ جو کچھ سوچنا تھا میں اٹھارہ سال پہلے سوچ چکی ہوں اور اب یہ صرف تمہارا معاملہ نہیں رہ گیا ـــ"

امی بیگم پورے جلال میں تھیں ـــ" ساتھ ایک اور معصوم کا معاملہ بھی ہے وہ صرف دو سال کی تھی جب سے اس کے کان میں تمہارا نام پڑ رہا ہے ـــ اس کے علاوہ ان کی پوری برادری کو، ان کے حق ہمسایوں اور سب ملنے جلنے والوں کو بھی اس رشتے کی خبر ہے ـــ خدانخواستہ اب یہ رشتہ ٹوٹا تو دو خاندانوں کی عزت کے ساتھ ساتھ ایک معصوم اور بے گناہ کا دل بھی ٹوٹ جائے گا۔"

"اور میرا بے شک ٹوٹے ـــــ" آتش نے شاکی انداز میں ماں کی طرف دیکھا ـــــ

"تمہارا کیوں ٹوٹنے لگا ـــ؟ تمہیں اتنی خوب صورت بیوی مل رہی ہے ـــ واہ واہ! اچھی کہی ـــــ"

مگر امی بیگم! میری بھی تو سنیئے ـــــ" آتش نے بڑی عاجزی سے ماں کے گھٹنے تھام لئے پھر انتہائی التجا آمیز لہجے میں بولا ـــ" امی بیگم! خوب صورت بیوی ہی سب کچھ نہیں ہوتی، اصل زندگی کا ساتھ وہ ہوتا ہے جو طبیعتیں اور مزاج بھی آپس میں ملیں ـــ"

"اس کا مزاج بہت اچھا ہے ـــ اس کی طبیعت بھی بہت اچھی ہے تم سے یقیناً مل جائے گی"

لیکن امی بیگم! شکل صورت، طبیعت اور مزاج سے بھی بڑھ کر ایک اور چیز ہوتی ہے اور اسے کہتے ہیں دل ـــــ امی بیگم! دل کسی کے ساتھ ملنا سب سے بڑی خوش بختی ہوتی ہے ـــــ"

"یہ کیا دل دل لگا رکھی ہے ـــــ میں تو اتنا جانتی ہوں اچھی صورت اور اچھی سیرت والی بیوی کے ساتھ دل مل ہی جایا کرتا ہے ـــــ"

"نہیں امی بیگم! دل جس کے ساتھ ملنا ہو اسی کے ساتھ ملتا ہے ـــــ میرا دل جس سے ملنا تھا مل چکا ـــــ اب دھنک کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں ـــــ میں صنم کے ساتھ شادی کروں گا ـــــ"

"کیا ـــــ؟" امی بیگم یکایک چلا پڑیں ـــــ ماں کے سامنے تم یہ کہہ رہے ہو احمق ـــــ! اپنے عشق کی کہانی ماں کو سنا رہے ہو ـــــ؟"

"امی بیگم! میں نے کوئی گناہ کی بات تو نہیں کر ڈالی ـــــ اپنی پسند بتائی ہے ـــــ زندگی مجھے گزارنی ہے امی بیگم! اور اگر اپنی پسند کی لڑکی کے ساتھ جائز طور پر نکاح کر کے گزاروں گا تو اس میں گناہ تو کوئی نہیں ہو جائے گا ـــــ"

"اور وہ جو اٹھارہ سال سے تمہارے نام پر بیٹھی ہے اسے کس جرم کی سزا دو گے ـــــ؟ یہ رشتہ ٹوٹا تو اب اس کے در پر کوئی اور بھی نہیں آئے گا ـــــ اور پھر جب سب کو معلوم ہو گیا کہ اس کی بچپن کی منگنی ٹوٹ گئی ہے تو لوگ سو سو باتیں بنائیں گے، سب اسی میں عیب ڈالیں گے ـــــ" لڑکے کو تو کوئی کچھ نہیں کہا کرتا ـــــ بتا دو نا ـــــ ساری زندگی کے طعنے اور رسوائی و بدنامی آخر اس کے کس جرم کی پاداش میں اس کی جھولی میں ڈال دوں ؟؟"

"امی بیگم! یہ سب کچھ پہلے ہی آپ کو سوچ لینا چاہیے تھا ـــــ"

میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں نے جو کچھ سوچنا تھا وہ میں سوچ چکی ـــــ"

امی بیگم کے لہجے کی سنگینی نے جیسے سب کو ہی پتھرا دیا ـــــ "میں تمہیں بھی کچھ وقت دیتی ہوں سوچنے کے لئے ـــــ ایک طرف دھنک ہے اور ساتھ ہم سب، یہ جائداد کاروبار گھر وغیرہ ـــــ سب کچھ ـــــ اور دوسری طرف صنم ہے صرف ـــــ بس! اس صورت میں ہمارے ساتھ تمہارا کوئی واسطہ نہ ہو گا ـــــ ہم سمجھیں گے جہاں خدا

نے بیٹیاں دے کر واپس لے لیں اسی طرح بیٹا بھی دے کر ...."

"ساجدہ!" نانی اماں نے ان کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی چلا کر ان کی زبان بند کر دی، "اتنا دل سخت نہ کرو ـــــ"

"نہیں اماں! یہ میرا آخری فیصلہ ہے ـــــ ہم نے زبان دی ہوئی ہے اماں! وہ بھی بہت عرصہ سے ـــــ اور ہر دوسرے تیسرے دن میں انہیں خط لکھ کر گویا اپنے عہد کی تجدید کرتی رہتی ہوں صرف اس اعتماد کے سہارے پر کہ میں ایک فرمانبردار اور سعادت مند بیٹے کی ماں ہوں ـــــ اور ـــــ نافرمان اولاد کی مجھے ضرورت نہیں ہے ـــــ" امی بیگم نے بڑے ہی بے مہرانہ انداز میں اپنا فیصلہ صادر فرما دیا ـــــ

آنم اٹھا ـــــ سر جھکا ہوا تھا ـــــ نگاہیں اپنے ہی پاؤں میں لوٹ رہی تھیں ـــــ ذہن جانے کہاں تھا ـــــ؟ قدم ڈگمگائے جا رہے تھے ـــــ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا ـــــ

○

آج وہ اتنی خوش تھی ـــــ اتنی ـــــ کہ اپنی پوری زندگی میں اتنی خوش وہ کبھی نہ ہوئی تھی ابھی ابھی شہزاد نے آ کر یہ مژدہ جانفزا سنایا تھا کہ کل کاشف کے مقدمے کے فیصلے کا دن تھا سب گواہیاں، سارے بیانات، غرض سبھی کچھ اس کے حق میں تھا، چنانچہ اس کے باعزت بری ہو جانے کی نہ صرف یہ کہ امید ہی تھی بلکہ پورا یقین تھا ـــــ یقین اس لئے کہ چھرے پر کاشف کی انگلیوں کے نشان ثابت نہیں ہو سکے تھے، اور یہ اس کے باعزت بری ہونے کا سب سے بڑا ثبوت تھا ـــــ

باورچی خانے میں امی کے پاس شہزاد بیٹھا کھانا کھا رہا تھا، کاشف کے مقدمے کے سلسلے میں اس نے بڑی محنت اور دوڑ دھوپ کی تھی، دھنک ساتھ ساتھ اس کے لئے چائے بنا رہی تھی اور ساتھ ساتھ بڑی مزے کی باتیں کر رہی تھی، اس کا ایسا خوشگوار موڈ آج سے پہلے شہزاد

نے کبھی نہ دیکھا تھا ـــــ اسے خوش اور مسکراتے ہوئے پا کر وہ اس سے زیادہ خوش ہو رہا تھا۔

"اتنا مزے کا کھانا تھا ـــــ اتنا کھا گیا ہوں کہ پیٹ پھٹنے والا ہو گیا ہے ـــــ"

"تو اپنا گھر سمجھ کر کھانا تھا نا ـــــ" دھنک شوخی سے بولی ـــــ

"بہت خوش ہو آج ـــــ؟" شہزاد نے اس کے خوشیوں سے جگمگ جگمگ کرتے چہرے پر نگاہیں جما دیں ـــــ

"بہت ـــــ بے حد ـــــ میں آپ کو بتا نہیں سکتی ـــــ سوچتی ہوں ناکہ کل اس وقت میرے کاشی جی بھی ہمارے پاس یہاں بیٹھے ہوں گے تو عجیب سی خوشی محسوس ہوتی ہے ـــــ"

"چلو آؤ پھر اس خوشی میں تھوڑی سی شاپنگ کر آئیں ـــــ" وہ اٹھتے ہوئے بولا ـــــ

"شاپنگ ـــــ؟ کیا خریدنا ہے ـــــ؟ میں تو آج گھر کو ٹھیک ٹھاک کرونگی، امی چلی جائیں ـــــ"

"کاشف کے لئے ایک دو ریڈی میڈ سوٹ لینا تھے ـــــ سوچا تھا تمہاری پسند کے خریدونگا یوں اسے ناپسند بھی ہوئے تو تمہاری پسند کا سن کر پسند کرے گا ـــــ"

"کاشی جی کی خاطر تو ضرور چلونگی ـــــ ویسے بھی میری اور ان کی پسند مختلف نہیں ہوتی ـــــ"

"تو چلو پھر ـــــ جلدی سے تیار ہو جاؤ ـــــ"

"کتنا وقت لگے گا ـــــ؟ مجھے کل کے لئے کچھ تیاری کرنا ہے ـــــ"

"اب یہ تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کتنا وقت لگے گا ـــــ گھنٹہ لگ جائے ـــــ دو یا تین گھنٹے لگ جائیں ـــــ کل کے لئے تمہیں جو کوئی تیاری کرنی ہے وہ صبح کر لینا ـــــ کاشف تو دس گیارہ بجے کے بعد ہی گھر آئے گا ـــــ"

"اچھی بات ـــــ" دھنک جلد ہی رضامند ہو گئی ـــــ ہاتھ والا کام ختم کر کے باورچی خانے سے باہر نکلی تو شہزاد بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا ـــــ

"ذرا جلدی تیار ہونا اور وہ جو تمہاری سرخ بنارسی ساڑھی ہے نا ـــــ وہ پہننا ـــــ"

"شاپنگ کرنے جانا ہے اور وہ سرخ بنارسی ساڑھی پہنوں ـــــ؟" اس نے تعجب سے

شہزاد کو دیکھا ـــــ

"مجھے ابھی ابھی یاد آیا ہے نوید کی بہن سہیلہ کی منگنی ہے آج ـــــ واپسی پہ پانچ سات منٹ کے لئے ان کے گھر بھی چلے جائیں گے ـــــ"

"سہیلہ کی منگنی ـــــ؟ ابھی پچھلے ہفتے تو وہ آئی ہوئی تھی ـــــ اس نے تو کوئی ذکر نہیں کیا تھا؟"

"اچانک ہی طے پا گئی ـــــ صبح نوید نے مجھے کچہری میں بتایا تھا ـــــ"

"نہیں ـــــ آج میں کسی تقریب میں نہیں جا سکونگی ـــــ شاپنگ کے بعد مجھے گھر چھوڑ کر آپ امی کو ساتھ لے جائیے گا ـــــ"

"لیکن اس نے تمہارے لئے بہت تاکید کی تھی ـــــ سہیلہ نے خاص طور پر تمہیں پیغام بھجوایا ہے"

"ہاں بیٹی!" امی باورچی خانے کے دروازے میں کھڑی سن رہی تھیں ـــــ "تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی تمہیں جانا ضرور چاہیئے ـــــ وہ تم پر اتنی جان چھڑکتی ہے ـــــ"

"پتہ نہیں کیوں ـــــ؟ ذرا موڈ نہیں ہے ـــــ کاشی جی آ لیں پھر کسی دن جا کر سے مبارک دے آؤں گی ـــــ" شام ہونے والی تھی اور شام کے بعد وہ اکیلی شہزاد کے ساتھ کبھی گھر سے باہر نہیں رہی تھی ـــــ

"پھر وہ تمہیں کہیں ضرور ہی جانے دے گا ـــــ یاد نہیں کتنی پابندیاں لگائے رکھا کرتا تھا ـــــ"

"امی! اس انداز میں تو نہ کہیئے ـــــ انہوں نے نامناسب پابندی کبھی نہیں لگائی تھی ـــــ"

"اچھا اچھا ـــــ جا اب تیار ہو ـــــ نام لیتے ہی اس کی حمایت شروع کر دیتی ہے ـــــ"

"تو اور کس کی کرونگی امی ـــــ!" اور باقی بات دھنک نے دل کے ساتھ کر لی ـــــ

"اک کاشی جی اور اک آپ تم تو ہیں، جن کے لئے میں اپنا سب کچھ قربان کر دوں ـــــ ان کی طرفداری میں تو گونگی ہو کر بھی فر فر بول پڑوں، جسم کا رواں رواں زبان بن جائے ـــــ"

"امی! اسے کہیئے نا چلی چلے ـــــ آج کا دن چھوڑ کر پھر کسی دن گئی تو سہیلہ بُرا منا لے گی یوں بھی ہمیں ان کی خوشی میں پورا حصہ لینا چاہیئے ـــــ نوید نے کاشف کے مقدمے کے سلسلے میں کتنی ہماری مدد کی ہے ـــــ"

"ہاں تو دھنک! شہزاد درست کہہ رہا ہے، بیٹی! صرف اپنے موڈ ہی کا خیال نہیں رکھا

کرتے، مصلحت بھی دیکھا کرتے ہیں، سہیلہ تمہاری بہن ہے، اس لئے تمہیں ضرور جانا چاہیئے۔"

"ایک تو آپ دونوں ہمیشہ میرے خلاف اکٹھا محاذ بنا لیتے ہیں۔ تب مجھے شکست تسلیم کرنا ہی پڑ جاتی ہے۔"

"تو جلدی کرو نا۔ دیر ہو رہی ہے۔" شہزاد نے پھر تاکید کی۔ "اور وہی سرخ والی ساڑھی پہننا۔"

"تم بھی بیٹے! یہ کالا کوٹ اتار دو۔ وہاں بہت لوگ ہوں گے۔"

"بدلنے ہی جا رہا ہوں امی! میں دھنک کی طرح بیوقوف نہیں ہوں۔"

آج شہزاد کی شوخی بھری مسکراہٹ کا جواب دھنک نے بھی اک خوب صورت سی مسکراہٹ کے ساتھ دیا اور پھر تیار ہونے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شہزاد بھی غسل خانے میں جا گھسا تھا۔ امی برآمدے میں چھوٹے نماز والے تخت پر جا بیٹھیں۔ آنے والی کل ان کے لئے کتنی خوشیاں لے کر آ رہی تھی، وہ اسی کے تصورات میں ڈوب گئیں۔

شہزاد نے دھنک کا تقریباً تمام جہیز بنا لیا تھا۔ قیمتی سے قیمتی کپڑا۔ زیور۔ چینی کے اور سٹیل کے برتن۔ سب کچھ خریدا جا چکا تھا، فرنیچر کا آرڈر دے دیا ہوا تھا، وہ بھی ہفتے عشرے میں بن کر آنے والا تھا۔ غرض بہت حد تک تیاری مکمل تھی۔ بس۔ اک کاشف کے آنے کی دیر تھی۔

وہ سوچ رہی تھیں۔ کاشف آ جائے تو اس سے مشورہ کر کے کل ہی آتم کی امی کو خط لکھ دیں گی کہ اب اگلے مہینے میں ہی بے شک شادی کی کوئی تاریخ رکھ لیں۔ انکی تیاری مکمل تھی۔ ان سوچوں کے ساتھ ہی شہزاد کے لئے ان کے دل سے ڈھیر ساری دعائیں پھر نکل پڑیں۔

کیسا فرشتہ خدا نے ان کے گھر، ان کے سارے کام کاج سنوارنے کو بھیج دیا ہوا تھا۔ اتنی مشکلات زندگی میں آئیں مگر ایک بھی مشکل اس نے بننے نہ دی۔ ان کے مالی حالات کیسے خراب رہے، مگر اس کے باوجود انہیں زندگی کی ہر آسائش میسّر رہی اور اب ان کی دھنک کی شادی بھی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ہونے والی تھی۔ شہزاد تو رحمت کا فرشتہ تھا!

قدموں کی چاپ پر امی کے خیالات کا تسلسل یکایک ٹوٹ گیا۔ دھنک سرخ بنارسی ساڑھی

میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔ ان کی آنکھیں جیسے چکاچوند ہو اٹھیں۔ تو ان کی دھنک دلہن بن کر اتنی خوب صورت لگے گی؟ وہ بغیر آنکھیں جھپکے اسے تکے ہی گئیں۔

"کیا دیکھ رہی ہیں امی؟"

"سوچ رہی ہوں میری دھنک صرف سرخ ساڑھی پہن کر ایسی خوب صورت لگ رہی ہے اور جب باقاعدہ دلہن بنی تو پھر کیا عالم ہوگا۔ ماشاءاللہ!"

"ہائے امی!" دھنک نے ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ "میں تو پہن ہی نہیں رہی تھی۔ یہ شہزاد بھائی نے اصرار کیا ہے تو پہننا پڑ گئی۔"

"تو بُرا کیا کیا ہے؟ موقع کے مطابق ٹھیک ہی تو ہے۔"

"واہ بھئی واہ!" شہزاد نے آتے ہوئے نعرہ مارا۔

"دیکھا شہزاد! اچھی لگ رہی ہے نا؟ میں ابھی یہی کہہ رہی تھی کہ دلہن بن کر تو۔۔۔"

"چھوڑیئے بھی امی!" دھنک نے ان کی بات کاٹ دی۔ شہزاد کے سامنے امی کی اس انداز میں کی گئی تعریف اسے کچھ اچھی نہ لگی۔

"یہاں سچ بولنے پر پابندی ہے۔" شہزاد مسکرایا۔

"سچ بولنے پر تو پابندی نہیں۔" دھنک جلدی سے بولی۔ "بس صرف بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں جن کی زبان سے ایسے سچ نہیں نکلنا چاہئیں۔ بھائی کی زبان سے بہن کے حسن کی تعریف کچھ زیب نہیں دیتی۔"

"ہم تو تمہیں اپنی دوست سمجھتے ہیں۔"

"کاشی جی بھی مجھے اپنی دوست ہی کہا کرتے تھے، مگر ایسی میری تعریف انہوں نے کبھی نہیں کی۔"

شہزاد مسکرایا۔ "وہ حسد کرتا ہوگا نا۔"

"شہزاد بھائی! میں مذاق میں بھی کہی گئی اپنے کاشی جی کے متعلق ایسی بات قطعی نہیں سن سکتی۔"

"تو پھر نہ سن۔" امی کپٹیلے سے لہجے میں بولیں۔ "تم تو ہر وقت مرچیں ہی پھانک رکھتی ہو۔ لکھتی ہوں تمہاری ساس کو خط۔ جلد از جلد ہماری جان تم سے چھڑائیں۔" ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مگر وہ اظہار غصے کا کر رہی تھیں۔ شہزاد ہنس پڑا۔ دھنک خفیف سی ہو کر رہ گئی۔

"دونوں ہی مجھے باتیں بتائے جا رہے ہیں ــــ" وہ بڑبڑائی ــــ "کاشی جی کل آئیں گے نا تو ساری شکایتیں ان کے آگے لگاؤں گی ــــ"

"لگا دینا ــــ" امی بلند آواز میں بولیں ــــ "دیکھ لیں گے وہ ہمارا کیا بگاڑ لیتا ہے"

"آپ کو کیا کہہ سکتی ہوں ــــ مگر شہزاد بھائی کو تو پھینٹی لگوا ہی دوں گی ــــ"

"تمہاری مہربانی سے ملی ہوئی پھینٹی کو بھی دھنک! ہم مٹھائی سمجھ لیں گے ــــ زہے نصیب" شہزاد اور امی دونوں ہی زور سے ہنس پڑے۔

"چلو اب جاؤ بھی ــــ ایک آدھ گھنٹے میں شام ہونے والی ہے ــــ"

"اگر ہمیں کچھ دیر ہو گئی تو امی گھبرایئے گا نہیں ــــ ایسی تقریبات میں وقت کا احساس نہیں رہتا ــــ" شہزاد جاتے جاتے پھر مڑا ــــ "اور آپ کھانا بھی کھا لیجیئے گا ــــ ہمارا انتظار نہ کیجئے گا ــــ وہاں رات کے کھانے پر سب مدعو ہیں ــــ"

"تو ہم لوگ پھر ابھی سے وہاں جا کر کیا کریں گے ــــ؟" دھنک پھر بدکی ــــ

ہمیں تو پہلے شاپنگ کرنا ہے نا ــــ" شہزاد نے جھٹ یاد دلایا ــــ

"اوہ! اچھا ــــ کاشی جی کے لئے سوٹ خریدنا ہیں ــــ"

"ہاں ــــ"

تو پھر جلدی چلئے نا ــــ کیا پتہ کتنی دکانیں دیکھنا پڑیں اور تب پسند کی چیز ملے ــــ اچھا امی! خدا حافظ ــــ" وہ شہزاد سے پہلے ہی جا کر گاڑی کے پاس کھڑی ہو گئی ــــ

امی کو خدا حافظ کہنے کے بعد شہزاد بھی باہر آیا ــــ

اُرے! " دھنک اسے دیکھ کر زور سے ہنس پڑی، پہلے تو اس نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ شہزاد نے اپنا نیا سوٹ اور نئے بوٹ پہنے ہوئے تھے اور ساتھ شوخ شوخ رنگوں کی انتہائی خوب صورت ٹائی لگا رکھی تھی ــــ آپ تو یوں دولہا بنے ہوئے ہیں، جیسے سہیلہ کو آپ ہی انگوٹھی پہنانے والے ہیں" دھنک نے اسے مذاق کیا ــــ

"اپنی طرف نہیں دیکھا ــــ؟ تم بھی تو اک دلہن ہی لگ رہی ہو ــــ"

"میں ــــ؟" شہزاد کے جواب سے دھنک سٹپٹا سی گئی "میں نے تو آپ کے مجبور

کرنے پر یہ ساڑھی پہنی ہے، ورنہ اپنی مرضی کرتی تو سفید پہنتی ــــ" وہ قدرے چڑ کر بولی پھر بلند آواز میں بڑبڑانے لگی ــــ "پہلے کہہ کر اپنی مرضی کرا لی ہے اور اب چھیڑتے ہیں"

"پہل تمہیں نے تو کی تھی ــــ" شہزاد ہنسنے لگا ــــ "مجھے دولہا کہا تھا نا ــــ اور میں نے تو صرف بدلہ چکایا ہے ــــ"

"بہنوں کے ساتھ ایسی باتیں تو نہیں کیا کرتے نا ــــ" دھنک بڑبڑاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی ــــ

"میں نے تمہیں ہزار بار کہا ہے کہ میں تمہیں بہن نہیں دوست سمجھتا ہوں ــــ"

"اور میں نے بھی ہزار بار آپ کو بتایا ہے کہ کاشی جی بھی مجھے بہن سے زیادہ دوست سمجھتے ہیں، مگر ایسی باتیں انہوں نے میرے ساتھ کبھی نہیں کیں ــــ"

"وہ تمہیں اَتم کے نام سے چھیڑا نہیں کرتا تھا ــــ؟"

"اوہ ــــ!" دھنک نے اک شرمیلی سی ادا کے ساتھ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے "وہ تو اور بات ہے ــــ اَتم کی چھیڑ تو . . . ." وہ خاموش ہو گئی، فقرہ بھی مکمل نہیں کیا

"ہاں ہاں کہو ــــ"

"کچھ نہیں ــــ" اس نے ہاتھ ہٹائے ــــ بڑی خوب صورت سی، شرمیلی سی اور من کو موہ لینے والی مسکراہٹ اس کے آتشیں لبوں پر تھی اور اس کی خمار آلود آنکھوں میں اک ایسی چمک تھی جس نے اس کے حسن کو کئی گنا بڑھا دیا ــــ شہزاد گاڑی سٹارٹ کرنا بھی جیسے بھول گیا ــــ اس کی آنکھوں میں اس کے چہرے کو تکے ہی جا رہا تھا ــــ

"دیر ہو رہی ہے ــــ" دھنک نے رُخ دوسری طرف پھیر لیا ــــ

"اوہ ــــ!" اس کے احساس دلانے پر شہزاد ہوش میں آیا ــــ پھر جلدی سے گاڑی سٹارٹ کر دی ــــ "اَتم تمہیں بہت پسند ہے ــــ؟"

"جی ــــ؟" شہزاد کے اس سوال پر دھنک نے تعجب سے اسے دیکھا ــــ

"میں پوچھ رہا تھا کہ کیا اَتم تمہیں بہت پسند ہے ــــ؟"

دھنک نے پھر بڑے غور سے اسے دیکھا ــــ وہ اسے چھیڑ تو نہیں رہا تھا ــــ بالکل

سنجیدہ تھا اس وقت —— وہ بھی سنجیدہ ہو گئی ——

"پسند کو کیا پوچھتے ہیں شہزاد بھائی —— اب پسند ناپسند کی بات رہ ہی نہیں گئی"

"کیوں —— ؟"

"آپ نے اک دوست کی طرح بات کی ہے تو میں بھی اسی بے تکلفی سے بلا جھجک جواب دے رہی ہوں، ہماری منگنی کو شہزاد بھائی! گویا سینکڑوں برس گزر گئے ہیں اور آپ آج پوچھ رہے ہیں —— ؟" وہ مسکرائی —— اس کے گلابی گلابی ہونٹوں کے درمیان سفید چمکیلے دانت بجلی کی طرح کوندے۔

"کیا اس منگنی کو تم پرانے زمانے کی اک فرسودہ رسم نہیں سمجھتیں —— ؟"

"نہیں نہیں —— " وہ یکدم تڑپ سی اٹھی —— "اس منگنی نے تو مجھے ایسے جذبے بخشے ہیں شہزاد بھائی! کہ میرا ذہن، میرا دل، عجیب سی روشنیوں سے معمور ہو چکا ہے —— میں نے خدا کی عبادت کرنا سیکھ لیا ہے شہزاد بھائی!"

"اتنی تمہیں آثم سے محبت ہے —— ؟"

"آپ کی سوچوں سے بھی بہت زیادہ ——"

"عجیب سی بات ہے نا —— اک ان دیکھے اور انجانے انسان کو تم اس قدر چاہتی ہو ——"

"خدا کو بھی تو کسی نے نہیں دیکھا، مگر سب اس کی پرستش کرتے ہیں —— اور آثم میرے مجازی خدا ہیں ——"

"بہت خوش قسمت ہے آثم ——"

"میں سمجھتی ہوں میں خوش قسمت ہوں —— وہ بہت اچھے ہیں شہزاد بھائی ——!"

اور آج —— شہزاد نے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا —— اس نے آج تک کوئی سہیلی نہیں بنائی تھی —— اس کا کوئی رازدار ساتھی نہیں تھا —— اکثر اس کا دل چاہتا وہ کسی کے ساتھ آثم کی باتیں کرے —— شہزاد اتنا مخلص انسان تھا —— ان کے پورے خاندان کا محسن —— اس نے دوستانہ انداز میں یہ ذکر چھیڑا تو دھنک کے دل کی باتیں، خوب صورت جذبوں کی کہانیاں آرزوؤں اور امنگوں کے قصے زبان پر آ کر نغموں کی طرح تھرکنے لگے —— شہزاد نے گاڑی کی

رفتار بہت کم کر رکھی تھی —— چپ چاپ وہ اس کی زبان سے نکلنے والا اک اک لفظ بڑے غور سے سنے جا رہا تھا اور دھنک اپنے خلوص و وفا بھرے جذبوں کی، اپنی محبت کی اور آثم کے ساتھ اتھاہ پیار کی کہانی میں ڈوبی ہوئی تھی —— اسے نہ وقت کا احساس تھا اور نہ کوئی اور خیال —— کہ وہ کس لئے گھر سے نکلی تھی —— اور پھر کہاں کہاں اسے جانا تھا ——

اس کے چہرے پر عبودیت کا نور تھا —— اس کی آنکھوں میں محبت کی جوت تھی —— پتلے پتلے گلابی گلابی ہونٹ تبسّم کی بجلیاں گرا رہے تھے —— باتیں کرتے وقت لمبی لمبی انگلیوں والے اس کے نازک و سپید ہاتھ بڑے دلفریب انداز میں حرکت کر رہے تھے —— اور شہزاد کی نگاہیں راستے کے بجائے اس کے انتہائی دلنشیں پیکر پر جمی تھیں ——

"ہائے —— !" یکدم ہی دھنک کی چیخ سی نکل گئی —— شہزاد چونکا —— بالکل سامنے آنے والی گاڑی سے چند فٹ کا ہی فاصلہ رہ گیا تھا، جب شہزاد نے اپنی گاڑی کو بریک لگائے ایک دم بریک لگنے سے دھنک کی پیشانی اگلی سیٹ کے ساتھ جا ٹکرائی —— شہزاد گھبرا اٹھا کر پیچھے مڑا ——

"چوٹ تو نہیں آئی —— ؟"

"اس بار تو بچ گئی ——" دھنک پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرائی ——

"تمہارے آثم کی باتوں نے چوٹ لگائی ہے ——" شہزاد شوخی سے بولا ——

"یہ تو اپنا اپنا خیال اور اپنی اپنی سوچ ہے۔ شہزاد بھائی!" دھنک بھی اسی کے سے شوخ انداز میں بولی —— "میرے خیال میں ان کا ذکر میرے ہونٹوں پر نہ ہوتا تو شاید زیادہ لگتی —— انہیں کے لئے بچ گئی —— ان کی جو ہوں ——"

"اوہ —— !" شہزاد نے سیٹی بجا کر پھر گاڑی سٹارٹ کر دی ——

"یہ آپ کہاں جا رہے ہیں —— ؟"

"مجھے بھی معلوم نہیں —— راستہ کھو بیٹھا ہوں شاید ——"

"اتنے سالوں سے اس شہر میں رہ رہے ہیں —— پھر بھی راستہ کھو بیٹھے ہیں"

"بعض اوقات انسان وہ راستے بھی کھو بیٹھتا ہے جن پر ساری زندگی چلتا رہا ہو ——"

"میرا خیال ہے آپ اتنے غبی نہیں ہیں ——"

"مذاق مت اڑاؤ —— اپنی ہی ذہانت سے کھویا ہوا راستہ تلاش بھی کروں گا، تم سے نہیں پوچھوں گا ——"

"مجھ سے پوچھا بھی تو کوئی سراغ نہیں ملے گا، آپ تو صرف راستہ کھو بیٹھے ہیں اور ہم شہزاد بھائی جانے کب سے خود کو ہی کھوئے بیٹھے ہیں ——"

"بس بھی کرو اب معرفت کی باتیں ——" شہزاد کا لہجہ جانے کیوں یکدم ہی تلخ ہو گیا۔ دھنک نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ——

"کیا ہوا —— ؟"

"کچھ نہیں ——" شہزاد سٹپٹایا —— پھر جلدی سے نرم سی آواز میں بولا —— "تمہاری باتوں میں ایسا کھویا کہ مجھے بھی وقت کا اندازہ نہ رہا —— دکانیں تو اب بند ہو گئی ہوں گی ——"

"دیکھ لیتے ہیں ——"

"مگر شاپنگ سنٹر یہاں سے بہت دور ہے —— جاتے جاتے یقیناً بند ہو جائیں گی ——"

"پھر اب سہیلہ کے گھر ہی چلتے ہیں —— وہاں بھی تقریب شروع ہو چکی ہو گی ——"

"ارے! اس کے لئے تحفہ خریدا تھا —— وہ تو لینا یاد ہی نہیں رہا ——"

"خریدا تھا تحفہ —— ؟"

"ہاں ——"

"کہاں ہے —— ؟"

"اپنی جھونپڑی میں ——" جہاں وہ رہتا تھا اسے ہمیشہ جھونپڑی کہا کرتا تھا۔

"تو لے لیتے ہیں وہاں سے —— کس طرف ہے آپ کی جھونپڑی ——"

"خوش قسمتی سے اسی طرف —— پہلے وہ آئے گی پھر سہیلہ کا گھر ——"

"یہ بھی اچھی بات ہے ——"

شہزاد نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی —— دھنک جلتی بتیوں کو تیزی سے ایک دوسری کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھنے لگی —— کتنا خوب صورت نظارہ تھا —— ! وہ دیکھے

ہی گئی —— اور پھر —— اس وقت چونکی جب گاڑی کو بریک لگی۔

"سہیلہ کا گھر آ گیا —— ؟"

"نہیں —— ابھی تو میری جھونپڑی آئی ہے —— آؤ گی دیکھو گی —— ؟ تم نے اس غریب مسافر کا مسافر خانہ کبھی نہیں دیکھا۔"

"آپ بھی تو کئی حصوں میں بٹے ہوئے ہیں —— ایک آپ کا دفتر ہے —— ایک جہاں ہم رہتے ہیں —— اسے بھی اپنا گھر کہتے ہیں —— ایک یہ آپ کی جھونپڑی ——"

"گھر اصل میں وہی ہوتا ہے جہاں رین بسیرا ہو، تمہارے والے گھر میں میرا صرف کھانے پینے کا انتظام ہے —— دفتر میں مقدموں کی فائلیں اور یادداشتیں وغیرہ —— نہ وہاں کبھی رات گزاری ہے نہ وہاں —— یوں —— سمجھو یہ جھونپڑی ہی میرا غریب خانہ ہے —— چلو آؤ نا ——" گاڑی سے نکل کر اس کی سمت والا دروازہ شہزاد نے کھولا ——

"لیکن اس وقت —— ؟" شام گہری ہو گئی تھی —— دھنک جھجکی —— زبان سے صاف انکار بھی نہ کر سکی —— بہانہ ہی بنایا —— "پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے مزید ہو جائے گی ——"

"دو منٹ کی تو بات ہے، اتفاق سے آئی ہوئی ہو اب ——" شہزاد نے جھک کر اس کا ہاتھ تھام لیا —— "چلو آؤ ——"

"اچھا اچھا ——" دھنک جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے باہر نکل آئی —— شہزاد جلد جلد گاڑی لاک کرنے لگا ——

"ابھی دو منٹ میں تو ہمیں واپس آ جانا ہے، گاڑی کیوں لاک کر رہے ہیں —— ؟"

"چور لٹیروں کے لئے اک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے ——" دھنک قائل ہو کر اس کے پیچھے پیچھے اس کی اس چھوٹی سی رہائش گاہ میں داخل ہو گئی، جس کے پورچ میں گاڑی آ کر رکی تھی —— برآمدے سے گزر کر وہ اک کمرے میں پہنچے —— قمقمہ روشن ہوتے ہی دھنک چونک سی اٹھی وہ اک بے حد خوب صورتی سے آراستہ کی ہوئی خواب گاہ میں کھڑی تھی —— بیڈ پر مخملیں نیلی چادر بچھی تھی —— نیلے اور سرخ رنگوں کے امتزاج نے اس قالین کو بے حد خوشنما بنا دیا تھا جو اس کمرے میں بچھا تھا —— اسی رنگ کے ریشمی پردے کھڑکیوں میں سرسرا رہے تھے۔

"واہ! آپ کا ذوق تو بڑا نفیس ہے ــــ یہ تو آج ہی مجھے پتہ چلا ــــ" دھنک نے بڑے خلوص و اپنائیت سے داد دی ــــــ

"تم نے کبھی یہیں دیکھنا گوارہ ہی نہیں کیا ــــ ورنہ دھنک! ہم ایسے برے بھی تو نہیں ــــ"

"یہ آپ نے کیسے کہہ دیا کہ کبھی دیکھنا گوارہ نہیں کیا اور آپ برے ہیں ــــ آپ تو شہزاد بھائی بے حد اچھے انسان ہیں ــــ اتنے ــــ کہ کوئی کم ہی ایسا ہوگا ــــ"

"شکریہ ــــ آؤ بیٹھو ــــ"

"دیر ہو رہی ہے ــــ"

"دیر ہو رہی ہے تو ہونے دو ــــ ہماری دھنک پہلی بار ہمارے گھر آئی ہے ہم بھلا اسے یوں سوکھے منہ جانے دیں گے ــــ؟"

"لیجئے ــــ" وہ زور سے ہنس پڑی ــــ "آپ تو پرانے لوگوں کے سے تکلفات میں پڑ گئے ــــ"

"ارے بھئی تکلفات کون سے ــــ؟" شہزاد نے بڑی بے تکلفی سے دھنک کو بیڈ کی طرف دھکیل دیا ــــ "بیٹھو چپ کر کے ــــ"

"مگر ــــ" دھنک نے کچھ کہنا چاہا ــــــ

"مگر وگر کچھ نہیں ــــ" شہزاد نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا ــــــ

دھنک اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ــــ اب تو کافی رات پڑ گئی تھی اور باہر ہُو کا عالم تھا۔ تاریکی اور سناٹا ــــ! دھنک نے گھبرا کر پردہ چھوڑ دیا ــــ شہزاد بھائی کتنی سنسان جگہ پر رہتے تھے، پتہ نہیں انہیں ڈر کیوں نہیں لگتا تھا ــــ ان کی جگہ وہ ہوتی تو ایک ہی دن میں ڈر ڈر کر انتقال کر جاتی، یوں پھر دوسری رات اس گھر میں گزارنے کی نوبت ہی نہ آتی ــــ

کھڑکی سے ہٹتے ہی وہ مڑی تو سامنے والی دیوار پر آویزاں کئی تصاویر اسے نظر آئیں ــــ جانے کس کی تھیں ــــ؟ فاصلہ اتنا تھا پہچان نہ پائی ــــ یہ جاننے کے لئے قریب جانے ہی لگی تھی کہ داہنی دیوار کی طرف اس کی نگاہ اٹھ گئی ــــ وہاں بھی کئی تصویریں لگی تھیں، پھر اس نے ارادتاً بائیں

سمت والی دیوار کی طرف دیکھا ــ وہاں بھی تصویریں تھیں ــــــ

"شہزاد بھائی بڑے چھپے رستم نکلے ــــ ہمیں آج تک بتایا ہی نہیں ــــ" شکل تو دور سے نہیں دیکھ پائی تھی، البتہ یہ اندازہ اسے ہو گیا تھا کہ وہ سب تصویریں کسی لڑکی کی تھیں ــــ کون تھی وہ ــــ؟ تجسس اسے پھر کھینچنے لگا تھا کہ شہزاد اندر آ گیا ــــــ

"واہ واہ شہزاد بھائی! ہم نے اپنے دل کی ساری باتیں آپ سے کریں اور آپ نے اتنی غیریت برتی کہ ہمیں آج تک بتایا ہی نہیں کہ آپ کی زندگی میں کوئی لڑکی بھی آئی ہے ــــ"

"اسی لئے تو دھنک! آج تمہیں یہاں لایا ہوں ــــ آج میں بھی تمہیں اپنے دل کی باتیں سناؤں گا ــــ"

"اور سہیلہ کی منگنی ــــ؟"

"وہ بھی ہو جائے گی ــــ" شہزاد نے بے پرواہی سے کہا ــــ "میں نے خود تمہارے لئے چائے بنائی ہے ــــ"

"آپ نے ــــ؟"

"ہاں ــــ"

"حد ہو گئی ــــ مجھے کہتے ــــ"

"بہت عرصہ تم نے بنائی ہے اور پلائی ہے ــ آج تم میرے گھر آئی ہو ــــ یہ میرا فرض ہے ــ تم بیٹھو ــــ دودھ گرم ہو گیا ہوگا ــــ چائے لے آؤں ــــ"

"نہیں نہیں ــــ میں لاتی ہوں ــــ" دھنک جانے لگی تو شہزاد نے اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا ــــــ

"کہا نا ــــ آج کی رات تم میری مہمان ہو ــــ"

"اچھا اچھا ــــ" دھنک نے کندھے سکوڑے ــــ "نہیں جاتی ــــ آپ مجھے چھوڑ تو دیجئے!"

اس کی نرم سی گرفت سے وہ جلدی سے نکلی ــــ شہزاد چائے لینے چلا گیا ــــــ

دھنک کی نگاہیں ایک بار پھر کمرے کے چاروں اطراف گھوم گئیں، تب جذبۂ تجسس کشاں کشاں اسے ان تصویروں تک لے گیا ــــ

"اُوہ ——!" دھنک کو یکدم چکر سا آگیا —— یہ کیا معاملہ تھا ——؟ وہ سب تصویریں تو اسی کی تھیں —— اس دیوار پر بھی —— اس دیوار پر بھی۔ کچھ اس کی بچپن کی —— کچھ تیرہ چودہ سال کی عمر کی —— جو شہزاد کا کیمرہ لے کر کاشف نے اتاری تھیں۔ پھر اس کے بعد اس کے عین عالم شباب کی بھی تھیں —— جو کاشف نے ملازمت ملنے کی خوشی میں اتاری تھیں —— سبھی تصویریں تھیں —— لیکن —— کاشف اور امی کی کوئی تصویر نہیں تھی —— ان کی بھی تو ساتھ اتری تھیں ——

"کیوں ——؟ کیوں ——؟؟ آخر کیوں ——؟؟؟" وہ چکراتے سر کو تھامتے ہوئے بیڈ پر جا بیٹھی ——

"کیا ہوا ——؟" شہزاد کے ہاتھ کا دباؤ کندھے پر محسوس کر کے اس نے ہاتھوں میں سے سر نکالا —— "یہ —— یہ میری تصویریں —— یہ سب یہاں کیسے آگئیں ——؟"

"مگر تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو ——؟ تصویریں ہی تو صرف ہیں ——" شہزاد زور سے ہنس پڑا۔ پھر اس کے پاس نیچے قدموں میں بیٹھتے ہوئے اس نے دھنک کے دونوں کپکپاتے ہاتھ تھام لیے —— "تم نے اپنے دل کی ساری باتیں مجھ سے کر لیں اور کیا اب میری داستان نہیں سنو گی ——؟"

"شہزاد بھا . . . ."

شہزاد نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا —— "جس طرح میں نے خاموشی سے تمہارے جذبوں کی، تمہاری محبت کی کہانی سنی ہے اسی طرح اب میری تمہیں سننا ہو گی ——" شہزاد نے اس کی خوف سے پھیلی پھیلی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ——

تم نے تو اک ان دیکھے، انجانے انسان کو چاہا ہے، اک خیال، اک نام سے محبت کی ہے مگر میں نے جیتے جاگتے، حسن و نخرے بکھیرتے، رنگ و نور سے سجے ایک پیکر کی پرستش کی ہے —— میری کہانی کا آغاز بھی تمہاری ہی طرح برسہا برس پہلے سے ہوتا ہے، مگر میری داستان حقیقی ہے کہ میں نے ان کھلتے پھولوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ——" شہزاد نے ساکت بیٹھی دھنک کے ہونٹوں کو بڑے پیار سے اپنی انگلی سے چھوا۔

"تمہاری آنکھوں کی ان روشن قندیلوں نے میری آنکھوں کے راستے اتر کر سدا میرے دل کی تاریکیوں کو منور کیا ہے ——" شہزاد نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا —— "تمہارے تمتماتے گالوں کے ان لپکتے شعلوں نے ہمیشہ میرا صبر و قرار جلایا ہے ——" اس کے چمکیلے رخساروں کو دونوں ہاتھوں میں لے کر وہ کئی لمحے دیکھتا رہا ——

"تمہارے نازک اور سرخ سرخ لبوں پر کوندتی تبسم کی بجلیاں میرے ہوش و حواس پر گرتی رہیں اور میں سب کچھ سہتا رہا —— مگر زبان سے کبھی ایک لفظ نہ نکالا ——" شہزاد نے جیب میں سے ایک اور تصویر نکال کر دھنک کے سامنے کر دی ——

اس کی زبان قوت گویائی کھوئے بیٹھی تھی لیکن جب اس تصویر پر نگاہ پڑی تو بے اختیار چلا پڑی —— "نہیں نہیں —— یہ دھوکا ہے —— میں نے آپ کے ساتھ کبھی کوئی تصویر نہیں اتروائی —— یہ فریب ہے —— یہ"

"چیخو نہیں دھنک! میں تمہیں بلیک میل تو نہیں کرنے والا —— میں تو صرف اپنے جذبوں کی تصدیق کے لیے تمہیں یہ تصویر دکھا رہا ہوں —— یاد کرو —— کاشف نے میرا کیمرہ لے کر تصویریں اتاری تھیں، اس دن تم سب کے ساتھ میں بھی کھڑا ہو گیا تھا —— یہ اسی گروپ میں سے تمہاری اور اپنی میں نے علیحدہ کرائی ہوئی ہے —— صرف اپنے جذبات کی تسکین کی خاطر —— فکر نہ کرو —— اس تصویر کو میرے سوا کبھی کسی نے نہیں دیکھا —— اور اس کمرے میں بھی کبھی کوئی نہیں آیا، میں نے تمہیں ہمیشہ غیر کی نگاہ سے چھپا کر رکھا ہے —— اپنے دل میں —— اپنی نگاہوں میں —— ان تصویروں میں تم میری ہو —— صرف میری ——" شہزاد نے بڑی عقیدت سے، بڑی محبت سے اور عجیب سی وارفتگی سے اس کی تصویر کو چوم لیا ——

"محبت کرنے والا انسان بہت حاسد ہوتا ہے —— میں تم سے محبت کرتا تھا —— نہیں محبت بہت چھوٹا جذبہ ہے، میں تو تمہاری پرستش کرتا تھا اور میرے ہی سامنے تمہاری امی اور کاشف تمہیں کسی اور کا کہتے تھے، میرے دل نے بڑے ستم سہے ہیں دھنک! میری داستان میں آنسو ہی آنسو ہیں، آہیں ہی آہیں ہیں —— تم آثم کی منگیتر ہو —— تمہاری محبت، تمہاری چاہت کامیاب ہے مگر مجھے صرف اور صرف محرومی ہی ملی ہے —— ایسی محبت دنیا میں کسی کو کسی سے نہ ہو گی جس طرح میں نے تم سے کی ہے ——

میں پروانہ وار تم پر نثار ہو گیا ہوں، میں نے کاشف پر، تمہاری امی پر، تمہارے سسرال والوں پر بہت کچھ خرچ کیا ہے — صرف تمہاری خاطر — صرف تمہاری طلب میں — تمہاری چاہت میں" لمحہ بھر کے لئے شہزاد خاموش ہو گیا — بڑے غور سے اس نے دھنک کے پورے وجود کو دیکھا پھر مسکرایا —

"اور — میں بھی اک انسان ہوں — اتنا کچھ دے کر صرف آج کی اک رات کی تم سے بھیک مانگتا ہوں — تمہارے گورے بدن کی سوندھی سوندھی باس سے من میں لگی صدیوں کی اس پیاس کو مٹانا چاہتا ہوں —"

"شہزاد بھائی — !" اس کے ساکت وجود میں اک اضطراری سی حرکت پیدا ہوئی، وہ بڑے زور سے چیخی — "میں آپ کو بھائی سمجھتی ہوں —"

"مجھے بھائی مت کہو — آج کی رات تمہارے اور میرے درمیان بھائی بہن کا رشتہ نہیں ہے — یہ دیکھو تم نے عروسی جوڑا پہنا ہوا ہے اور میں دولہا بنا ہوا ہوں، آج ہماری سہاگ رات ہے — رونمائی میں تمہارے حضور اک حقیر سا نذرانہ پیش کرنے کے لئے یہ دیکھو میں نے جھومر خرید لا ہے تمہاری روشن پیشانی کے افق پر یہ میری محبت کا چاند بن کر جگمگائے گا —" شہزاد نے جیب میں سے جھومر نکال کر اس کی پیشانی پر لگا دیا۔ دھنک نے اسے نوچ پھینکنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو شہزاد نے جلدی سے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ لیا —

"میں آپ کے دوست کی بہن ہوں، کچھ تو سوچئے —" دھنک نے اٹھنے کی کوشش کی شہزاد نے اسے بازوؤں میں بھر کر پھر بٹھا دیا —

"میں نے دوستی کا حق پوری طرح ادا کر دیا ہے دھنک — میں اس کے ہر مشکل وقت پر کام آیا ہوں — میں نے پوری تن دہی اور ایمانداری سے اس کا مقدمہ لڑا ہے — وہ کل بری ہو جائے گا —"

"آپ میری امی کو ماں کہتے ہیں —" اس نے اس کے دل میں ماں ایسے پاکیزہ جذبے کا احترام اور احساس پیدا کرنے کی کوشش کی —

"ماں کی حق ادائی میں بھی میں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اسے اچھے سے اچھا پہنایا ہے، اچھے

سے اچھا کھلایا ہے — اس کی ہر خواہش، ہر تمنا پوری کی ہے — اس کے بیٹے کو نوکریاں دلائیں اسے قتل کے الزام سے بری کرایا — اس کی بیٹی کا جہیز مہیا کیا — بڑا خوب صورت، بڑا قیمتی — اور اسے کیا چاہیئے — ؟"

عجیب سی مسکراہٹ، جو تلخ بھی تھی، قدرے نرم بھی، شہزاد کے ہونٹوں پر پھیل گئی —

"اور — اس کے بدلے میں، میں نے کچھ زیادہ کی طلب تو نہیں کی — صرف ایک رات تمہاری زندگی کی جوانی کی ہزاروں راتوں میں سے صرف ایک رات — اپنی چاہتوں کے اظہار کے لئے — اپنی تڑپتی محبت کی اک ذرا سی، ذرا سی تسکین کے لئے — اپنی تشنہ آرزوں کی وقتی تکمیل کے لئے — چند گھڑیاں ہے چند ساعتیں — !!"

"شہزاد بھائی !" پنجرے میں بند پنچھی کی طرح پھڑ پھڑا پھڑ پھڑا کر آخر وہ بے بس ہو گئی، تو آنسوؤں سے فریاد کرنے لگی — "میں کسی کی امانت ہوں اور میں نے خدا کی طرح اس کی عبادت کی ہے — آپ میرا اور اس کا یہ رشتہ مت توڑیئے — مجھے یہ بڑا عزیز ہے یہ ٹوٹا تو میں بھی ٹوٹ جاؤں گی —"

"تمہارا اور اس کا یہی رشتہ تو میں توڑنا چاہتا ہوں — وہ کیوں اتنا خوش قسمت ہے کہ تم اسے دیکھے ملے بغیر اس کی پرستش کرتی ہو — اور میں کیوں اتنا بدقسمت ہوں کہ مجھ میں کوئی عیب بھی نہیں — میں نے ہمیشہ تم پر دھن، دولت، تن من نچھاور ہی کیا ہے، پھر بھی تم نے کبھی نگاہ اٹھا کر دیکھنا گوارہ نہیں کیا مجھے کبھی کسی توجہ کے قابل ہی نہیں سمجھا"

تب اس نے دھنک کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا جھکا ہوا، آنسو بہاتا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا

"میری طرف دیکھو — میں خوب صورت نہیں ہوں — ؟ شاید تمہارے آثم سے زیادہ ہی ہوں گا — میرے پاس دولت نہیں ہے — ؟ یقیناً تمہارے آثم سے بہت زیادہ ہو گی میرے پاس تعلیم کی کمی بھی نہیں ہے — آثم سے بہتر اور کارآمد ڈگری میرے پاس ہے — یوں میرا خیال ہے، میں کسی بھی لحاظ میں اس سے کم نہیں ہوں — نہیں ہوں نا — ؟" اس نے دھنک کی ٹھوڑی کو ہلکا سا جھٹکا دیا —

"یہ مجھ سے مت پوچھیئے — میرے والدین نے جس کے ساتھ میرا ناطہ جوڑ دیا میں اسی

کو سب کچھ سمجھنے ماننے لگی۔ میری محبت اسی کے لئے وقف ہو کر رہ گئی، میری چاہت کی زبان پر اسی کا نام چسپاں ہو گیا۔" میں اسے ہی اپنا مجازی خدا سمجھنے لگی ہے"

"تو پھر دھنک! میں تمہیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تمہارے حضور تو صرف اپنے جذبات کی شدت کا اظہار کروں گا۔ اپنی محبت کا نذرانہ پیش کر کے تمہیں اپنے پیار کی اتھاہ گہرائیوں میں اتار کر ——— البتہ ——— یہ رات ——— ان لوگوں سے ضرور انتقام لے لے گی، جنہوں نے میری زندگی کا اک اک پل جہنم کی دہکتی آگ کے سپرد کئے رکھا ——— مجھ سے ہر مشکل کا حل چاہا ہر مصیبت سے نجات کی طلب کی، ہر قسم کی آسائش کی خواہش کی مگر ——— میرے جی کا حال کوئی نہ جان سکا ——— میرے دل کے اندر کسی نے اتر کر نہ دیکھا ——— میرے جذبوں کو کسی نے نہ پڑھا، اپنا مطلب نکالتے رہے اور میری طرف سے نگاہیں پھیرے رکھیں ——" اس نے جھک کر دھنک کی آنسوؤں بھری آنکھوں میں جھانکا ———

"تمہیں آنکھ کھولتے ہی متاعِ عنبر بنا دیا اور میں ——— میں اک بھوکا، صدیوں کا بھوکا، سامنے پڑی گرم گرم بریانی اور زرترانے حلوے کی قاب کو دیکھ دیکھ کر ترستا رہا، ترپتا رہا ——— یہ کہاں کا انصاف ہے ——— یہ تو اک مجبور کے انسان کے ساتھ نہ صرف زیادتی ہے بلکہ ظلم ہے سراسر ———! اور آج ان سب سے انہیں مظالم کا انتقام میں لوں گا ———"

شہزاد کی آنکھوں میں کسی خوف ناک ارادے کی بھیانک سی چمک تھی ——— دھنک کانپ گئی ———

"شہزاد بھائی!" شکرے کے قابو میں آئی معصوم فاختہ نے لرزتے کانپتے ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیئے ——— "ایسا مت کیجئے ——— میں آپ کے ساتھ شادی کر لوں گی ——— خدارا میری عزت کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیے ———"

"محبت آتم سے کرتی ہو ——— شادی مجھ سے کرو گی ——— ؟" وہ بڑے زور سے ہنسا ——— نہُں ——— تمہاری شادی آتم سے ہی ہو گی ——— کیونکہ تم اس کی بچپن کی منگیتر ہو ——— اٹھارہ سال پہلے کا کیا ہوا رشتہ ——— بہت مضبوط ——— یہ ٹوٹ نہیں سکتا ——— اور ———" اب شہزاد نے وحشیانہ انداز میں اک قہقہہ لگایا ———

"اتنے سال میں نے جو جور و ستم سہے ہیں ——— تم سے شادی کر لوں تو پھر آخر ان کا انتقام کیسے لوں گا ——— کاشف سے، تمہاری ماں سے، آتم سے ——— کیسے ان سب سے انتقام لوں گا ——— ؟؟ کیسے لوں گا ——— ؟؟؟" اس نے اس وحشت میں اوپر تلے کئی قہقہے لگا ڈالے پھر ——— یکا یک خاموش ہو گیا ——— چند لمحے چپ چاپ بیٹھا سسکیاں بھرتی دھنک کو دیکھتا رہا۔

"تمہیں تو دھنک! میں کچھ بھی نہیں کہہ رہا۔ تم سے تو مجھے محبت ہے ——— تمہیں تو میں پیار کرتا ہوں تم کیوں روتی ہو ——— ؟" محبت بھری نرم سی آواز میں بولتے ہوئے شہزاد نے اسے بازوؤں میں بھر لیا ——— "تم تو دھنک میرا دین، میرا ایمان ہو ——— میں نے گزری زندگی کے ہر ہر لمحے تمہیں پوجا ہے ——— تم میرے دل میں ہر وقت مقیم رہی ہو ——— سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی تم میری آنکھوں میں بسی رہی ہو ——— آتی جاتی سانس کے ساتھ میری زبان پہ تمہارا نام رہا ہے"

دھنک تڑپی، مچلی ——— اس نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی پوری کوشش کی چیخی ——— چلائی ——— اس نے شہزاد کے سینے میں مکے مارے ——— اس نے اس کی چھاتی پر اپنی پوری قوت سے ٹکریں ماریں ——— اس نے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر اس کے بازو زخمی کر ڈالے ——— مگر شہزاد ہنستا ہی رہا اور اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی ———

"زہے نصیب دھنک! میں خوش قسمت ہوں جو تمہارا یہ پھول ایسا نازک سا سر میری چھاتی پر اپنی مہک بکھیر رہا ہے ——— تمہاری یہ تھپیڑوں اور مکوں کی بارش مجھ پر سکون کی پھوار بن برس رہی ہے ——— تمہارے یہ دانتوں کے کچوکے میرے سینے کی کسک کو قرار بخش رہے ہیں ——— مجھے نوچ ڈالو دھنک! مجھے ادھیڑ کر رکھ دو ——— میری بوٹی بوٹی کاٹ کر علیحدہ کر دو ——— مگر ——— یوں میرے ساتھ لگی رہو ——— میرے بازوؤں میں سمٹی رہو ——— تمہارا لمس مجھے حیاتِ جاوداں بخش رہا ہے ——— تمہاری خوشبو میری پوری زندگی کو معطر کئے دے رہی ہے"

دھنک نے تھک کر غیر ہموار سے سانس لیتے ہوئے ارد گرد دیکھا ——— وہاں آس پاس کوئی ایسی بھاری چیز بھی تو نہیں تھی جو اٹھا کر اس کے سر پر دے مارتی ——— تب وہ چیخی ——— بہت زور سے چیخی ——— اپنی ساری قوتیں مجتمع کر کے چیخی ———

"تم نے کھڑکی میں سے دیکھا نہیں تھا کہ کس مقام پر یہ گھر ہے ——— ؟ تمہاری آواز کوئی نہیں

سنے گا — ناحق اپنے اس نازک اور سریلے گلے کو تکلیف پہنچا رہی ہو میری جان!"

"خبیث! کتے —! تم ذلیل ہو — کمینے ہو —"

"دو چار گالیاں اور دھنک! میں اسی قابل ہوں — میں تم سے محبت جو کرتا ہوں —"

"یہ محبت ہے کمینے انسان —؟"

"یہ تو اپنا اپنا طریقۂ اظہار ہے —" شہزاد نے اس کی ساڑھی کا پلو کھینچ ڈالا —

"نہیں نہیں —" وہ ایک بار پھر پورے زور سے چلائی — "تم پر خدا کا قہر ٹوٹے —"

"اتنے سال جو کچھ میں نے سہا ہے خدا کا قہر اس سے کچھ زیادہ نہیں ہوگا — کوئی ایسی بددعا دو دھنک! جس کا مزہ میں نے پہلے نہ چکھا ہو — تمہاری مہربان محبت نے مجھے ہر ستم سے نوازا ہے —" شہزاد نے کھینچ کر اس کی ساڑی اتار دی — اس کے بلاؤز کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اسے چاک کر ڈالا — دھنک کا چاندنی ایسا چمکیلا اور پر شباب جسم برہنہ اس کے سامنے تھا۔ اور وہ للچائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا —

"صرف ایک رات ہی تو تم سے مانگی ہے — باقی ساری زندگی آثم کے ساتھ عیش و طرب میں گزارنے کو تم آزاد ہو —!"

دھنک نے کچھ کہنا چاہا — شہزاد نے جلدی سے جھپٹ کر اسے اپنی گرفت میں لیتے ہوئے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر پیوست کر دیئے — اور اب دھنک چیخ بھی نہ سکتی تھی — اپنی عزت و عصمت اس بھیڑیئے سے بچانے کے لئے اس نے ہر ممکن جدوجہد کی — مگر اس کی ہر کوشش رائیگاں گئی — ہر پکار ہر صدا بصحرا ثابت ہوئی —

نہ شہزاد پر خدا کا کوئی قہر یا غضب ٹوٹا اور نہ کوئی اس کی عزت بچانے آیا — وہ اسے نوچتا کھسوٹتا رہا۔ اور وہ تڑپتی رہی سسکتی رہی — وہ اس کے بے پناہ حسن کو لوٹتا رہا اور وہ اپنے بچاؤ کی تمام تر تگ و دو کے باوجود لٹتی رہی — اور — رات تاریک سے تاریک تر ہوتی چلی گئی — اس کے مقدر کی طرح —!!!

○

رات [illegible] ی لیکن اس کے مقدر سے زیادہ نہیں — آج سردی بھی معمول سے کچھ زیادہ تھی — لیکن اسے کوئی احساس نہ تھا — وہ تو بس اپنے تاریک مقدر ہی کے متعلق سوچے جا رہا تھا یہ سب کچھ تو اک لمحے کے لئے بھی کبھی اس کے وہم و گمان میں نہ آیا تھا — دھنک کے لئے امی بیگم کی چاہت، الفت اور توجہ وہ محض بیٹی سے محرومی کی وجہ سے سمجھتا تھا اور کچھ اس کی ماں اور امی بیگم ایک طویل عرصہ ایک دوسرے کی ہمسائیگی میں رہی تھیں، اس لئے بھی ان میں پیار و محبت بہت تھا — مگر یہ تو اس کے خواب و خیال میں بھی کبھی نہیں آیا تھا کہ امی بیگم نے دھنک کے ساتھ اس کی منگنی کئی سال پہلے کر چھوڑی تھی اور اس کے ساتھ یہ سارا پیار، محبت اور توجہ ہونے والی بہو کے ناطے سے تھا —

اتنے اتنے قیمتی تحائف اور ملبوسات اسے اسی لئے بھیجے جاتے تھے، خود اس کے لئے بھی کئی بار وہاں سے تحفے تحائف آئے، دو سال پہلے دھنک کے ہاتھ کا بنا ہوا سویٹر بھی اسے پہننے کو ملا تھا — بڑے چرچے تھے اس کے — اس کی صاف ستھری بنائی کی ہر وقت تعریفیں ہوتی رہتی تھیں — پھر ہر دم، ہر لمحے اس کے حسن کا اور اس کی اچھی اچھی عادات کا گھر میں ذکر ہوتا رہتا تھا — امی بیگم تو امی بیگم ابا میاں بھی اس کا نام بڑے پیار و محبت سے لیا کرتے تھے — تو — یہ سب کچھ اسی لئے تھا —؟؟

مگر — وہ کیا کرتا —؟ لاکھ دھنک میں کروڑوں خوبیاں تھیں وہ اس کے بے پناہ حسن کا بھی معترف تھا — امی بیگم کے پاس اس کی بے شمار تصویریں تھیں جو اس نے بھی دیکھی ہوئی تھیں واقعی وہ بہت خوب صورت تھی، مگر اس کے باوجود — وہ اپنے دل کا کیا کرتا — کیسے اسے سمجھاتا کہ وہ صنم کے علاوہ کسی اور کو اپنے صنم خانے میں داخل کرنے کو کسی صورت تیار ہی نہ تھا —

اور امی بیگم اپنے فیصلے پر قائم تھیں — دوسرے دن، تیسرے دن، آثم منتیں کر کر کے

ہار گیا، اس نے بے شمار التجائیں کر ڈالیں، مگر امی بیگم پر کسی منت، کسی التجا نے کوئی اثر نہ کیا۔ بہر طور ہی میں انہیں اپنی ناک کٹ جانے کا خطرہ تھا اگر یہ رشتہ ٹوٹ جاتا تو۔۔۔ پھر۔ وہ جان دے سکتی تھیں مگر جو زبان دے چکی تھیں، اس سے بے زبانی نہیں کر سکتی تھیں ۔۔۔ اور۔ وہ اپنے سفید بالوں والے سر کو بیٹے کی نافرمانی کی وجہ سے شرمندگی کے مارے جھکا بھی نہیں سکتی تھیں
آخر آثم نے ان سے اپنی محبت کی بھیک مانگی تو انہوں نے اس کی جھولی میں دھنک کی عزت کا سوال ڈال دیا۔۔۔ اپنے بچپن کے منگیتر کے ساتھ شادی نہ ہونے کی صورت میں اس کی کیسی بدنامی اور رسوائی تھی ۔۔۔

"اشی!" سرگوشی کے ساتھ ساتھ کندھے پر نرم نرم سا لمس محسوس کرتے ہی وہ چونکا۔ اپنے شانوں کے گرد اچھی طرح سیاہ شال لپیٹے صنم اس کے پاس کھڑی تھی ۔۔۔

"تم صنو ۔۔۔ ؟"

"ہاں ۔۔۔"

آثم نے بے اختیار ہو کر دونوں بازو پھیلا دیئے ۔۔۔

"اشی! اشی ۔۔۔ !!" صنم اس کے بازوؤں میں سمٹ کر سسکنے لگی ۔۔۔

"اتنے دن تم کہاں تھیں ۔۔۔ میری صنم ۔۔۔! میری جان ۔۔۔!! میری ہمدم ۔۔۔!!"

"مجھے ممی نے آنے ہی نہیں دیا ۔۔۔"

"دفتر بھی نہیں گئیں ۔۔۔ میری نگاہیں وہاں بھی تمہیں ہی تلاش کرتی رہیں ۔۔۔ اور ۔۔۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ صرف ایک نظر تمہیں دیکھنے کو تمہارا اشی کیسے کیسے تڑپا ہے ۔۔۔!"

"مجھے احساس ہے اشی! پوری طرح احساس ہے۔ کیونکہ میرا اپنا بھی یہی حال ہے۔ مگر میں کیا کرتی۔۔۔ مجبور تھی بہت ۔۔۔ امی بیگم نے ممی کو تمہاری بچپن کی منگنی والی بات کے ساتھ تمہارا انکار اور ضد کا قصہ بھی بتا دیا ہے۔۔۔ تب ممی نے نہ صرف میرا تمہارے گھر جانا بند کر دیا بلکہ دفتر جانے پر بھی پابندی لگا دی،" آثم کے سینے کے ساتھ لگی وہ روتی رہی اور اپنا دکھڑا بیان کرتی رہی ۔۔۔

"اور اب یہاں کیسے آ گئی ہو ۔۔۔ ؟"

نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ دل بہت بے چین تھا اور تم سے ملنے کو تڑپ رہا تھا ۔۔۔ یکایک

میرے دل میں یہ خیال آیا کہ جامن کے پیڑ تلے اس وقت تم ہو گے۔۔۔ دل کی آواز پر لبیک کہتی ہوئی میں چلی آئی۔۔۔ اور تم سچ مچ یہاں موجود تھے ۔۔۔"

"تمہارا دل اس انداز میں میرے متعلق سوچتا ہے کہ جیسے وہ میرے سینے میں دھڑک رہا ہے ۔۔۔ اور خود میرے دل میں بھی وہی کچھ موجود ہوتا ہے جو تم سوچ رہی ہوتی ہو، چاہ رہی ہوتی ہو ۔۔۔ میں سب کچھ جانتا ہوں ۔۔۔ مگر صنم! دلوں کے اس ملاپ کے باوجود یہ سب کیا ہوتا جا رہا ہے۔۔۔! لوگ ہماری جدائی میں کیوں خوش ہیں ۔۔۔ ایسا کیوں چاہتے ہیں ؟"

"والدین کا کہنا ماننا اشی! ہمارا اولین فرض ہے "

"لیکن صنم! یہ کوئی چھوٹی سی بات تو نہیں ۔ نہ ہی ایک آدھ دن کا معاملہ ہے ۔۔۔ مجھے کسی کل چین نہیں آ رہا ۔۔۔"

"میں خود پچھلی کئی راتوں سے سو نہیں سکی ۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، میں تمہارے گھر کو ہی اپنا سمجھتی رہی ہوں، میں نے ابا میاں اور امی بیگم کے ساتھ اپنے والدین سے زیادہ پیار کیا ہے ۔۔۔ میں نے اشی! تمہارے علاوہ زندگی میں نہ کسی اور کو دیکھا ہے، اور نہ کسی اور کا تصور ہی ذہن میں لا سکتی ہوں، مگر پھر بھی میں یہی کہوں گی کہ بہر حال وہ تمہارے والدین ہیں تمہیں ان کی خوشی . . ."

"نہیں صنم! نہیں ۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا ۔۔۔" آثم نے اسے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے اس کے بالوں میں اپنا چہرہ گھسا لیا۔ "تمہارے بغیر میں زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا ۔۔۔ امی بیگم کی منتیں سماجتیں کر کر کے ہار گیا اب ابا میاں سے بات کرونگا ۔۔۔ انہوں نے بھی اگر یہی کچھ کہا۔ میرے جذبات و احساسات کو نہ سمجھا تو . . . . ." وہ خاموش ہو گیا ۔۔۔

"تو کیا ۔۔۔ ؟" صنم نے سر اٹھا کر اسے غور سے دیکھا ۔۔۔ تاریکی میں آثم کے چہرے کے تاثرات تو نہ پڑھ سکی صرف اس کے ہیولے پر نگاہیں جما کر رہ گئی ۔۔۔

"تو پھر میں یہ گناہ کر لوں گا ۔۔۔"

"کون سا ۔۔۔ ؟" صنم نے گھبرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا ۔۔۔

"والدین سے نافرمانی کا ۔۔۔ میں بس تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا ۔۔۔"

"نہیں نہیں ——"

"نہیں نہیں کیا —— ؟" آثم اسی سے الجھ پڑا —— "پھر جان دے دوں —— ؟"

"میں یہ کہہ رہی ہوں کہ جان دے دو ——"

"صاف ظاہر ہے نافرمانی نہیں کروں گا تو موت کو گلے لگا دوں گا —— تمہارے بغیر تو اک پل بھی زندہ نہیں رہ سکوں گا ——"

"آرام سے اثمی! سکون سے —— کچھ اور سوچو —— کوئی اور راہ نکال لو کہ والدین بھی خوش ہو جائیں اور ——"

"امی بیگم کی اور میری خوشی تو ایک ہو نہیں سکتی —— ان کی خوشی دھنک کے ساتھ شادی کر دوں تو تب پوری ہو گی اور میری تم ہو —— بتاؤ، اور کونسی راہ ہو سکتی ہے —— ہے کوئی درمیانی راستہ؟"

"میری اک بات مانو گے —— ؟"

"کہو جانِ عزیز —— ! لیکن یہ مت کہنا کہ امی بیگم کی خواہش پوری کرتے ہوئے دھنک کے ساتھ شادی کر لوں —— یہ میں کسی صورت کر ہی نہیں سکتا —— کیونکہ نہ میں نے زندگی میں کبھی اداکاری کی ہے اور نہ ساری زندگی دھنک کے ساتھ شوہر والی اداکاری کر سکوں گا —— یوں بھی کسی کو دھوکا دینا سب سے بڑا گناہ ہے ——"

"اتنا لمبا لیکچر دے ڈالتے ہو —— میں یہ کب کہنے والی تھی —— ؟"

"پھر بتاؤ کیا کہنے والی تھیں —— ؟"

"ہمارے پاس کرنل صاحب ہیں —— فیدائی ہیں —— تلقین حیدر صاحب ہیں اور چچا صفی اللہ ہیں —— سب بزرگ ہیں —— تجربہ کار ہیں —— دوسروں کے مسائل سلجھانے اور پریشانیاں دور کرنے میں کیسے اچھے اچھے مشورے دیتے رہے ہیں، ہم اپنے متعلق ان سے مشورہ کیوں نہ لیں —— ؟ کچھ بھی ہو ہماری عمر میں جذباتیت کو زیادہ دخل ہو گا اور عقل و دانش کو کم —— کوئی دوسرا ہمیں بالکل صحیح راہ دکھائے گا —— اور اثمی! اس معاملے میں ابا میاں سے بھی تم خود بات نہ کرنا —— کرنل صاحب، تلقین حیدر صاحب کریں گے ——"

"ہاں ٹھیک ہے —— تمہارا یہ مشورہ بالکل درست ہے —— لیکن ——"

"پھر لیکن —— ؟"

"ہاں —— اب لیکن اس لئے آیا ہے کہ —— اگر ان سب نے بھی ایسا ہی کوئی مشورہ دیا کہ مجھے دھنک کے ساتھ شادی کرنا چاہیئے تو —— وہ میں قبول نہیں کروں گا ——"

"لو —— مرغے کی پھر وہی ایک ٹانگ —— !"

"مجھے مرغا کہہ رہی ہو —— ؟" آثم نے ہمیشہ کی طرح یکایک صنم کے بال مٹھی میں جکڑ لیے صنم کھی کھی کر کے ہنس پڑی ——

"تمہیں ہنسی آ رہی ہے اور میری جان پر بنی ہے ——" آثم نے اس کے بالوں کو ایک جھٹکا دیا ——

"پریشان ہونے کی بات نہیں اثمی جان ——" اب صنم یکایک سنجیدہ ہو گئی —— زندہ لوگوں کی زندگیوں میں ایسے مرحلے آیا ہی کرتے ہیں —— انشاء اللہ! ہم نمٹ لیں گے —— ضرور کوئی نہ کوئی بہتری کی صورت نکل آئے گی —— بھلا ہم نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے جس کا بدلہ خدا ہمیں جدا کر کے دے گا ——" صنم نے آثم کے دونوں ہاتھ تھام لیے ——

"ہم نے سچے دل سے ایک دوسرے کو چاہا ہی ہے نا —— یہ گناہ کی بات نہیں، اور خدا بے انصاف بھی نہیں ——"

"تم میری زندگی میں تسلی کی ایسی شمع ہو صنم! جو ہمیشہ روشن رہی ہے —— جب بھی کوئی پریشانی پیش آتی ہے تمہارا وجود مینارۂ نور بن کر میرے سامنے آ جاتا ہے ——"

"اور اب پلیز! اٹھو اور اندر چلو —— کہیں سردی نہ لگ جائے —— جانے کب کے یہاں بیٹھے ہو ——"

"تمہارے عشق نے مجھے ایسے جذبات دے رکھے ہیں کہ سردی گرمی کا احساس ہی مٹ چکا ہے ——"

"اچھا مجنوں میاں!" صنم نے بڑے دلار سے اس کا بازو تھام لیا ——

"خدانخواستہ نمونیہ وغیرہ ہو گیا تو تیمارداری مجھے ہی کرنا پڑے گی ——"

"تو کیا نہیں کرو گی —— ؟"

"خیر کے کلمات منہ سے نکالو ۔۔۔ ویسے تمہاری ہی ہوں اُمّی! اور تمہاری ہی خدمت کے لیے خدا نے مجھے پیدا کیا ہے یہ میرا ایمان ہے ۔۔۔" صنم نے خود اٹھ کر آثم کا بازو کھینچا ۔۔۔ "اٹھو اب ۔۔۔ کہیں کسی نے ہمیں اس وقت یہاں اکٹھے دیکھ لیا تو ۔۔۔ ؟"

"تو کام اور بھی آسان ہو جائے گا ۔۔۔"

"جوتیاں نہ پڑیں گی ۔۔۔ ؟" صنم ہنسی ۔۔۔

"ڈرتی ہو ۔۔۔ ؟"

ڈرتی تو اب کسی بات سے نہیں ۔۔۔ کوئی ڈر ہوتا تو یوں آدھی رات کو یہاں تمہارے پاس نہ چلی آتی ۔۔۔ ہم بھی اُمّی جی! بہت آگے جا چکے ہیں ۔۔۔ تمہاری محبت نے ہمیں بھی کچھ ایسا دیوانہ بنایا ہوا ہے کہ بس ۔۔۔ کھو بیٹھے ہیں اپنے ہوش و حواس ۔۔۔!"

"زہے نصیب ۔۔۔ زہے نصیب ۔۔۔!!" آثم نے اسے بازوؤں میں بھر کر پیار کر ڈالا ۔۔۔

"آؤ دونوں مل کر خدا سے دعا مانگیں کہ ہمیں وہ کبھی جدائی کی گھڑی نہ دکھائے ۔۔۔" اس کی پشت اپنے سینے کے ساتھ لگاتے ہوئے ہاتھوں میں صنم کے ہاتھ لے کر آثم نے دعا کے لئے پھیلا دیئے ۔۔۔ اور پھر بڑی دیر تک وہ دونوں ان چاروں ہاتھوں کو خدا کے حضور پھیلائے کھڑے رہے ۔۔۔!!

O

پانچوں وقت کی تو شاید نہیں مگر وہ نماز اکثر پڑھا کرتی تھی اور کاشف کے جیل جانے کے بعد تو وہ خاصی پابندی سے پوری نمازیں پڑھنے لگی تھی ۔۔۔ کہیں گئی ہوئی ہوتی یا کوئی اور کام ہوتا تو پچھلے پہر کی نمازوں میں سے کوئی قضا ہو جاتی تو ہو جاتی، لیکن صبح کی تو وہ کبھی بھی، کبھی بھی قضا نہیں کیا کرتی تھی ۔۔۔

اور آج ۔۔۔ وہ ابھی تک بستر سے ہی نہیں اٹھی تھی ۔۔۔ جانے رات کب گھر آئی تھی ۔۔۔ انتظار کرتے کرتے رات گیارہ بجے کے قریب امی کی آنکھ لگی تھی ۔۔۔ اور پھر اسی وقت کھلی جب صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ اٹھتے ہی انہوں نے گھبرا کر پہلے دھنک کا بستر دیکھا ۔۔۔ وہ وہاں سوئی ہوئی تھی ۔۔۔ اطمینان سے انہوں نے وضو کیا اور نماز کے لئے نیت باندھ لی ۔۔۔

نماز سے فارغ ہو کر تسبیح کے دوران انہوں نے کئی بار اسے جگایا مگر وہ جاگی ہی نہیں ۔۔۔ آخر کافی دن چڑھ گیا ۔۔۔ اور آج کاشف کے مقدمے کا فیصلہ تھا ۔۔۔ اس کی رہائی کا دن ۔۔۔ خوشی و مسرت کا دن ۔۔۔!

"ویسے ہر وقت کاشی جی کاشی جی ہوتا رہتا تھا اور آج جب کہ وہ آنے والا ہے تو یہ طور طریقے ہیں ۔۔۔ کہتی تھی گھر کو سجانا ہے ۔۔۔ یہ کرنا ہے ۔۔۔ وہ کرنا ہے ۔۔۔ لیکن آج کل تو بہن بھائی کی محبت بھی بس زبانی ہی ہے ۔۔۔ ایک ہمارا وقت تھا ۔۔۔" وہ اپنے وقتوں کے متعلق سوچتے ہوئے کوئی پانچویں ساتویں بار اسے جگانے چلیں ۔۔۔

"دھنک ۔۔۔! ارے دھنک ۔۔۔!! ہوش کرو کچھ ۔۔۔ آج اتنے عرصے بعد بھائی گھر آنے والا ہے اور تمہارے یہ طریقے ہیں ۔۔۔ ؟" امی نے بلند آواز میں بڑبڑاتے ہوئے اب کی بار اسے زور زور سے جھنجھوڑ ڈالا ۔۔۔ دھنک نے اب بھی چہرے پر سے چادر نہیں ہٹائی صرف بازو باہر نکالا اور بڑے زور سے امی کے ہاتھ جھٹک ڈالے ۔۔۔

"اپنے بھائی ہی کو تو صرف ایک نظر دیکھنے کے لئے زندہ ہوں اب تک ۔۔۔" وہ چادر کے اندر سے ہی بولی ۔۔۔ اس کا لہجہ بڑا عجیب اور تلخ سا تھا ۔۔۔ اور انداز میں بدتمیزی کا عنصر نمایاں تھا ۔۔۔ امی کا غصہ دوچند ہو گیا ۔۔۔

"آج پتہ ہے نا بھائی نے آجانا ہے ۔۔۔ ماں سے بات کرنے کا انداز ہی بدل گیا ہے ۔۔۔" امی اس کے پلنگ کی پٹی پر سے اٹھ گئیں ۔۔۔ "ناشتہ بن گیا ہے چل اٹھ کر لے اور پھر جلدی سے تیار ہو جا ۔۔۔"

"مجھے کہیں نہیں جانا ۔۔۔" اس نے اسی طرح، اسی انداز میں چادر کے اندر سے ہی جواب دیا

"تو اتنی ہی خوشی تھی بھائی کے آنے کی ۔۔۔ ؟" امی نے طعنہ مارا ۔۔۔

"وہ تو میرا دل ہی جانتا ہے کہ کتنی خوشی ہے، گھر آئیں گے تو مل لوں گی ۔۔۔"

"اور جو شہزاد ابھی گاڑی لے آئے گا ۔۔۔"

ماں کی اس بات پر دھنک نے یکدم چادر چہرے سے ہٹائی اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے زور سے چلائی ——— "نہیں ——— وہ گاڑی نہیں لے کر آئے گا ———"

دھنک کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ بھی کچھ پھیکا پھیکا دکھائی دے رہا تھا ——— امی کا غصہ یکدم کافور ہو گیا ——— "میرا خیال ہے تمہاری نیند ابھی پوری نہیں ہوئی تبھی مزاج بھی کافی بگڑا ہوا ہے ———" اب ان کے لہجے میں نرمی تھی ——— "اگر شہزاد کسی وجہ سے گاڑی لے کر نہیں آ رہا تو ہم خود ہی چلی جائیں گی ———"

"میں نے کہا نا امی! میں نہیں جا رہی ———"

"اچھا پھر اٹھو ——— ناشتہ تو کر لو ———"

"ناشتے پر بھی دل نہیں چاہ رہا ———" مزید کوئی بات کئے بنا اس نے پھر چادر چہرے پر تان لی ———

"عجیب لڑکی ہے ——— جانے کیا ہوا ہے ———؟" امی بڑبڑائیں پھر چند لمحے کھڑی سوچتی رہیں "نہیں جانا تو نہ سہی مگر میں ضرور جاؤں گی ——— آج میری مامتا اس کی لگائی پابندی کی پرواہ نہیں کرے گی ———" وہ جا کر اکیلی ہی ناشتہ کرنے لگیں لیکن آج تو ان سے بھی حلق سے کچھ نیچے نہیں اتارا جا رہا تھا، زبردستی ایک انڈا کھا کر چائے کی پیالی انہوں نے پی لی ———

دھنک نے ٹھیک ہی ناشتہ نہیں کیا ——— یہ غم اور خوشی ہوتے ہی عجیب جذبے ہیں ——— ہر دونوں حالتوں میں کھایا پیا ہی کچھ نہیں جاتا ———

ناشتے سے فارغ ہو کر وقت دیکھا ——— واقعی ——— دھنک نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ شہزاد نہیں آئے گا ——— عدالت کا تو وقت ہو بھی چکا تھا ——— جلدی جلدی تیار ہو کر انہوں نے چادر اوڑھی اور دھنک کے کمرے کے دروازے میں ہی کھڑے کھڑے اسے گھر کے متعلق کچھ ہدایات دیتے ہوئے رخصت ہو گئیں ———

سواری دیر سے ملنے کی وجہ سے انہیں عدالت میں پہنچتے پہنچتے کافی وقت لگ گیا ——— اور ——— وہ جب پہنچیں تو برآمدے میں کاشف اور شہزاد کھڑے تھے، کاشف کی بے چین نگاہیں اِدھر اُدھر کچھ تلاش کر رہی تھیں ——— ماں کو آتا دیکھ کر وہ لپکا ———

"میری گڑیا نہیں آئی امی ———؟" ماں کے گلے سے لگتے ہی پہلا سوال پہلی بات اس نے اسی کے متعلق کی ———

"اس کے تو دماغ میں وہی بات بیٹھی ہوئی ہے ——— جب پہلی بار تم سے ملنے جیل میں گئی تھی تو تم نے کہا تھا کہ ہم دوبارہ یہاں نہ آئیں ——— اسی لیے شاید وہ نہیں آئی ——— اور سچی بات ——— مجھ سے رہا نہیں گیا تھا ———"

"دیکھا امی! میری بہن کتنی سعادت مند اور فرمانبردار ہے ——— چلیئے ——— جلدی گھر چلیئے ——— میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ مجھے وہ کس کس طرح یاد آتی رہی ہے ——— ہر وقت اس کی شکل آنکھوں میں پھرتی رہتی تھی اور میں سوچتا رہتا تھا کہ اب وہ فلاں کام کر رہی ہوگی اور اب فلاں ——— اور کبھی کبھی تو امی! رات کو اندھیرے میں لیٹے ہوئے مجھے یوں لگتا تھا جیسے یہاں سے قریب ہی کہیں سے وہ مجھے پکار رہی ہے ——— تب امی! میرا دل بہت اداس ہو جاتا تھا ——— پھر کئی بار تو میں سچ مچ آنسوؤں سے رو دیتا تھا ———"

"پگلا ———!" امی نے پیار سے اس کی پیشانی چوم لی ——— "کبھی مرد بھی آنسو بہایا کرتے ہیں ——— ؟"

کیوں امی ——— ! مردوں کے سینوں میں دل نہیں ہوتے ——— ؟"

"ہوتے ہیں ——— اب شہزاد ہی کی مثال لے لو ———" امی نے پاس چپ چاپ کھڑے شہزاد کی طرف دیکھا "کس کس طرح اس نے ہمارا خیال رکھا ہے اور کیا کیا نہیں، اس نے ہمارے لئے کیا ——— بڑے ہی دل کی تو نشانی ہے ———"

"اب جانے بھی دیجئے امی ———!" شہزاد نے شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا

"کیوں جانے دوں ——— ؟ کسی کی نیکی کو بھول جانے والا احسان فراموش ہوتا ہے"

"امی! جلدی گھر چلیئے نا باقی باتیں وہیں ہوں گی ———"

"آپ دونوں چلیں ——— میرے تو ابھی دو مقدمے اور ہیں ——— وہ بھگتا کر دفتر جاؤں گا ——— وہاں دو موکلوں کو وقت دے رکھا ہے ——— ان سے فارغ ہو کر پھر آؤں گا ——— آپ چلیئے" ساتھ ہی شہزاد نے پاس سے گزرنے والے کینٹین کے اک بیرے کو ٹیکسی لانے کے لئے کہا

"امی آپ کے پاس کرائے وغیرہ کے لئے کچھ رقم تو ہوگی ۔۔۔ ؟" اس نے اک فرمانبردار اور اطاعت گزار بیٹے کی طرح پوچھا ۔۔۔

"ارے بیٹے! صرف کچھ ہی نہیں ۔۔۔ بلکہ بہت کچھ ہے ۔۔۔ تمہارا دیا بہت کچھ ہے یہ دیکھو پورا پانچ سو روپیہ پرس میں ہے ۔ گھر جاتے جاتے مٹھائی لے کر جاؤں گی ۔۔۔ خاص طور پر اپنے پرانے محلے میں تقسیم کرنے کے لئے ۔۔۔ کیسے سب عورتیں ہمیں باتیں بناتی تھیں، اب آکر دیکھیں نا کہ میرا لڑکا مجرم ہے یا میری بیٹی عزت دار نہیں ۔۔۔"

"مٹھائی وٹھائی پھر دیکھی جائے گی ۔۔۔ میں تو سب سے پہلے اور جلد از جلد اپنی گڑیا کو دیکھنا چاہتا ہوں ۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ میرے بعد میری گڑیا کے ساتھ کسی نے اچھا سلوک کیا ہوگا ۔۔۔" وہ ماں کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرایا ۔۔۔

"ہاں ہاں ۔۔۔ اک تو ہی تو صرف اس کا خیر خواہ ہے اور باقی سب اس کے دشمن ۔۔۔" امی بھی مسکرائیں ۔۔۔ "میری بات رہی ایک طرف مگر شہزاد نے جیسے جیسے اس کے لاڈ دیکھے ہیں، ویسے تو تم نے بھی کبھی نہیں دیکھے تھے ۔۔۔"

"کیا پتہ ۔۔۔ ؟ یہ تو اب اپنی گڑیا کی زبان سے ہی سب کچھ سنوں گا تو یقین کروں گا ۔۔۔"

اسی وقت ٹیکسی آگئی ۔۔۔ وہ جھک سے ملنے کی اسے اتنی جلدی تھی کہ لپک کر امی سے پہلے ہی بیٹھ گیا ۔۔۔ امی نے بھی بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو سٹارٹ کرنے کا اشارہ کیا تو یکایک اسے یاد آیا "مگر امی! مجھے تو ابھی شہزاد کا شکریہ ادا کرنا تھا ۔۔۔"

"عجیب ہو تم بھی ۔۔۔" ٹیکسی کئی گز دور چلی گئی تھی۔ امی قدرے تلخی سے بولیں ۔۔۔ "اپنے ہونق ذرا بجا رکھا کر دیا ۔۔۔ وہ تو فیصلے کا شن کر پہلے لمحے بس ہی تمہیں ادا کرنا چاہیئے تھا ۔۔۔"

"میری نگاہیں گڑیا کو اور آپ کو ہی ڈھونڈتی رہیں ۔۔۔ توجہ اور دھیان دوسری طرف لگا ہو تو غلطی ہو جانا لازمی امر ہے ۔۔۔" کاشف نے نادم سا ہوتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

"چلو کوئی بات نہیں ۔۔۔" امی نرمی سے بولیں ۔۔۔ "سہ پہر کو وہ آئے گا نا تو اب دہیں شکریہ وغیرہ ادا کر لینا ۔۔۔" پھر وہ ٹیکسی ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گئیں ۔

"ڈیفنس سوسائٹی کی طرف چلو ۔۔۔"

"ڈیفنس سوسائٹی میں ۔۔۔ ؟" کاشف نے بڑے تعجب سے ماں کی طرف دیکھا ۔۔۔

وہ بڑے انداز سے مسکرا پڑیں ۔۔۔ "اب ہم وہیں رہتے ہیں ۔۔۔ بڑی خوب صورت کوٹھی ہے بالکل ایسی، جیسی تمہارے ابا بنانا چاہتے تھے ۔۔۔" پھر امی نے بڑی تفصیل سے کوٹھی کا حدود اربعہ وغیرہ بیان کرنے کے بعد شہزاد نے ان کی خاطر جو کچھ کیا تھا، وہ بتانے لگیں ۔۔۔ اور ابھی وہ پوری طرح اس کی عنایات کا ذکر کر بھی نہیں پائی تھیں کہ ان کی منزل آگئی ۔۔۔

ٹیکسی والے کو جب تک امی کرایہ ادا کرتیں وہ اندر بھی پہنچ چکا تھا اور ایک ایک کمرے میں اپنی گڑیا کو آوازیں دیتا پھر رہا تھا ۔۔۔

"کاشی جی! آپ آگئے ۔۔۔ ؟" وہ بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے سینے کے ساتھ لگ گئی ۔

"میری گڑیا ۔۔۔ ! میری اپنی گڑیا ۔۔۔ !!" یہ وہ بھی آج تک نہیں جان سکا تھا کہ اس لڑکی کے لئے اس کے دل میں کیا کچھ تھا ۔ ایک بھائی کا پیار ۔۔۔ ایک باپ کی سی شفقت ۔۔۔ ایک دوست کا سا خلوص اور ایک غمگسار کی سی توجہ ۔۔۔ !!! اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا ۔۔۔ بہت کچھ ۔۔۔ !

ماں کو بھی ملا تھا ۔۔۔ مگر اپنی گڑیا کو سینے سے لگایا تو جیسے اندر کھولتے آتش فشاں پھوٹ نکلے ۔۔۔ اتنے عرصہ کی جدائی آنسو بن کر آنکھوں سے بہنے لگی ۔۔۔ اک طوفان سا آگیا ۔۔۔

"یہ کیا بیوقوفوں والی حرکت ہے ۔۔۔ ؟" امی بڑے پیار سے دونوں کو دیکھتے ہوئے ہنس کر بولیں ۔ وہ جانے کب اندر آگئی تھیں ۔ دونوں کو ہی پتہ نہیں چلا ۔۔۔ کاشف نے سر اٹھایا ماں کو دیکھا ۔۔۔

"آنسو مرد کو زیب نہیں دیتے ۔۔۔"

"یہ تو گڑیا رو رہی ہے ۔۔۔"

"اور تو اپنا چہرہ بھی دیکھ نا ۔۔۔ !"

"اپنا ۔۔۔ ؟" اس نے اپنے رخسار پر ہاتھ پھیرا ۔ پھر مسکرا پڑا ۔۔۔ "مجھے تو علم ہی نہیں ہوا کہ یہ کب بہہ نکلے ۔۔۔" وہ جھک کر جلدی سے دھنک کا سر تھپتھپاتے لگا ۔۔۔ بس میری رانو !

میری گڑیا! اب تو بس آگیا۔۔۔"

مگر دھنک کے آنسو تھم ہی نہیں رہے تھے۔۔۔ وہ روئے جا رہی تھی۔۔۔ سسکیاں بھرے جا رہی تھی۔۔۔

"یہ لڑکی تو بالکل ہی پاگل ہو گئی ہے۔۔۔ نہ بھائی کو چائے وائے کا پوچھا ہے اور نہ کچھ اور کھانے پینے کا۔۔۔ آنسوؤں سے اس کا استقبال کر رہی ہے، بڑا اچھا شگون ہو رہا ہے نا۔۔۔"

"نہیں نہیں۔۔۔" ماں کی بات سنتے ہی وہ یکدم گڑبڑا کر بولی۔۔۔ "یہ تو خوشی کے آنسو ہیں"

"بھائی کی ساری قمیض بھیگ گئی ہے اور یہ خوشی کے آنسو ہیں۔۔۔"

"امی! میرے آنسوؤں سے آپ نے اندازہ نہیں کیا کہ مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔۔۔"

اب بھی اس کے رخساروں پر موتیوں کی لڑیاں رواں تھیں۔۔۔

"تمہاری خوشی کا تو مجھے صبح ہی اندازہ ہو گیا تھا۔۔۔" امی نے قدرے طنز سے اسے دیکھا اور پھر کاشف سے مخاطب ہو گئیں۔۔۔ "جس وقت میں تمہارے پاس کچہری میں پہنچی ہوں نا تو اس وقت تک یہ بستر میں تھی۔۔۔"

"امی۔۔۔!" اس نے آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ عجب سی بے بسی سے انہیں دیکھا۔

"بس بس! جانے بھی دیجیے امی۔۔۔!" کاشف نے دھنک کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ماں کو مزید کچھ نہ کہنے کا اشارہ کیا۔۔۔ جانے وہ کون سے دکھ تھے، جن کے سائے اس وقت اسے گڑیا کے چہرے پر لرزاں دکھائی دیے تھے۔۔۔

"جاؤ۔۔۔ چائے وغیرہ بناؤ۔۔۔"

"ہاں گڑیا! تمہارے ہاتھ کی چائے مجھے ہر وقت یاد آیا کرتی تھی۔۔۔"

"آپ کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے کاشی جی۔۔۔!" اک سسکاری بھرتے ہوئے وہ اس سے علیحدہ ہوئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی چائے بنانے چلی گئی۔۔۔

صبح اس نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔۔۔ توس اسی طرح پڑے تھے، چائے کا پانی کھولنے کے لیے رکھنے کے بعد انڈا پھینٹ کر کاشف کی پسند کے میٹھے توس بنائے، ابلے ہوئے انڈے وہ بہت پسند کرتا تھا۔ کچھ انڈے ابالے اور پھر چائے وغیرہ تیار کر کے سب کچھ لیے وہ کمرے میں واپس

گئی تو کاشف نے شیو کر کے نہا دھو کر موتیا سے رنگ کی اپنی شلوار قمیض پہن لی ہوئی تھی اپنے ہمیشہ والے حلیے میں وہ کتنا اچھا اور کتنا باوقار لگ رہا تھا۔۔۔ وہ دروازے میں ہی کھڑی کتنی دیر اسے دیکھتی رہی۔۔۔

"یہ پلنگ پوش ہیں شیشوں والے کوئٹہ سے منگوائے تھے۔۔۔" امی کی آواز پر چونک کر وہ اندر بڑھ گئی۔۔۔ "یہ ریشمی دھاگے کے ساتھ بنے ہوئے کروشیے کے کشن ہیں۔۔۔ یہ پوت کی ساڑھی ہے۔۔۔ یہ کمخواب کا سوٹ ہے۔۔۔" کاشف گم صم سا بیٹھا تھا اور امی اس کے سامنے مختلف قسم کی چیزوں کا اک انبار سا لگائے جا رہی تھیں۔

"دھنک کا ایسا قیمتی جہیز تو ہم بھی نہیں بنا سکتے تھے۔۔۔ میں تو کہتی ہوں کہ شہزاد جیسا فرشتہ خصلت بیٹا کسی اور ماں نے پیدا نہیں کیا ہوگا۔ دوست کی خاطر تو ہر دوست بہت کچھ کر لیتا ہے مگر یہ اپنی مثال آپ ہی ہے کہ دوست کی بہن کو یوں اپنی بہن سمجھ کر ساری کمائی"

"ہاں۔۔۔" امی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی دھنک یکایک جنونی انداز میں اک قہقہہ لگا اٹھی۔۔۔ "یہ اپنی مثال آپ ہے۔۔۔"

امی خاموش ہو گئیں کاشف نے حیرت سے اسے دیکھا۔۔۔

"یہ تو پتہ نہیں کیوں ہمیشہ اس کی دشمن ہی ہوئی رہتی ہے۔۔۔" لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد امی نے غصہ بھری نگاہ سے اسے گھورا، پھر کاشف سے براہ راست مخاطب ہوئیں۔۔۔ "ابھی تو میں تمہیں اس کی وہ ساری کرتوتیں بتاؤں گی کہ یہ جو کچھ شہزاد کے ساتھ کرتی رہی ہے۔۔۔"

"ضرور بتائیے امی! ضرور بتائیے۔۔۔ مگر آج پھر میری بھی زبان خاموش نہیں رہے گی۔۔۔"

اس نے بڑی بے باکی سے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔۔۔

"تیری زبان۔۔۔؟ تیری زبان کبھی پہلے خاموش رہی ہے۔۔۔؟"

"خاموش ہی رہی ہے تو اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی ہوں۔۔۔!"

"گنوا بیٹھی ہو۔۔۔؟ اور یہ جو کچھ ہے، یہ کس کے لیے ہے۔۔۔؟ کاشی! ذرا اس کی الماری دیکھنا۔۔۔ شہزادیوں جیسے لباس پہنا کرتی تھی۔۔۔ شاید گھی ہضم نہیں ہوا اسے۔۔۔ احسان فراموش۔۔۔ نمک حرام۔۔۔!!" وفورِ طیش سے امی کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"امی! میں کہے دیتی ہوں — پھر مجھے ایسے خطابات مت دیجیے گا، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا —" نہ اس کی نگاہ میں ماں کے لئے لحاظ تھا ذرا اور نہ لہجے میں احترام!

"گڑیا — ! کیا ہو گیا گڑیا —!" کاشف نے متعجب سا ہوتے ہوئے اس پر نگاہیں جمادیں۔ "پہلے تو تم ایسی نہ تھیں — رانو! امی کے سامنے اس انداز میں بول رہی ہو؟"

کاشف نے سمجھانے کے لئے اسے اپنے پاس بٹھالیا —

"یہ میری ماں نہیں ہے کاشی جی! یہ میری ماں نہیں ہے —" وہ چیختے ہوئے کاشف کے ساتھ لپٹ گئی — "کاشی جی! میں آپ کو کیا کیا بتاؤں کہ میرے ساتھ کیسے کیسے ظلم ہوئے ہیں آپ ابھی ابھی آئے ہیں — میں آپ کو آتے ہی دکھی نہیں کرنا چاہتی —"

"ہاں ہاں میں نے اسے بہت دکھ دیئے ہیں —"

"آخر ہوا کیا امی —؟ بات کیا ہے —؟" کاشف نے دھنک کے سسکتے وجود کو اپنے ساتھ لگا لیا — "میری گڑیا کبھی جھوٹ نہیں بولتی —"

"ہاں — اس گھر میں جھوٹ بولنے والی تو صرف میں ہوں —"

"امی! میں آپ کو تو کوئی الزام نہیں دے رہا، اس کی حالت دیکھ کر البتہ مجھے بڑی تشویش سی ہو رہی ہے — وہ آثم وعیزہ — وہ تو سب ٹھیک ٹھاک ہیں نا —؟" کاشف دھنک کے ان شدید ترین جذبوں سے بڑی اچھی طرح واقف تھا جو گڑیا کے دل میں ان لوگوں کے لئے تھے وہ سمجھا، شاید انہیں کی کوئی ایسی پریشانی بھری بات تھی جو گڑیا کی حالت ایسی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ٹھاک ہیں —" امی وہی تیکھا اور طنزیہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے بولیں۔ "بس شادی جلد کرنے کے لئے تقاضوں پر تقاضے ہو رہے تھے، اور یہی ظلم ہوا ہوگا اس کے ساتھ جو ابھی تک شادی نہیں ہوئی —"

"امی! آپ اس کمینے اور ذلیل انسان کی حمایت میں اپنی بیٹی کے متعلق ایسی باتیں کر رہی ہیں؟؟" دھنک زور سے چلائی — "یہ آپ کیسی ماں ہیں —؟"

"میں تو بہت بری ماں ہوں — اور سن رہے ہو کاشی! وہ کمینہ اور ذلیل انسان ہے۔ تمہارے مقدمے پر ہزاروں خرچ کر دیئے — وہ کمینہ ہے اس کا اتنا شاندار اس نے جہیز بنا دیا ہے وہ

ذلیل ہے — اتنی خوب صورت کوٹھی، ایسا اعلیٰ فرنیچر، اتنی آسائشیں اس نے مفت و مفت میں اسے دے دیں اور وہ کمینہ ہے —"

تب — دھنک میں مزید صبر و برداشت کا یارا نہ رہا۔ اس نے سر اٹھایا۔ لال انگارہ، خون اگلتی آنکھیں عجب وحشیانہ انداز میں ماں کے چہرے پر گاڑ دیں — —

"مفت و مفت نہیں امی! اس نے قیمت وصول کر لی ہے اور ایسی قیمت وصول کی ہے کہ اب ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہ گیا — کچھ بھی نہیں بچا — ہم بالکل تہی دامن ہو گئے ماں —!"

"کیا بکواس کر رہی ہو —؟"

"پچھلی رات سہیل کی منگنی نہیں تھی بلکہ مجھے تباہ و برباد کرنے کی تقریب تھی — میں بہت بری ہوں بہت ذلیل ہوں — مجھے کل رات ہی مر جانا چاہیئے تھا مگر امی! میں اپنے کاشی جی کو صرف ایک نظر دیکھنے کے لئے اب تک زندہ رہ گئی تھی، میں اپنا دکھ، اپنی تباہی کی داستان اپنے اس دوست اور غمگسار بھائی کو سنانے کے لئے زندہ رہ گئی تھی —"

"یہ کیا کہہ رہی ہو گڑیا —!" کاشف نے پاگلوں کے سے انداز میں اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا "یہ کیا کہہ رہی ہو —؟"

"کاشی جی! میں سچ کہہ رہی ہوں اور اس کی ذمہ دار یہ میری ماں ہے۔ کاشی جی! اس نے اپنی بیٹی کی عزت بیچ ڈالی ہے — کاشی جی! میں شہزاد کے ساتھ بات نہیں کیا کرتی تھی — میں اس سے کچھ لینا نہیں چاہتی تھی — میں اس کے ساتھ کہیں آنا جانا نہیں چاہتی تھی — اس نے مجھے مجبور کیا۔ اس عورت نے مجھے تباہ کر ڈالا —" دھنک پر جیسے جنون سوار ہو گیا تھا — پہلے نگاہوں اور زبان سے ماں کا احترام رخصت ہوا تھا اب ہاتھ بھی بے قابو ہو گئے — آگے بڑھ کر اس نے ماں کو کندھوں سے تھاما اور جھنجھوڑنے لگی — "سچ کہو تمہیں اس کی نگاہ ٹھیک لگتی تھی —؟"

امی کا سارا وجود لرز رہا تھا — اور چہرے پر جیسے کسی نے ہلدی تھوپ دی تھی —

"بتاؤ —؟ مجھ پر اٹھنے والی اس کی نگاہوں میں تمہیں کبھی کچھ نہیں دکھائی دیا تھا —؟" اس نے پھریوں کے شانے جھنجھوڑے — اس قدر سختی سے — اتنے زور سے — جیسے اس کی بات کا جواب نہ ملا تو وہ اسی طرح جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر انہیں توڑ پھوڑ دے گی — ان کے گوشت سے ہڈیاں علیحدہ کر

دے گی — اس وقت اس کی وحشت اور دیوانگی میں اتنی طاقت تھی —

"میں تو اسے کاشف کا دوست سمجھتی تھی —" امی پھیلی پھیلی، سہمی سہمی نگاہیں اس کے وحشت زدہ چہرے پر گاڑتے ہوئے ہکلا ہکلا کر بولیں —

"جس طرح اس کی موجودگی میں ہماری مدد کیا کرتا تھا میرا خیال تھا اب بھی وہی جذبہ اس کے دل میں ہوگا —" پھر ان کی نگاہیں جھک گئیں —

"اور نظروں کا کیا ہے، اس عمر میں بہک بھی سکتی ہیں — لیکن تم تو اس کی عزیز ترین دوست کی بہن تھیں —"

"سن لیا نا کاشی جی — !" آخری زوردار جھٹکا دیتے ہوئے اس نے ماں کو چھوڑ دیا — پھر کاشف کی طرف مڑی — "یہ جانتی تھیں — مگر انجان بنی رہیں — اپنے مطلب کی خاطر — میں نے کہا بھی کہ ہم محنت مزدوری کر کے یہ مصیبت کا وقت کاٹ لیں گی — مشکل سے ہی سہی — کم از کم اپنی غیرت اور خودداری تو قائم رہ ہی جائے گی نا — مگر یہ غیرتیں، یہ خودداریاں اور یہ عزتیں، یہ کن فضول سے احساسات کے نام ہیں ؟ انہیں جب بیٹھے بٹھائے ہر آسائش مل رہی تھی تو ہاتھ پاؤں ہلانے کی بھلا ضرورت بھی کیا تھی —؟" اس نے طنزاً نفرت اور حقارت بھری نگاہ سے ماں کو دیکھا —

"پھر یہ اپنے دلائل سے مجھے بھی قائل کر لیتی تھیں — لیکن نہیں — میں دل سے قائل کبھی نہیں ہوئی تھی — صرف ان کے احترام اور آپ کی خاطر کاشی جی آپ کے مقدمے کے طعن دے دے کر یہ مجھے اس کے ساتھ بھیجتی تھیں — اور آپ کا نام جب بھی آتا تھا کاشی جی ! میں خاموش ہو جاتی میں مجبور و بے بس ہو جاتی تھی —" ایک بار پھر اس پر جیسے وحشت و دیوانگی کا بھرپور دورہ پڑا — وہ پھر ماں کی طرف لپکی — آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی تھی — اس کے ہاتھوں میں تشنج تھا — اس کی حرکات میں ہوشیلا پن تھا اور زبان پہ ہذیان — !!

"تم — تم جیسی ماؤں کی بیٹیوں کا یہی حال ہوتا ہے — وہ بے گناہ، بے تصور لٹ جاتی ہیں، برباد ہو جاتی ہیں، اور پھر ایسی ہی لڑکیاں مستقبل میں طوائفیں بنتی ہیں — تم نے اپنی بیٹی کو فروخت کر ڈالا تیری بیٹی روتی رہی، تڑپتی رہی سسکتی رہی، مگر تم نے اسے طوائف بنا ڈالا — اس کی لاکھوں

کروڑوں کی عصمت کو چند ٹکوں، چند ملبوسات اور زندگی کی چند مادی آسائشوں کے عوض بیچ ڈالا —" امی سر جھکائے گم سم، چپ چاپ یوں ساکت بیٹھی تھیں جیسے ان میں زندگی کی اک رمق بھی موجود نہ تھی — ماں کے بے جان سے ہاتھ جھٹکا کر وہ کاشف سے مخاطب ہو گئی —

"کاشی جی وہ اس گھر میں میری وجہ سے آتا تھا صرف میرے لئے — اس کے کمرے میں دیواروں پر چاروں اطراف میری تصاویر آویزاں ہیں — اس کی جیب میں ہر وقت میری تصویر موجود رہتی ہے — وہ اس نے اپنے ساتھ بنوا کر رکھی ہوئی ہے وہ یہ جو کچھ خرچ کرتا تھا میری خاطر کرتا تھا اس کے دل میں کسی دوست کے لئے کوئی خلوص نہ تھا، کسی ماں کے رشتے کا کوئی احترام نہ تھا، کسی خواہرانہ تعلق کا کوئی تقدس نہ تھا — وہ تو صرف میری عصمت کا خریدار تھا — وہ ڈھیر ساری دولت لئے اک گاہک بن کر ہمارے گھر میں آیا تھا — اور میری ماں کی آنکھیں اس دولت کی چکا چوند سے چندھیا گئیں — اس کے دل میں لالچ آ گیا، تب اس نے جھٹ پٹ بیٹی کی عزت کا سودا کر ڈالا —" اتنا کچھ کہہ لینے کے بعد جیسے اس کا جوش، اس کا جنون کچھ کم ہو گیا تھا — آنسو بہاتے ہوئے وہ کاشف کے قدموں میں بیٹھ گئی —

"کاشی جی ! میں اپنی جان دے دیتی، مگر خود کو لٹنے نہ دیتی، لیکن — لیکن میری ہر کوشش ناکام رہی ہے — پھر اس کے بعد میں زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی، مگر میں آپ کو صرف ایک نظر دیکھنا بھی چاہتی تھی — اتنا عرصہ ہو گیا تھا آپ کو دیکھے ہوئے، میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ میں نے آپ کو کس کس طرح یاد کیا ہے — اور آپ کی رہائی کے لئے کتنی دعائیں مانگی ہیں اور آج میری دعائیں قبول ہو گئی ہیں — آپ گھر آ گئے ہیں، بڑی خوشی کی بات ہے آپ کو میں نے دیکھ لیا ہے —" اس نے آنسو بہاتی آنکھیں کاشف کے چہرے پر گاڑ دیں —

"میرا من روشن ہو اٹھا ہے — اور اب میرا ناپاک وجود کل سے آپ کو کہیں دکھائی نہیں دے گا — میں نے سارے انتظامات مکمل کر لئے ہیں، کل کا سورج اس گھر میں مجھے زندہ نہیں دیکھ پائے گا فکر نہ کریں آپ کی بدنامی بھی کوئی نہیں ہو گی اور —" اس نے کاشف کے پاؤں چھوڑ کر سسکتے چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا —

"اُدھر — انہیں — لاہور میں —" اس کا اشارہ آثم کی طرف تھا، کاشف سمجھ گیا —

یہ کہہ سکے گا اچانک حرکت قلب بند ہو گئی — اور دھنک مرتے دم تک —— کچھ نہیں — کچھ نہیں کاشی جی — ! میں کسی کے قابل نہیں ہوں نہ ہی میرے دل میں کوئی ہے — میں تو صرف اک بکاؤ مال ہوں —— مجھ میں وفا —— " اس کا سسکتا وجود لڑکھڑایا اور وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑی ——

کاشف نے ہاتھوں میں سے سر نکالا — ماں کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اپنی گڑیا کے بے ہوش وجود پر اس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں ——

"دھنک ! میری بیٹی —— !" امی کے بے جان جسم میں حرارت پیدا ہوئی ایک کر انہوں نے فرش پر پڑے دھنک کے وجود کو بازوؤں میں بھر لیا۔ پھر چیخیں مار مار کر اسے جھنجھوڑنے لگیں —— دھنک ! میری جان ! میں نے یہ سب تو نہیں چاہا تھا —" وہ جیسے اپنے قصور اپنی بے پرواہی کا اعتراف کرنے لگیں ——

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا یہ تجاہل ایسی بربادی لے آئے گا — میری بیٹی ! تو خوب صورت بہت ہے میں یہی سمجھتی رہی کہ اچھی شکل کو ہر نگاہ دیکھنا پسند کرتی ہے اور اسے تو شروع سے ہی علم تھا کہ تم آثم کی منگیتر ہو۔ اس صورت میں، میرے خیال میں تم محفوظ ہی محفوظ تھیں — یوں اگر صرف ایک شکل دیکھنے کی خاطر ہی وہ اتنا خرچ کیے جا رہا تھا تو میں نے اس میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا —" امی دھنک کا سر گود میں لیے زار و قطار رو رہی تھیں اور ان کے آنسو اس کے چہرے پر گر رہے تھے ——

"ویسے میں قسم کھا کر کہتی ہوں مجھے تمہارے بھائی کی غیرت و خودداری پر بھی پورا یقین تھا کہ زندگی میں جب بھی اسے موقع ملا وہ اس کا خرچ کیا ہوا ایک ایک پیسہ قرض کا کہہ کر اتار دے گا"

"ہاں ماں ! میں سارے قرض اتار دوں گا —— اب میں آ گیا ہوں —— اس کے سارے قرضے گن گن کر چکاؤں گا —" کاشف کی درد و غم میں ڈوبی گھمبیر سی آواز سن کر امی نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا۔

"تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو، میرا خیال تھا ڈاکٹر کو لینے جا چکے ہو گے —"

امی اپنے دوپٹے کے پلو سے دھنک کا چہرہ صاف کرتے لگیں۔ کاشف نے جھک کر اس

کی نبض دیکھی — پھر جا کر پانی کا گلاس لے آیا۔

"شدید صدمے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی ہے آپ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیں میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں —" دو قدم چل کر وہ واپس آیا — "کچھ روپے ہوں گے آپ کے پاس —— ؟"

امی نے اپنا پرس اس کی طرف بڑھا دیا — جانے اس نے اس میں سے کیا نکالا — نہ امی نے پوچھا اور نہ انہیں پوچھنے کا ہوش ہی تھا — وہ جھک کر دھنک کے چہرے پر اپنے دوپٹے کا پلو بھگو کر پھیر رہی تھیں — اور منہ ہی منہ میں جانے کیا کیا بڑبڑائے جا رہی تھیں ——

کاشف گھر سے نکلا — امی نے اسے ڈاکٹر کو لانے کے لیے بھیجا تھا، مگر اس نے کسی ڈاکٹر کے مطب جانے کے بجائے ٹیکسی ڈرائیور کو شہزاد کی رہائش گاہ کا پتہ بتایا — وہاں پہنچ کر اس نے ٹیکسی کو فارغ کر دیا ——

شہزاد کی اس رہائش گاہ سے وہ اچھی طرح واقف تھا — پچھلی سمت جا کر اس کی خوابگاہ میں کھلنے والی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر وہ اندر داخل ہو گیا ——

اس کی گڑیا نے ٹھیک ہی کہا تھا وہاں چاروں اطراف اس کی تصویریں لگی تھیں —— اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے جلدی جلدی سب فریم توڑ توڑ کر اندر سے اپنی گڑیا کی تصویریں نکال لیں — پھر وہیں میز کے دراز میں سے اک لفافہ ڈھونڈا — سب تصویریں اس میں ڈال کر لفافہ بغل میں دبایا اور اسی کھڑکی کے راستے سے باہر نکل گیا ——

تصویریں قبضہ میں کرنے کے بعد وہ سیدھا کورٹ پہنچا — پاگلوں کی طرح ادھر ادھر پھرا ایک ایک کمرہ، برآمدے، بار روم، سب کچھ اس نے کھنگال ڈالا مگر گوہر مقصود ہاتھ نہ لگا —— پھر ٹیکسی لی —— اور اب وہ شہزاد کے دفتر کے سامنے تھا —— اس کا دروازہ کھلا تھا — جس کا مطلب تھا وہ اندر موجود تھا — ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے بعد چند لمحے باہر ہی کھڑے ہو کر اس نے اپنے سانس ہموار کیے — پھر نپے تلے قدموں سے اندر داخل ہو گیا ——

"ارے کاشف ! تم —— ؟" اس وقت اس کی وہاں موجودگی نے شہزاد کو قدرے حیرت میں ڈال دیا۔

ہاں ـــ تمہارا انتظار کرکے آخر مجھے خود ہی آنا پڑا ـــ"

"میں بس ابھی فارغ ہوا ہوں ـــ لیکن تمہیں کیوں آنا پڑا ۔ کوئی ضرورت تھی ـــ ؟"

"اس سے زیادہ ضرورت کیا ہوگی کہ اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنا تھا ـــ صبح اپنی گڑیا سے ملنے کی جلدی میں سب اخلاق و آداب بھلا بیٹھا تھا ـــ اتنا بڑا تم نے احسان ـــ"

"یار جانے دو ـــ" شہزاد نے مسکراتے ہوئے اس کی بات قطع کر دی "دوست احسان نہیں کیا کرتے ـــ"!

"پھر کیا کیا کرتے ہیں ؟" یکایک اس نے عجیب معنی خیز سے انداز میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ۔ اس کا انداز بڑا عجیب تھا ـــ شہزاد چونکا ـــ ذرا سا سٹپٹایا ـــ کاشف نے جلدی سے نگاہیں جھکاتے ہوئے بات بدل ڈالی ـــ

"کوئی چائے وائے نہیں پلواؤ گے ـــ ؟" بغل میں سے لفافہ نکال کر اس نے میز پر رکھا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا ـــ

"ضرور ـــ منشی جی ! یہ ذرا سامنے ہوٹل میں چائے کا تو کہہ آئیے "ـــ

پوپلے سے منہ والا بوڑھا منشی فائلیں بند کرکے جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا ـــ

"اپنے کاشف میاں کے لیے تو ابھی چائے آتی ہے ـــ جس طرح ہمارے شہزاد صاحب آپ کے لیے پریشان رہے ہیں ، اس کا تقاضہ تو یہی ہے کہ آپ کی رہائی کی خوشی کے موقع پر نہ صرف چائے بلکہ مٹھائی بھی ساتھ ہو ـــ" منشی جی خود مٹھائی کے بڑے شوقین تھے ـــ

"ہاں ہاں ـــ پانچ سیر اچھی قسم کی مٹھائی بھی ساتھ لے آئیے گا ـــ"

شہزاد نے چند نوٹ انکے آگے ڈال دیئے ـــ

"پانچ سیر ـــ ؟"

باقی کاشف کے گھر جائے گی ـــ وہ صرف اسی کی نہیں میری بھی ماں ہے "ـــ شہزاد ہمیشہ والی بے تکلفی سے بولا ـــ

"صرف ماں ہی نہیں منشی جی ! وہاں اس کی ایک بہن بھی ہے "ـــ کاشف نے ٹیڑھی آنکھ سے شہزاد کو دیکھا ـــ

"ہاں ـــ بہن بھی ہے ـــ" حلق میں اٹکتی آواز کو کھنکھار کر اس نے صاف کیا ـــ

مٹھائی کا معاملہ تھا ـــ منشی جی کے قدموں میں جوانوں کی سی پھرتی آ گئی ـــ وہ تو اک منٹ میں سڑک تک جا پہنچے تھے ۔۔ کاشف دروازے میں کھڑے ہو کر انہیں دور جاتے دیکھتا رہا وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو کاشف نے دروازہ بند کرتے ہوئے اندر سے چٹخنی لگالی ۔

"یہ کیا کر رہے ہو ـــ ؟" شہزاد نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا ـــ

ہماری گفتگو میں کوئی مخل نہ ہو ـــ" کاشف کا لہجہ بڑا ہموار تھا ۔ شہزاد مطمئن ہو گیا ـــ

"کوئی خاص گفتگو ہے ـــ ؟"

کاشف اس کے قریب آ کھڑا ہوا ـــ کئی لمحے اسے بڑے غور سے تکتا رہا ـــ پھر ـــ یوں تو شہزاد ! تم نے میری بیگناہی ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا مگر ایک بات سچ سچ بتاؤ ـــ تمہارا اپنا دل کیا کہتا ہے ـــ ؟ کیا واقعی میں نے قتل کیا تھا ـــ ؟"

شہزاد زور سے ہنس پڑا ـــ "مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد آخر تم ایسا کیوں پوچھ رہے ہو ؟"

پھر بھی ـــ ؟ تم بتاؤ تو سہی ـــ میں اپنے متعلق تمہاری ذاتی رائے جاننا چاہتا ہوں کیونکہ اور کئی سچ مچ کے قاتلوں کو بھی تم نے بیگناہ ثابت کرکے انہیں باعزت بری کرایا ہوگا"

"سچ سننا چاہتے ہو ـــ ؟" شہزاد نے کرسی کی پشت پر سر ٹیک دیا ـــ "اپنے متعلق میری ذاتی رائے جاننا چاہتے ہو ـــ ؟"

"ہاں ـــ" کاشف نے اس کی کرسی کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اس کے اوپر جھکتے ہوئے نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں ـــ

"تم نے قتل نہیں کیا ـــ" شہزاد نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا ـــ "میں نے بالکل سچا مقدمہ جیتا ہے ـــ تم ـــ تم کاشف ! میرے دوست ! زبان سے تو ذرا کسی کو تکلیف پہنچا نہیں سکتے کسی کی جان کیا لو گے ـــ ؟ جان لینا تو بہت بڑی بات ہوتی ہے ـــ تم کسی کو قتل نہیں کر سکتے"

"ٹھیک کہتے ہو ـــ لیکن ـــ" اور کاشف نے اک چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ شہزاد کی گردن کو اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا ـــ "میں ایک غیرت مند بھائی ہوں اور جب کوئی میری غیرت پر ہاتھ ڈالے گا تو میں بھی قتل کر سکتا ہوں ـــ شہزاد ! میں تمہیں قتل کر سکتا ہوں ـــ

میری بہن کی عزت لوٹنے والے لیٹرے! تجھے قتل کرنا مجھ پر فرض واجب ہو گیا ہے — میری بہن کی معصومیت چھیننے والے ذلیل انسان! تیرے خون میں ہاتھ رنگنا میرے لئے اک نیکی ہے میری حوروں سے زیادہ پاک اور فرشتوں سے زیادہ مقدس بہن کے تقدس کو ناپاک کرنے والے ظالم! تجھ کتے کی موت مارنا میری سب سے بڑی خواہش بن گئی ہے۔"

کاشف کے ہاتھوں کی گرفت شہزاد کے گلے پر سخت سے سخت تر ہوتی گئی — شہزاد نے چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کی — مگر کاشف میں تو اس وقت جیسے دس انسانوں کی قوت موجود تھی اس کی ہر کوشش ناکام رہی — وہ تڑپا — اس نے ابل کر باہر نکل آنے والی آنکھوں سے التجائیں کیں۔ زندگی کی بھیک مانگی، لیکن کاشف کے ہاتھوں کا دباؤ بڑھتا ہی چلا گیا —

"اب کہو کہ میں کسی کو قتل نہیں کر سکتا — مگر میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہے۔ دیکھ لیا نا بے غیرت — !تو نے کیا مجھے بھی اپنے جیسا ہی سمجھ رکھا تھا —؟"

شہزاد کا سارا وجود بڑے زور سے پھڑپھڑایا — اور اس نے آخری ہچکی لی —

"دوستی کے نام پر کلنک! شکر ہے آج تجھ ایسے ذلیل اور کمینے انسان کے وجود سے یہ دنیا پاک ہو گئی —" اسکی ڈھلکی گردن کو کرسی کی پشت پر پھینک کر کاشف نے ہاتھ جھاڑے پھر جلدی جلدی اس کی جیب کی تلاشی لینے لگا — بٹوے میں سے گڑیا کی وہ تصویر بھی نکل آئی جو شہزاد کے ساتھ تھی، بہت سارے نوٹ بھی تھے۔ وہ سب اس نے بڑی حقارت سے فرش پر پھینک دیئے اور گڑیا کی تصویر کو باقی تصویروں کے ساتھ لفافے میں ڈال لیا —

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی — اس نے جلدی سے پھر لفافہ بغل میں دبایا اور بڑے اطمینان سے فرش پر پھیلے نوٹوں کو پاؤں تلے روندتے ہوئے جا کر دروازہ کھول دیا — منشی جی مٹھائی کا یہ بڑا ڈبہ اٹھائے اور میلی سی بتیسی نکالے کھڑے تھے —

"مٹھائی تو آ گئی — چائے بھی ابھی بیرا لا رہا ہے —"

آپ چلیے اندر — بیٹھ کر مٹھائی کھائیے — چائے پیجئے — اور میں جس کام کے لئے آیا تھا وہ تو ختم ہو گیا — لہٰذا میں اب جا رہا ہوں —"

"لیکن —" منشی جی نے کچھ کہنا چاہا مگر کاشف نے انہیں کہنے ہی نہ دیا —

"لیکن ویکن اب رہنے دیجئے — مجھے وقت نہیں ہے — اور ہاں اگر کسی معاملے میں مجھ سے کسی پوچھ گچھ کی ضرورت پڑ گئی تو میں وہیں ہوں گا جہاں میری اور اسکی —" کاشف نے شہزاد کے مردہ جسم کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ جو کرسی پر پڑا ہے نا — اس کی ماں اور بہن رہتی ہیں —"

منشی جی اس بات کا مفہوم سمجھ نہیں پائے تھے — حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے دوبارہ بات کی وضاحت کرنے کا کہنے ہی لگے تھے کہ کاشف انہیں راستے سے ہٹاتے ہوئے باہر نکل گیا

"کاشف میاں! مٹھائی — چائے —" منشی جی ابھی وہیں کھڑے ہانکیں ہی لگا رہے تھے کہ سامنے سے آنے والی خالی ٹیکسی کو اشارہ کر کے کاشف نے اسے ٹھہرایا جھک کر کچھ کہا اور پلک جھپکتے میں اس کے اندر بیٹھ کر رخصت ہو گیا — اور منشی جی چندھی چندھی آنکھیں جھپک جھپک کر، بازو ہوا میں لہرا لہرا کر آوازیں ہی دیتے رہ گئے —

امی نے قدموں کی آہٹ سے چونک کر سر اٹھایا — کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی کاشف نے پہلی نگاہ گڑیا ہی پر ڈالی — وہ اب ہوش میں تھی شاید — لیٹی ہوئی چھت کو گھور رہی تھی اور امی چپ چاپ اس کے سرہانے بیٹھی تھیں — کاشف کو دیکھتے ہی پوچھنے لگیں — "ڈاکٹر کو لائے ہو بیٹا"

"اسے اگر ہوش آ ہی گیا ہے تو ڈاکٹر کی کیا ضرورت —؟"

"عجیب بہکی بہکی سی باتیں کر رہی ہے —" امی تشویش بھرے لہجے میں بولیں —

"تو اور کیسی کرے گی — ؟آپ کا خیال ہے کہ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی یہ عقل و ہوش کی باتیں کرے گی —؟"

امی نے مجرمانہ انداز میں سر جھکا لیا —

وہ تصویروں والا لفافہ اس کے پاس رکھتے ہوئے کاشف خود بھی وہیں بیٹھ گیا —

"گڑیا — !" اس نے بڑے پیار سے، بڑی محبت سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے "لو! دیکھ تو تیرا بھائی اپنے سارے قرض چکا آیا ہے —"

کاشف کی آواز کانوں میں اتری تو دھنک جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی —

"کاشی جی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں —؟"

"ہاں گڑیا! تیری اس بربادی کا ذمہ دار میں ہوں نا ــــ؟"

"نہیں نہیں کاشی جی! ایسا مت کہیئے' امی کی غلط سوچ نے یہ دن دکھایا ہے ــ"

"اور میری گڑیا! میری بہنا! تجھے یہ سن کر خوشی ہوگی کہ تیرا بھائی' جس کی رگوں میں تیرے باپ کا خون دوڑ رہا ہے اس نے اپنی بہن، اپنے خون کا بدلہ لے لیا ہے۔"

"کاشف! کہاں سے آئے ہو ــ؟" امی پھیلی پھیلی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے چلا پڑیں مگر کاشف نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ــ وہ دھنک ہی کی طرف متوجہ رہا ــــ

"تو جو ابھی کہہ رہی تھی ناکہ اپنی زندگی ختم کرے گی ــ نہ میری گڑیا! تم یہ اتنا بڑا گناہ کرنے کی کوشش نہ کرنا، یوں بھی ــ تیری زندگی مجھے بڑی عزیز ہے ــ میری خاطر ہی تم یہ قدم نہ اٹھانا یہ زندگی خدا کی دی ہوئی نعمت ہے وہ خود ہی جب واپس لے گا لے لے تو اسے ناجائز طریقے سے لوٹانے کی کوشش نہ کرنا ــــ کیونکہ تم اب بھی اسی طرح پاک ہو حوروں سے زیادہ مقدس ہو ــ ویسی ہی معصوم ہو ــ گناہ گار نہ بن جانا میری گڑیا ــ! تیری ساری بلائیں میں نے اپنے سر لے لی ہیں ــــ سزائیں بھگتوں گا ــ"

اسی لمحے بیرونی دروازے پر بڑے زور سے دستک ہوئی ــ دھنک اور امی نے استفہامیہ نگاہیں کاشف کے چہرے پر جما دیں ــ وہ بڑے خوب صورت انداز میں مسکرا رہا تھا ــ پھر دستک ہوئی ــــ

"میں جا کر دیکھوں ــ؟" امی نے مدھم سی آواز میں پوچھا ــــ

"نہیں امی! میں خود جاتا ہوں ــ" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا ــ چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا ــ پھر جھک کر گڑیا کے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر کتنی ہی دیر دیکھتا رہا ــــ

"تو تو میرا روشنی کا مینار ہے ــ اور ــ اسے ہمیشہ تابندہ رہنا چاہیئے تو نے مجھے غیرت کے ساتھ جینا سکھایا ہے، تیرے اجالے کی مجھے زندگی کی راہوں میں سدا ضرورت رہے گی ــ" دھنک گم سم، ایک ٹک کاشف کے خوب صورت، پرنور اور اجلے اجلے چہرے کو تکے جا رہی تھی ــــ

"سمجھ رہی ہو نا میری بات ــــ؟"

اس نے بیٹری سے ہلنے جلنے والی گڑیا کی طرح اثبات میں سر ہلایا ــــ

"اور میرے لیے پریشان بالکل نہیں ہونا ــــ"

اب دستک اتنے زور سے ہوئی جیسے ابھی کوئی دروازہ توڑ کر اندر آ داخل ہوگا ــ امی ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئیں ــ "یہ کیسی آفت ہے ــ؟"

"آپ گھبرایئے نہیں ــ یہ لوگ میرے لیے آئے ہیں ــ"

"بری ہونے کی مبارک دینے ہمارے پرانے گھر کے پڑوسی آئے ہوں گے ــ؟ تو جاؤ نا ــ اس سے باتیں پھر کر لینا ــ"

"پھر موقع نہیں ملے گا ــ اور کیا پتہ اس کی صورت بھی پھر کب دیکھنا نصیب میں ہو ــ"

"کیسی باتیں کر رہے ہو کاشی!" امی نے دھڑکتے دل کو تھام لیا "سچ سچ بتاؤ معاملہ کیا ہے ــ؟"

اس نے ماں کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا ــ

"خدا حافظ امی! گڑیا کا خیال رکھیئے گا، کیونکہ یہ اب بھی لاکھوں کروڑوں میں' اربوں میں" اور اس کے گلے میں جیسے آنسوؤں کا پھندا اٹک گیا ــ اس کی آواز وہیں ٹوٹ گئی ــ جلدی سے رخ پھیرتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا ــــ

امی اس کے پیچھے چلیں ــــ دھنک کو یکدم ہی نجانے کیا خیال آیا ــ اٹھ کر وہ بھی چلاتی ہوئی پیچھے بھاگی ــــ

"کاشی جی! میں آپ کو اکیلے کہیں نہیں جانے دوں گی ــ میں آپ کے ساتھ جاؤں گی کاشی جی ــــ!"

اس کے پہنچنے تک کاشف دروازہ کھول کر برآمدے میں نکل چکا تھا، ارادہ شاید دھنک کا بھی اس کے پیچھے پیچھے جانے کا تھا، مگر امی نے اسے بازوؤں میں بھر کر وہیں روک لیا باہر سے بہت ساری آوازیں آ رہی تھیں'

"جی ہاں ــ یہی ہے ــ یہی ہے ــــ"

ہم تمہیں شہر کے مشہور وکیل شہزاد احمد کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتے ہیں ــ

بڑے شوق سے ــ' کاشف کی آواز میں ذرا سا بھی حزن و ملال نہیں تھا وہ بڑی بے باکی سے ہمیشہ والی کھنک دار آواز میں کہہ رہا تھا ــــ

"میں تو آپ ہی کا منتظر تھا ــــ"

آج ہی تم قتل کے ایک کیس سے بری ہو کر آئے ہو نا ــ ؟"

"جی ہاں ــــ مگر وہ صرف الزام تھا اور اصل میں قتل تو میں نے اب کیا ہے ــــ بڑا مزہ آتا ہے فرض ادا کرنے میں ــ"

" فرض ادا کرنے میں ــــ ؟" تھانیدار کے لہجے میں تعجب تھا۔

"جی ہاں ــــ شہزاد کا قتل مجھ پر واجب ہو گیا تھا ــــ"

"میرا خیال ہے اس کا دماغی توازن درست نہیں ــــ"

" ٹھیک ٹھاک ہی تھا ــ یہ تو محض اداکاری کر رہا ہے ــ" منشی جی بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے ــ" تاکہ پاگل بن کر چھوٹ جائے ــــ"

پہلے قتل نہیں کیا تھا، اس لئے بری ہونا چاہتا تھا مگر اب تو میں ایسا نہیں چاہتا منشی جی! میں مکار انسان نہیں ہوں ــــ"

" عجیب سا ملزم ہے ــــ" تھانیدار کاشف کو ہتھکڑی پہناتے ہوئے بڑبڑایا ــ پھر بارعب سی آواز میں پوچھنے لگا "گھر کے اندر اور کون کون ہے ــ؟"

ساتھ ہی اس نے اندر جانے کے لئے قدم اٹھا لیا ــــــ

"اندر جانے کی کیا ضرورت ہے تھانیدار صاحب! اندر پردہ ہے ــــ"

تھانیدار وہیں ٹھٹھک گیا ــــــ

" میں اس خون کے لئے اعتراف جرم جو کر رہا ہوں پھر اور کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی چلئے مجھے جہاں لے جانا چاہتے ہیں میں حاضر ہوں ــــ"

کاشف نے سب سے پہلے قدم بڑھایا ــ تب سبھی بنگلے سے باہر نکل گئے ــــــ

"امی! یہ کیا ہوا ــــ ؟" دھنک نے کپکپاتی آواز میں پوچھا ــــــ

"ہمارا مقدر بگڑ گیا ــــ ! یہ مجھے سزا ملی ہے بیٹی! میری غلطیوں کی سزا ہے جو میرے ساتھ میرے بچوں کو بھی بھگتنا پڑ رہی ہے ــ" امی دھنک کو سینے سے لگاتے ہوئے رونے لگیں ــ

○

امی بیگم اپنے فیصلے پر اسی ثابت قدمی سے قائم تھیں کہ آثم کے آنسو، آثم کی آہیں، آثم کی التجائیں بھی ان کے پائے استقلال کو ڈگمگا نہیں سکی تھیں۔

نانی اماں نے اپنے بھولے بھالے انداز میں انہیں سمجھایا۔ مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا امی بیگم اپنے قائم کئے ہوئے اس رشتے کے خلاف کسی کی بھی زبان سے کچھ سننے کو تیار نہ تھیں۔ شوہر نے سمجھانے کے لئے قرآن و سنت کے دلائل دینا شروع کئے تو امی بیگم طیش میں آ گئیں۔

" میں بھی سب کچھ جانتی ہوں۔ سب سے پہلے تو مجھے قرآن میں سے کوئی ایسی آیت نکال کر دکھا دیجئے۔ جس کے یہ معنی ہوں کہ اولاد ماں کی نافرمانی کرے ؟"

لاجواب سا ہوتے ہوئے ابا میاں نے دوسری دلیل دی۔ "بیگم! آج کل کے دور میں بچپن کی منگنی ایسی فرسودہ رسموں کو اب ترک ہی کر دینا چاہئے۔ پڑھے لکھے اور نئی روشنی میں آنکھیں کھولنے والے بچے ان دقیانوسی رسموں کو کبھی بھی قبول نہیں کر سکتے ؟"

"ہاں ہاں۔ آج رسمیں فرسودہ ہو گئیں کل والدین کو بھی نکال باہر کریں۔ وہ بھی تو اسی زمانے کے ہیں۔ وہ بھی تو فرسودہ ہو گئے۔" امی مشتعل ہوتے ہوئے بولیں "اسی کی طرفداری سب کئے جا رہے ہیں لیکن میری پوزیشن، میری زبان، میرے وعدے کا کسی کو بھی اک لمحے کے لئے خیال نہیں آیا۔ میں جو ہر دوسرے دن انہیں خط لکھتی تھی گویا اپنے عہد کی تجدید کرتی تھی۔ میری ان تحریروں کی کوئی وقعت قدر نہیں ؟ ان لوگوں کی نگاہوں میں میری کیا عزت رہ جائے گی۔ یہ اک لمحے کے لئے بھی کسی نے سوچنا گوارا نہیں کیا۔"

" لیکن بیگم! آثم کی پوری زندگی کا معاملہ ہے ؟"

اور خاندان کی عزت، والدین کی زبان، کیا اسے اپنی خوشی ان سب سے زیادہ عزیز

ہے۔ اگر اسے اپنا اور اپنے جذبوں ہی کا صرف احساس ہے تو ٹھیک ہے۔ پھر ہماری بھی اُسے کوئی ضرورت نہیں۔ ایک اولاد اگر والدین کی عزت اور زبان کی حفاظت نہیں کر سکتی تو ہم بوڑھے لوگ کس تحفظ کے سہارے زندہ ہیں۔ میں تو اپنی آنکھوں سے اپنی عزت برباد ہوتے اور وعدہ خلافی ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ اس لئے میں تو اب اپنے خدا سے اپنی موت ہی مانگوں گی۔ اسے کہیے کچھ دن انتظار کرے۔ بڑی جلدی وہ مجھ سے اور میرے کئے گئے وعدے سے فارغ ہو جائے گا۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔؟"

"آثم نے جس طرح میری نافرمانی کی ہے، یہ صدمہ مجھے بہت دن زندہ نہیں رہنے دے گا۔ میرا اندر ٹوٹ گیا ہے۔ بکھر گیا ہے۔۔۔ مجھے اب اس زندگی سے لگاؤ نہیں رہا۔ اس لئے میں اب بہت روز جی بھی نہیں سکوں گی۔ یوں میرے ساتھ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ یہ فرسودہ رسم۔۔۔ یہ رشتہ۔۔۔ یہ وعدہ۔۔۔ پھر وہ آزاد ہو گا۔ اور آپ بھی بیٹے کا ساتھ دینے کے لئے آزاد ہوں گے۔ کر لے من مانی وہ بھی اور آپ بھی۔۔۔" امی بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔۔۔ ابا میاں نے انھیں تسلی دلاسے دیتے ہوئے ایک بار پھر وعدہ کر لیا کہ وہ آثم کو سمجھائیں گے۔

اور۔۔۔ آثم نے پہلے ہی سارا معاملہ اپنے ادارے کے بزرگوں اور تجربہ کار لوگوں کے ہاتھوں میں دے دیا ہوا تھا۔ وہ تو اب اس مسئلے پر بات ہی نہیں کرتا تھا۔ کرنل صاحب، شیدائی صاحب اور تلقین حیدر صاحب ہی نے ان سے بات کی تھی۔ قرآن و حدیث کی آیات دکھا دکھا کر انہیں وہ ڈھیروں دلائل ازبر کرائے تھے جن سے انہیں اپنی بیگم کو سمجھانا تھا۔ اور قائل کرنا تھا۔

مگر۔۔۔ بیگم کو قائل کرتے کرتے وہ تو خود ہی قائل ہو گئے تھے۔ بیگم سے بحث کی تو ایسی مات کھائی تھی، ایسی زبردست کہ آخر میں انھیں ہی ان کے آنسو اپنے رومال سے پونچھنا پڑے تھے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی یقین دلانا پڑا تھا کہ آثم کو سمجھا بجھا کر اسی رشتے پر راضی ضرور بالضرور کر لیں گے۔ کیونکہ ماں کے حکم کی تعمیل بھی

تو اس پر فرض تھی۔

آثم نے جب یہ سب کچھ سنا تو اس کی آنکھوں میں تاریکیاں سی پھیل گئیں۔ زندگی کا یہ تاریک رخ تو اس نے اب ہی دیکھا تھا۔ ورنہ وہ تو یہی سمجھتا آیا تھا۔

زندگی خوشبوؤں اور اجالوں کا دوسرا نام ہے۔ زندگی لذتوں اور آسائشوں کے نخلستانوں میں پروان چڑھتی ہے۔ زندگی محبت اور پیار جیسے لافانی جذبوں کو جنم دیتی ہے۔ جو انسان کو امر بنا دیتے ہیں۔۔۔ مگر اسے تو یہ اب ہی پتہ چلا کہ زندگی میں کانٹے بھی ہوتے ہیں، دکھ بھی اور آنسو بھی۔۔۔!!!

رات اسی جامن کے پیڑ تلے وہ صنم سے ملا تو اس کی آغوش میں چہرہ چھپا کر وہ بڑی دیر تک روتا رہا۔۔۔ ایک مرد ہو کر، آنسوؤں پر ہمیشہ ہنسنے والا مرد ہو کر بھی وہ روتا رہا۔

زندگی نے اسے کس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ ایک طرف صنم تھی اس کا پیار، اس کی زندگی، اس کی روح۔۔۔!!! اور دوسری طرف امی بیگم تھیں۔ اسے جنم دینے والی ماں۔۔۔ جس کے قدموں تلے اس کی جنت آباد تھی۔۔۔ وہ کسی ایک کو بھی چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ نہ اپنی دنیا کو، نہ عاقبت کو۔۔۔ اور وہ روتا رہا۔۔۔!!

○

کئی دن وہ ہوش اور بیہوشی کی ملی جلی کیفیت میں رہی۔ امی زبردستی اس کے منہ میں کوئی نوالہ اپنے ہاتھ سے ڈال دیتیں تو اس کے پیٹ میں کچھ چلا جاتا ورنہ اسے تن بدن کا ہوش نہیں تھا تو کھانے پینے کا کیسے رہتا۔

امی سارا سارا دن روتی رہتیں، نماز پڑھتی رہتیں۔ اور کاشف اور دھنک کے لئے دعائیں مانگتی رہتیں، شہزادی کا بہت کچھ دیا ہوا ان کے کام آ رہا تھا۔ وہ چپ

چاپ گزارہ کیے جا رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ انہیں آگے چل کر کیا کرنا تھا۔ کوئی بھی تو صحیح راستہ انہیں سوجھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ دن کچھ اور بھی مشکلات لیکر آگیا جب اس کوٹھی کا مالک ان کے دروازے پر کھڑا تھا اور اگلے دو مہینوں کا کرایہ پیشگی مانگ رہا تھا۔ سات سو روپیہ مہینہ کے حساب سے چودہ سو بنتے تھے۔ یہ تو آج تک انھیں معلوم ہی نہ تھا کہ یہ کرائے کی کوٹھی تھی۔ اور اتنا ڈھیر سارا اس کا کرایہ تھا۔ وہ تو بس شہزادی کی سمجھتے ہوئے اس کی شان وشوکت میں ڈوب گئی تھیں۔ کوٹھی کے مالک سے اگلے مہینے ادا کرنے کا وعدہ تو کر بیٹھی تھیں مگر اب کریں کیا۔ ایک آدھ مہینے کے گزارے کیلئے نقد پانچ سات سو روپیہ صرف پاس تھا۔ وہ اسے دے بیٹھتیں تو خود کیا کرتیں۔ یہ کپڑے لتے، زیورات اور برتن تو بیچنے سے رہیں۔ یہ سب تو دھنک کی شادی کیلئے تھا اور وہ اسی مد میں خرچ کرنا چاہتی تھیں۔ اس کے سسرال سے بھی تقاضے پر تقاضے ہو رہے تھے۔

بہت ساری سوچوں کے بعد انہوں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ ہفتے عشرے میں ہی بڑی سادگی سے دھنک کا نکاح پڑھا کر سسرال رخصت کر دیں گی۔ اور خود یہ کوٹھی چھوڑ کر اپنے پرانے مکان میں اٹھ جائیں گی۔ پھر دوسرا مکان فروخت کر کے کاشف کے مقدمے پر لگا دیں گی۔ اور خود سلائی کڑھائی وغیرہ کر کے اپنا گزارہ کر لیا کریں گی۔

اپنی ہی یہ سوچ انھیں بے حد مناسب لگی۔ ان حالات میں ایسی جوان اور خوبصورت بیٹی کا ساتھ زیادہ مصائب کھڑے کر سکتا تھا پہلے کا تجربہ اتنا تلخ تھا۔ اتنا گھناؤنا تھا کہ وہ وہی غلطی پھر دہرانا نہیں چاہتی تھیں۔

دھنک اپنے کمرے میں تھی۔ امی جلدی جلدی اٹھیں۔ اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے آنٹی کی امی کو اگلے ہی جمعہ کے متعلق لکھ دیا کہ چونکہ کاشف کو ملازمت کے سلسلے میں اچانک ہی ملک سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ اور وہ

اکیلی بوڑھی جان، جوان اور خوبصورت بیٹی کی حفاظت نہیں کر سکتی تھیں اس لیے دو چار لوگ آئیں اور سادگی سے نکاح پڑھوا کر اپنی امانت کو لے جائیں۔

خط لکھ کر فارغ ہوئیں تو گھر میں جوان سِلے کپڑے وغیرہ تھے انہیں مکمل کر لینے کے متعلق دھنک سے مشورہ کرنے اس کے کمرے میں پہنچیں، کچھ اس کے کان میں شادی کی خبر بھی ڈالنا چاہتی تھیں تاکہ وہ اپنی حالت کو اب ذرا درست کر لے اور ہوش وحواس بھی۔

دھنک چپ چاپ اپنے پلنگ پر لیٹی بلا مقصد ہی چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ امی اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ "دھنک! بیٹی مجھے ایک بات کرنا تھی"

دھنک اٹھ کر بیٹھ گئی اور استفہامیہ نگاہوں سے ماں کو تکنے لگی۔

"تمہیں معلوم ہے نا کہ یہ کوٹھی کرائے کی ہے"

"جی ہاں ——"

"اس کا مالک آیا تھا اور دو ماہ کا کرایہ چودہ سو روپیہ مانگ رہا تھا۔ شہزاد اسی طرح دو ماہ کا اکٹھا اور پیشگی ہی دے دیا کرتا تھا——"

"پھر——" دھنک مسکرائی —— "اس کا دیا ہوا بہت کچھ آپ کے پاس ہوگا۔ دیدیا ہوتا—— اتنی خوبصورت کوٹھی میں رہ رہے ہیں۔ شان و شوکت اور آسائشیں مفت ہی تو نہیں مل جایا کرتیں——"

"دیکھ دھنک! یوں طنزیہ لہجہ اختیار نہ کر—— میں لاکھ بار تم سے معافی مانگ چکی ہوں، خدا بھی اپنے بندوں کا بڑے سے بڑا گناہ معاف کر دیا کرتا ہے۔ تو کیا تو میرا یہ معصوم گناہ معاف نہ کرے گی، جو اک ماں نے اپنی اولاد ہی کی خاطر کیا——"

"معاف کر دوں گی امی! میں تو معاف کر دوں گی —— مگر میرا جو کچھ لٹا وہ مجھے کون واپس دلائے گا امی! میری وہ لٹی عزت کیسے واپس آئے گی——"

وہ گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی۔

"تیرے بھائی نے بھی تجھے سمجھایا تھا اور آج میں بھی سمجھا رہی ہوں کہ بھول جا

اس واقعہ کو۔ سمجھ تیری زندگی میں ۔ وہ رات آئی ہی نہیں ۔۔۔ اور ۔۔۔"

امی چند لمحے خاموش رہ کر دبے دبے سے لہجے میں بولیں ۔۔۔ "کوئی نہیں جانتا۔ اس بات کو ۔۔۔ شہزاد ختم ہو گیا ۔۔۔ تیرے بھائی نے باقی بھی سارے تیری تباہی کے نشانات اور ثبوت مٹا ڈالے ہیں ۔ اب تیرا اس قتل سے، شہزاد سے کوئی تعلق کوئی واسطہ نہیں ۔۔۔ کاشف یقیناً مر جائے گا مگر زبان سے اس داستان کا ایک حرف نہیں نکالے گا۔ اور میں تیری ماں ہوں ۔ میں بھی سدا اپنی اولاد کی بھلائی چاہوں گی ۔۔۔ باقی رہ گئی تو ۔۔۔ تو تو نے دانستہ کوئی گناہ نہیں کیا۔ کوئی غلط حرکت نہیں کی ۔۔۔ بس ، آج سے اپنی زبان بند کر لے ، اس واقعہ کو حرفِ غلط کی طرح کتابِ زندگی کے ورق سے مٹا ڈال ۔۔۔"

" آپ کہنا کیا چاہتی ہیں امی ۔۔۔ ؟" دھنک نے آنسوؤں میں بھیگا سپید چہرہ اٹھایا اور آنکھیں ماں پر مرکوز کر دیں ۔

"میں یہ چاہتی ہوں کہ میں یہ کوٹھی چھوڑ کر اپنے پرانے گھر میں چلی جاؤں ۔ دوسرا مکان فروخت کر کے کاشف کے مقدمے پر لگا دوں اور اپنا خرچ محنت مزدوری یا سلائی کڑھائی وغیرہ کر کے چلاتی رہوں ۔۔۔"

" آپ کی اس گفتگو اس تجویز میں امی میرا نام نہیں آیا ۔۔۔ ؟"

" تم یہاں ہو گی جو نہیں ۔۔۔"

" کیا مطلب ۔۔۔ ؟"

" اگلے جمعہ کو تمہاری شادی ہے نا ۔۔۔"

" کیا ۔۔۔ ؟" وہ متعجب سی ہو کر چلا پڑی ۔ "میری شادی ۔۔۔ ؟ کس کے ساتھ ۔۔۔ ؟"

" جس کی تم بچپن کی منگیتر ہو اسی کے ساتھ ۔ اور کس کے ساتھ ۔۔۔ ؟"

" نہیں نہیں ۔۔۔ میں یہ شادی نہیں کروں گی ۔۔۔ کبھی نہیں کروں گی ۔۔"

" یہ کیا کہہ رہی ہو ۔۔۔ ؟ پہلے تو تم نے ایسی بات کبھی نہیں کی تھی ۔۔"

" پہلے کی بات اور تھی ۔۔۔ اب میں آتم کے قابل نہیں رہی ۔۔۔"

" پھر وہی بات ۔۔۔ میں نے کہا ہے نا ، بھول جاؤ سب کچھ ، اور آؤ میرے ساتھ مل کر شادی کی تیاری کرو ۔۔۔ میں اکیلی کیا کیا کروں گی ۔۔"

" امی ! میں نے کہا ہے نا کہ میں شادی نہیں کروں گی ۔۔" اس کا لہجہ اب بہت سخت تھا ۔۔۔ " آپ پھر وہی بات دھرائے جا رہی ہیں ۔"

" پھر اپنے مستقبل کا بھی سوچا ہے کچھ ۔۔۔ ؟"

دھنک پھر رو دی ۔۔۔ " اب جیسا بھی میرا مستقبل گزرے ، گزر نے دیجئے ۔ میں ان لوگوں کو کسی دھوکے میں نہیں رکھ سکتی ۔۔۔ میں آتم کو کوئی فریب نہیں دے سکتی امی ۔۔۔ !" سسکیوں سے اس کا وجود ہچکولے کھا رہا تھا۔

" آپ کہتی ہیں سب کچھ بھول جاؤں ، میں بھول جاؤں گی ۔ اپنے آپ کو دھوکہ دے لوں گی ۔۔۔ مگر امی ۔۔۔ میں کھوٹے مال کو کھرا کہہ کر کسی کے آگے پیش نہیں کروں گی ۔۔۔ میں آتم کے ساتھ بد دیانتی نہیں کر سکتی ۔ میں نے اس کی پرستش کی ہے ۔۔۔ مجازی خدا مان کر اور ۔۔۔ جس کی عبادت کی جائے اس کے سامنے تو اپنے گناہوں کا اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا جاتا ہے ۔۔۔ اس کے ساتھ بے ایمانی یا دھوکہ تو نہیں کیا کرتے ۔"

" جانے تم کیسی باتیں کر رہی ہو ۔۔۔ ؟" امی قدرے الجھ سی گئیں ۔۔۔" اپنے حالات بھی تو ہمیں دیکھنا چاہئیں ۔۔۔ تم جوان ہو ، خوبصورت ہو ۔۔۔ بھائی قاتل ہے ۔۔۔ مقدمہ چلنا شروع ہو گیا ہے ۔ میں بوڑھی ہوں ۔۔۔ سر پہ کوئی سائبان نہیں ۔۔۔ بتاؤ ۔۔۔ زندگی آگے کیسے چلے گی ۔۔۔ ؟"

" لعنت ہے اس زندگی پر جس کو زندہ رکھنے کیلئے دھوکے اور فریب کا سہارا لیا جائے ۔۔۔ بے ایمانی کو اپنا شعار بنا یا جائے ۔۔۔"

" لیکن بیٹی ۔۔۔ !" امی نے اسے منانے کے لئے آنسوؤں کا ہتھیار استعمال کیا ۔ " کچھ خاندان کی عزت کا بھی خیال کرو ۔ بچپن کی منگنی اگر اب ٹوٹ گئی تو کیا خاندان کی عزت خاک میں نہیں نہیں مل جائے گی ۔۔۔ ؟"

بہتی آنکھوں کے ساتھ دھنک وحشیانہ انداز میں زور سے اک قہقہہ لگا اٹھی ۔ "کونسی

عزت کی آپ بات کر رہی ہیں امی ــــ بیٹا خونی، بیٹی کا دامن داغدار ــ آپ کس عزت کی بات کر رہی ہیں ــ" وہ کتنی ہی دیر ہنسے گئی، پھر یکایک اس کی ہنسی تھم گئی اور وہ جنونی سے انداز میں چیخ پڑی۔

"میں تو اسی رات مرجاتی امی! پہلے چند گھنٹے زندگی سے مستعار لیئے تو کاشی جی کی خاطر ــ پھر ــ انہوں نے سمجھایا ــ کچھ سمجھی ــ اور ــــ زیادہ اسی وقت بھی جب میرے کاشی جی کو پولیس پکڑ کر لے گئی ــ تب میں نے زندگی کو زندہ چھوڑ دیا کہ اب اس پر اک اور فرض عائد ہو گیا ہے ــ مجھے اپنے کاشی جی کو موت کے منہ سے نکالنا ہے تم مجھے شادی کا کہہ کر مجھے اپنے اس فرض سے غافل نہ کرو ــ ویسے ہی ــ میں تمہیں آخری بار کہہ دوں ــ میں اب اپنا یہ منہ لے کر آثم کے پاس کبھی نہیں جاؤنگی ــــ کبھی نہیں ــ کبھی نہیں ــــ!!"

"اپنی ہی کہے جاتی ہو۔ کچھ میرے دکھ کا بھی تو اندازہ کرو ــ ان کی پریشانی کا بھی احساس کرو ــ ان لوگوں کو میں کس طرح اور کیا جواب دوں آخر ــ؟ وہ جو اتنے سالوں سے تیری دیکھ ریکھ کر رہے ہیں، ہر دوسرے دن ساجدہ بہن کا خط آتا رہا ہے۔ یکایک انہیں انکار میں جواب پہنچ گیا تو ان کی کیا حالت ہو گی ــ؟ یہ بھی سوچا ہے ــ؟"

"شکر کریں گے ایسے بدنام زمانہ لوگوں سے پیچھا چھوٹ گیا ــ" دھنک آنسوؤں سے لبریز آنکھیں ماں پہ گاڑ کر قہقہہ لگا اٹھی۔

"پاگلوں والی باتیں مت کرو اور تھوڑی دیر کے لئے عقل کی پتوار تھام لو ــــ" امی بھی اب ماں والے جلال میں آگئیں۔ "میں انہیں خط لکھ چکی ہوں کہ کاشف کو نوکری کے سلسلے میں ملک سے باہر جانا پڑ گیا ہے اور جوان لڑکی کی حفاظت میں بڑھیا اکیلی نہیں کر سکتی، اگلے جمعہ کو برات لیکر آئیں اور نکاح پڑھا کر لے جائیں ــــ"

"لکھ دیا ہے انھیں ــ؟"

"ہاں ــــ"

"اوہ یہ کیا کیا امی؟ اتنے بڑے بڑے اور سفید جھوٹ ــــ بیٹا جیل میں ہے،

اور آپ نے لکھ دیا ہے کہ ملک سے باہر گیا ہے یہ آپ نے کیا کیا ــــ؟"

"یہ عزتوں کے معاملے ایسے ہی ہوتے ہیں ــ جب تم اولاد والی ہو گی اور میری عمر کو پہنچو گی تو تب تمہیں اندازہ ہو گا کہ یہ دنیا کیا ہے۔ اور اس میں گذارہ کرنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے ــ"

"اس وقت آپ جھوٹ بول دیں گی اور اگر بعد میں انہیں پتہ چل جائے کہ کاشی جی ملک سے باہر نہیں گئے بلکہ جیل میں ہیں ــ تب ــــ؟"

"تب کیا ہو جائے گا ــ؟ تم اپنے گھر میں بس رہی ہو گی۔ تمہیں تو گھر سے باہر نکالنے سے رہے۔ مجھ بڑھیا سے میل ملاپ بیشک ختم کر دیں ــ تمہارا تو مستقبل سنور ہی جائے گا نا ــــ"

"امی! خدا کے لئے بس کیجیے ــ آپ کے ایسے ایسے منصوبے اب ساتھ دوسرے خاندان کو بھی برباد کر دیں گے، ہم تو برباد ہو ہی چکے ــ اب میں کسی اور کو برباد نہیں ہونے دوں گی۔ میں ساری زندگی ان لوگوں کی بہی خواہ رہی ہوں۔ میں نے آتی جاتی سانس کے ساتھ ان سب کیلئے دعائیں مانگی ہیں۔ ان کی بہتری کی، ان کیلئے راحتوں اور خوشیوں کی۔ اور آج میں بدل گئی ہوں بے شک مگر میری وفا نہیں بدلی۔ میرے دل میں ان کے لئے اسی طرح عزت ہے۔ ویسی ہی تمنائیں ہیں۔ ویسے ہی ان کیلئے خوشیوں کی خواہاں ہوں، اسی لئے ــــ" وہ جوش و جذبے کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے یہ سچ بولنا ہی پڑے گا ــ آپ میں اگر انہیں کچھ بتانے کی، کچھ کہہ کر یہ رشتہ ختم کرنے کی ہمت نہیں ہے تو مجھ میں ہے ــ"

"نہیں گڑیا! تم ایسا نہیں کرو گی ــــ نہیں کرو گی ــ"

"مجھے میرے اس ارادے سے دنیا کی کوئی طاقت باز نہیں رکھ سکتی۔ آپ کسطرح روک لیں گی ــ؟" اس نے الماری میں سے پیڈ اور قلم نکالا۔

"دیکھ دھنک! میں اپنی جان دے دوں گی ــ" امی نے آخری حربہ استعمال کیا اور یہ کارگر ہو گیا ــــ دھنک کتنی ہی دیر کھڑی کچھ سوچتی رہی۔

"کچھ بھی ہوا ہیں، آپ کی جان تو نہیں لے سکتی۔۔۔" اس نے واپس سب کچھ رکھ دیا۔

"شاباش میری بیٹی! آؤ پھر۔۔۔ کل جمعہ ہے اور اس سے اگلے جمعہ تک نو دن بنتے ہیں۔۔۔ بہت تھوڑا وقت ہے اور تیاری بہت کرنے والی ہے۔ آؤ میرا ہاتھ بٹاؤ"

دھنک ماں کے ساتھ کام کرنے لگی، جو جو کچھ امی نے کہا، اس نے فوراً کیا۔ اس دن دھنک نے کھانا بھی ٹھیک طرح کھایا۔ امی اس کی اس تبدیلی پر بہت خوش تھیں۔

"ناحق اتنی لمبی چوڑی بحث کی، سر کھپایا۔۔۔ پہلے ہی جان دے دینے کا ڈراوا دے دیتی تو اچھا ہی تھا نا۔۔۔ چلو شکر ہے اب بھی۔۔۔ معاملہ تو سدھر گیا نا۔۔۔"

امی سوچ رہی تھیں اور کام میں لگی ہوئی تھیں۔ رات گئے تک وہ خود بھی مصروف رہیں اور دھنک کو بھی لگائے رکھا۔

"امی! مجھے تو اب نیند آ گئی۔۔۔" دھنک جمائی لیتے ہوئے بولی۔

"جا میری جان! اب سو جا۔۔۔ آج کام بھی تو بہت کیا ہے۔ تھک گئی ہو گی۔"

امی چمکتی آنکھوں سے اس سرخ جوڑے کو دیکھ رہی تھیں جس پر سارا دن دونوں ماں بیٹی گوٹہ لگاتی رہی تھیں۔۔۔ دھنک نے ہاتھ میں ہی پکڑ رکھا تھا تو اس کا سارا وجود جگمگ جگمگ کرنے لگ گیا تھا۔ پہننے پر تو قیامت ہی کھڑی ہو جانا تھی۔ امی تصور کی آنکھ سے اس قیامت کو دیکھ رہی تھیں۔

"آپ بھی اب سو جائیے۔ میں ان آٹھ نو دنوں میں سارا کام مکمل کر دوں گی۔ آپ بالکل فکر نہ کیجیے۔۔۔"

"بڑی اچھی ہے میری بیٹی! خدا تجھے سدا سکھی رکھے۔۔۔" وہ اسے ڈھیروں ڈھیر دعائیں دیتے ہوئے سب کچھ سمیٹنے لگیں۔

دھنک اپنے کمرے میں چلی گئی، وقت دیکھا، بارہ بج رہے تھے، کمرے کی اندر سے چٹخنی لگا کر اس نے الماری میں سے پیڈ اور قلم نکالا۔

"بھولی امی! آپ کیا سمجھتی ہیں کہ میں جھوٹ، فریب اور بددیانتی کی بنیاد پر آپ کو اپنے مستقبل کی عمارت کھڑی کر لینے دوں گی۔۔۔؟"

مسکراتے ہوئے اس نے پیڈ کھولا اور قلم ہاتھوں میں پکڑ لیا۔۔۔ ایک خط اس نے امی بیگم کے نام لکھا، بہت مختصر سا۔ اس نے اس میں صاف لکھ دیا کہ کاشف پر پہلے بھی قتل کا الزام تھا بڑی دیر مقدمہ چلتا رہا، مگر انہیں ہر بات سے بے خبر رکھا گیا۔ پھر وہ بری ہو کر آیا تو اس نے اپنے دوست کا سچ مچ خون کر دیا۔ اس لئے کہ اس کے دوست کے ناجائز تعلقات اس کی بہن کے ساتھ تھے۔ اور اب پھر وہ جیل میں تھا اور مقدمہ چل رہا تھا۔ یوں۔ انہیں اس شادی کے متعلق سوچ لینا چاہیئے تھا۔ آثم ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور ان کا خاندان عزت دار۔۔۔!!

دوسرا خط اس نے آثم کے نام لکھا۔۔۔ آثم کے ساتھ اٹھارہ سال اس کا تعلق رہا تھا۔ بڑا گہرا تعلق۔۔۔! اور یہ تعلق اس بات کا متقاضی تھا کہ پوری دیانتداری اور سچائی کے ساتھ اسے ہر معاملے، ہر بات کی خبر ملنا چاہیئے تھی۔ دھنک نے اپنا یہ فرض پوری طرح ادا کرنے کی کوشش کی۔

جس دن اس نے اپنے نام کے ساتھ پہلی بار آثم کا نام سنا تھا۔ اسی دن سے اس نے وہ خط شروع کیا۔

آثم کے ساتھ اس کا جنم جنم کا ناطہ تھا۔ اور آج وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ رہا تھا۔۔۔ تب۔۔۔ اس نے اپنے دل کی، اپنے جذبوں کی، اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کی پوری داستان بڑی تفصیل سے اسے لکھ دی۔

وہ ساتھ ساتھ روتے جا رہی تھی۔۔۔ ساتھ ساتھ لکھے جا رہی تھی۔۔۔ اپنی ساری یادیں سمیٹ کر انہیں آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر رہی تھی۔

کیسے کیسے اس نے اسے چاہا۔ کس کس طرح ہر سانس کے ساتھ اس کا نام لیا۔ کس کس انداز میں اس کی پرستش کرتی رہی۔ سب کچھ اس نے تحریر کر دیا۔۔۔ مگر اب۔۔۔ وہ اس قابل نہیں رہی تھی کہ اپنی محبت اور عقیدت کے پھول داسی بن کر اپنے دیوتا کے چرنوں میں خود چڑھانے حاضر ہوتی۔ وہ تو اب اس آکاش کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے کی بھی اپنے میں جرأت نہیں پاتی تھی کہ وہ دھرتی کی خاک بن گئی تھی۔

وہ پاؤں تلے روند ڈالی گئی تھی۔

پھر اس نے کاشف، شہزاد اور دھنک کی داستان کا اک اک لفظ، گزری زندگی کا اک اک لمحہ صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا۔

وہ ساری زندگی آثم کی ذات کو اپنی پناہ گاہ سمجھتی رہی تھی۔ اپنا مجازی خدا مانتی رہی تھی ـــ کیونکہ وہ اس کا منگیتر تھا ـــ اور اسی طرح ـــ دھنک آثم کی منگیتر تھی۔ آثم نے بھی اٹھارہ سال پہلے دھنک کا نام سنا تھا۔ یقیناً اس کے دل میں بھی اس کے لئے وہی سارے جذبے موجود ہو سکتے تھے۔ اسی طرح اس کے بھی خیالوں میں نگاہوں میں اور خوابوں میں وہ بستی رہی ہو گی، پھر انہی جذبوں، انہیں احساسات اور تعلق کا واسطہ دیتے ہوئے دھنک نے اسے تاکید کی کہ وہ اسے معاف کر دے اور اسے ایک بیحد بری لڑکی سمجھ کر فراموش کر دے۔ اپنے ذہن سے، اپنی زندگی سے، اپنے تصوّرات سے اسے نکال دے۔

خط ختم کر کے اس نے دونوں لفافے مٹھی میں جکڑے اور دبے دبے قدموں سے جا کر امی کے کمرے میں جھانکا۔ دیر سے سونے کی وجہ سے وہ بہت گہری نیندیں ڈوب چکی تھیں ـــ دور سے دیکھا ـــ پھر قریب جا کر بھی پرکھا۔ وہ ذرا بھی ہلی جلی نہیں تو دھنک پلٹی ـــ کمرے سے نکلنے لگی تھی کہ نگاہ امی کے بستر کے ساتھ والی میز پر پڑ گئی ـــ وہاں پہلے سے ایک خط پڑا ہوا تھا۔ جلدی سے بڑھ کر اٹھایا۔

وہ تو وہی خط تھا جو امی نے ای بیگم کے نام آج صبح ہی لکھا تھا۔ جس میں شادی اگلے جمعہ کو کر لینے کی تاکید تھی ـــ امی وہ خط پوسٹ کرنا شائد بھول گئی تھیں۔ دھنک نے وہ بھی مٹھی میں جکڑ لیا۔

"دیکھا امی سچائی کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ خدا کو بھی آپ کی یہ بددیانتی پسند نہیں آئی تھی۔ تبھی تو آپ یہ خط پوسٹ کرنا بھول گئیں ـــ"

تینوں خط لے کر، چادر میں اچھی طرح اپنے جسم کو لپیٹتے ہوئے وہ چل پڑی۔ لیٹر بکس ان کی کوٹھی سے پانچ سات کوٹھیوں کے فاصلے پر مڑنے والی سڑک کے

عین کونے میں نصب تھا۔ دن کے وقت اور امی کے جاگتے ہوئے یہ کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنا فرض نبھانے کے لئے اور سچائی کا راستہ اختیار کرنے کے لئے رات کی تاریکی نے اسے روشنی دکھا دی۔

اس نے بہت سارے آخری آنسو بہاتے ہوئے، ہچکیاں لیتے ہوئے، بلکتے ہوئے اور لرزتے کپکپاتے ہوئے وہ دونوں خط پوسٹ کر دیئے۔ اس نے سب کچھ اپنا سب کچھ گویا اپنے ہاتھوں سے مٹی تلے دفن کر دیا۔ اپنی بنی بنائی روشن اور جگمگ جگمگ چمکتی تقدیر پر سیاہی کی لکیر پھیر دی۔

بھیگے رخسار، بھیگی پلکیں صاف کرتے ہوئے واپس ہونے لگی تو بائیں ہاتھ کی بند مٹھی کیطرف دھیان چلا گیا۔ اس میں امی والا خط بند تھا۔ اسے پھاڑا، اس کے ننھے ننھے بے شمار ٹکڑے کر ڈالے۔ اسی طرح تو اپنا مقدر اک سچائی کی خاطر اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ پھر وہ ٹکڑے اس نے ہوا میں اچھال دیئے اک اک پرزہ دور تک اڑتا چلا گیا۔ اس کے اپنے من کے پرزوں کی طرح۔ وہ زور سے ہنس پڑی۔

ہو کا عالم تھا اور رات تاریک ـــ شکر کیا کہ اس کی ان دیوانگی بھری حرکات کو کوئی دیکھ نہیں پایا تھا ـــ اور وہ واپس گھر کو لوٹ گئی۔

○

"یہ اک کاغذ ہے نا اور بھائی جان کہتے ہیں دس کا نوٹ ہے ـــ؟" معصوم کی آنکھوں کے سامنے کاغذ کا اک چھوٹا سا پرزہ نچا رہی تھی ـــ" وہ مجھے کہتے تھے جا کر بیگ اپنی آپی کو دکھا لو دیکھئے نا بھلا یہ کوئی دس کا نوٹ ہے ـــ؟"

"امی! تم بھی عجیب ہو ـــ بچوں کے ساتھ کیسی ضدیں لگا بیٹھتے ہو۔" وہ مسکرائی بڑی عقیدت کے ساتھ اس نے آنکھوں میں اس کی تصویر بسا کر دل ہی دل میں

اس کے ساتھ بات کی۔

"دکھاؤ نا ــــــــ" صنم نے ننو کے ہاتھ سے وہ کاغذ کا پرزہ لے لیا۔

"رات کو جامن کے پیڑ تلے ــــ ضرور ضرور ــــ" اس کاغذ کے پرزے پر ٹیڑھا میڑھا سا تحریر تھا۔ صنم چونکی ــــ یہ یقیناً اسی کے لئے پیغام تھا۔ اس نے جلدی سے اسے مٹھی میں دبا لیا۔

"سچ مچ بڑے عجیب ہو ــــ بڑے معصوم ــــ بڑے دلچسپ اور بڑے پیارے میرے اپنے ــــ میرے آثمی ــــ" دل کے ساتھ کی جانے والی بات مکمل ہو گئی۔

"کہتے تھے اس کی پوری کی پوری سات کونز میں اکیلی کھا لوں ــــ اس کی سات کونز نہیں آسکتے نا آپی ــــ؟"

"پگلو! یہ کاغذ ہے ــ وہ تجھ سے شرارت کر رہے تھے ــــ"

"بڑے شریر ہیں ــــ" ننو نے انتہائی مایوسی سے صنم کی طرف دیکھا۔ سات کونز کھانے کی آس کیسے چند لمحوں میں ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ وہ بڑی افسردہ ہو گئی۔

"لو ــ یہ دس روپے کا نوٹ ــــ"

"کیوں آپی ــــ یہ مجھے کیوں دے رہی ہیں ــــ؟"

"جا کر بھائی جان سے کہو کہ آپی کہتی ہیں دس کا نوٹ ایسا ہوتا ہے اور میری ننو کو اس سے پوری کی پوری سات کونز لے دیں ــــ"

"سچ ــــ؟" ننو نے لال گلابی چہرے سے صنم کو تکتے ہوئے وہ نوٹ تھام لیا۔

"ہاں سچ ــــ"

ننو وہ لے کر بھاگ گئی اور صنم ہنسنے لگی ــ آج اس کی ممی گھر میں نہیں تھیں اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آثم نے کتنے پیارے انداز میں اس تک پیغام پہنچایا تھا۔ پچھلی دو تین راتوں سے وہ اس سے ملنے کے لئے جا بھی تو نہیں سکی تھی۔ اور خود اس کا اپنا دل آثم کو دیکھنے کے لئے بڑی بری طرح بے تاب ہو رہا تھا۔ آج رات

تو کچھ بھی ہو جاتا اس نے چلے ہی جانا تھا۔ بلاشبہ ساری رات ڈیڈی اور ممی جاگ کر اس کا پہرہ دیتے۔ اس نے کسی کی پرواہ ہی نہیں کرنا تھی۔ وہ اتنی بے قرار تھی اسے ایک نظر دیکھنے کیلئے ــــ!

زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا نا کہ اس کے ڈیڈی اور ممی اسے مار ڈالتے سوہنی بھی تو جانتے بوجھتے ہوئے کچے گھڑے پہ سوار ہو گئی تھی ــــ وہی دنیا تھی اب بھی ــــ ویسے ہی لوگ تھے اور اسی طرح کے ان کے جذبے! وہ اک سوہنی تھی ــــ! وہ اک ہیر تھی ــــ!! وہ اک سستی تھی ــــ!!!

انہیں سوچوں میں ڈوبے کھوئے رات ہو گئی۔ ممی اور ڈیڈی دعوت سے تھکے ہوئے آئے تھے۔ جلد ہی اپنی خواب گاہ میں چلے گئے ــــ صنم اٹھی ــــ شال لپیٹی اور اپنے محبوب کو ملنے چل دی۔ جامن کے پیڑ تلے وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا ــــ" اثمی!" اس نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا ــ وہ چونک پڑا۔

"تم آگئیں ــــ؟ بہت راہ دکھائی ــــ؟"

اور ــــ جانے کیوں ــ؟ آج آثم کے بازو اس کے لئے نہیں پھیلے تھے۔ آثم کے بازوؤں میں سما کر اس کی چھاتی میں اپنا چہرہ گھسا لینے کی شدید ترین خواہش کے باوجود وہ چپکے سے صرف اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"آج تم سے مجھے ایک بہت ضروری بات کرنا تھی ــــ" یہ آثم کا گمبھیر سا لہجہ اور یہ اس کا کھویا کھویا سا انداز ــ! صنم کا دل دھک کر کے رہ گیا۔

یوں تو وہ بہت دنوں سے اک تکلیف دہ دور سے گزر رہے تھے مگر ایسی حالت اس نے آثم کی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ وہ پریشان بھی رہتا تھا۔ وہ اس کی آغوش میں چہرہ چھپا کر کتنی کتنی دیر رویا بھی تھا ــ مگر پھر بھی ــــ دونوں ہی کو امید واثق تھی کہ آخر فیصلہ انہیں کے حق میں ہو گا۔ سبھی ان کے طرفدار تھے۔ انہیں ہی حق پہ سمجھتے تھے۔ اک امی بیگم اکیلی کتنا عرصہ اپنی ضد پہ قائم رہ سکتی تھیں۔ یوں بھی آثم ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ آخر کہاں تک وہ دل سخت کر سکتی تھیں۔

لیکن — لیکن یہ آثم کی آج کی کیفیت — ! یہ بہت مختلف تھی، نہ آنکھوں میں آنسو تھے، نہ لبوں پر آہیں، نہ اس نے اپنی چھاتی کے ساتھ لگایا تھا نہ اپنا چہرہ اس کی آغوش میں چھپا کر، سب پریشانیوں کو بھول جانا چاہا تھا — اور — اور نہ تھا اس کے رخ پر اپنی مراد کو پا لینے کی خوشی کی چمک اور لبوں پر مسکراہٹوں کے کھلتے کنول ہی تھے — !!

پھر یہ کیا تھا — ؟ کیوں تھا — ؟؟ صنم نے دھک دھک کرتے دل کو تھام لیا۔

"آج ہمارے پاس ایک نوجوان بڑی عجیب سی اپنی مشکل لے کر آیا ہے۔ اسی سلسلے میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا تھا —"

"میں اتنی بھی تو عقل مند نہیں ہوں اثمی — !"

"یہ تو صنم — ! کچھ ہم ہی جانتے ہیں کہ تم کیا ہو — " پھر آثم یکدم سنجیدہ ہو گیا "سناؤں وہ بات — ؟"

"ہاں —" صنم ہمہ تن گوش ہو گئی "ضرور سناؤ"

"اس نوجوان کی منگنی بچپن میں ہی اپنی کسی رشتہ دار کے ساتھ ہو گئی تھی، لیکن وہ کسی اور لڑکی سے پیار کرتا ہے"

"بالکل تمہارے جیسا معاملہ اثمی — !"

"ہاں — اس لڑکے کے والدین نے بھی اسی طرح اس رشتے کو اپنی عزت اور وقار کا مسئلہ بنا لیا ہے وہ ہر صورت اپنی زبان اور وعدے کے پابند رہنا چاہتے ہیں اور لڑکا اپنی محبت پانا چاہتا ہے۔ وہ اس کے بغیر اک پل نہیں رہ سکتا۔ اس کے خوابوں کی تعبیر وہ ہے۔ اس کی حیات کی خوشیاں صرف اس کے دم سے ہیں۔ اس کی زندگی کی ہر آرزو، ہر تمنا اس کے ساتھ وابستہ ہے —"

"پھر — ؟" آگے جاننے کیلئے صنم جیسے بیقرار سی ہو اٹھی۔

"کل اچانک اس لڑکے کو اپنی منگیتر کا ایک خط ملا ہے"

"منگیتر کا خط — ؟"

"ہاں —"

"اس کے ساتھ اس کی خط و کتابت تھی — ؟"

"نہیں بھئی نہیں — اور ہو بھی کیسے سکتی تھی صنو ! تم بڑی بیوقوف ہو — پیار وہ کسی دوسری لڑکی کے ساتھ کرتا تھا اور خط و کتابت اس کے ساتھ ہوتی تھی — ؟"

"مگر پھر اس کی منگیتر نے اسے خط کیوں لکھا — ؟"

"وہی تو بتانے لگا ہوں —" اور پھر آثم نے دھنک کی ساری داستان اسے سنا دی۔

"ہائے ! ایسا ظالم — ! ایسے بھی دوست دنیا میں ہوتے ہیں — ؟"

"دوست تو وہ اس کے بھائی کا بھی نہیں تھا —"

"پھر بھی — دعوے تو کرتا تھا نا — مگر بڑا ذلیل انسان ثابت ہوا —" صنم اس لڑکی کی ہمدردی میں بڑبڑانے لگی۔

"اب تم بتاؤ صنم ! وہ لڑکا اس وقت کامیابی اور ناکامی کے دوراہے پر کھڑا ہے اس وقت وہ چاہے تو یہ رشتہ توڑ کر اپنی محبت، اپنی چاہت کو حاصل کر سکتا ہے"

"نہیں آثم ! نہیں —" صنم یکایک چیخ سی پڑی "اسے کہو وہ ایسا نہ کرے، وہ یہ رشتہ نہ توڑے، بلکہ اپنے والدین کی بات مان لے، اپنی منگیتر کے ساتھ شادی کر لے —"

"لیکن صنم ! اس کی محبت، اس کی پوری زندگی کی خوشیاں — ؟"

"اثمی ! محبت کی کامیابی یا محبوب کے وصل کی خوشی سے بھی کہیں بڑھ کر بعض راحتیں ہوتی ہیں۔ دل کے بجائے انسان، انسانیت اور درد کے رشتوں کو اپنا لے تو خدا کے حضور تو کیا خود اپنی نگاہوں میں بھی سرخرو ہو جاتا ہے — اور پھر اس وقت اسے جو سکون، جو راحت نصیب ہوتی ہے وہ سب سے عظیم ہے۔ سب سے ارفع۔ اس کا کوئی مول، کوئی قیمت نہیں —"

"تو تم بھی اسے یہی مشورہ دے رہی ہو — ؟"

"کیسے نہ دوں — ؟ ایک تو اس لڑکی کی عزت گئی — دوسرے بھائی جیل میں ہے۔ باپ کا آسرا بھی سر پہ نہیں — اور ان حالات میں، جبکہ وہ اپنے منگیتر کو ساری زندگی اپنی پناہ گاہ سمجھتی رہی ہے۔ اس وقت وہ بھی اس کی پناہ گاہ نہ بنا اور اس کا ساتھ چھوڑ گیا تو تم خود ہی سوچو اثمی! وہ مظلوم و بے بس کہاں جائے گی — اس معصوم اور بے گناہ گناہگار کا کونسا ٹھکانہ ہوگا —؟" صنم بڑے جوش میں تھی۔

"اس کے منگیتر کو سمجھاؤ اثمی! جسطرح بھی ہو سکے، وہ اپنے دل کو رشتہ قائم رکھنے پر مائل کرے۔ اسے مناؤ اثمی! اور اگر وہ نہیں مانتا تو ایک بار اسے مجھ سے ملوا دو۔ میں اسے بتاؤں گی کہ مرد کو اگر خدا نے عورت سے برتر بنایا ہے تو اس پہ اس کیلئے فرائض بھی کتنے عائد کر دیئے ہیں۔ اور اگر وہ یہاں اس دنیا میں اس کے تمام حقوق و فرائض ادا نہیں کرتا تو پھر آگے جا کر عورت اس کے گریبان میں ہاتھ بھی ڈالنے کی مجاز ہے۔ اس مظلوم لڑکی کو اپنی پناہ میں لینا اب اس کے منگیتر پر فرض ہو گیا ہے اور اپنے فرائض سے غفلت برتنے والا انسان عاقبت ...."

"بس کرو صنم —! بس کرو — پلیز! اب چپ ہو جاؤ —" یکایک اثم نے کراہ کر ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"کیا ہوا اثمی — ؟ یہ تم اس قدر پریشان حال سے کیوں ہو — ؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے — ؟" صنم نے آثم کا سر بازوؤں میں لے کر اپنی آغوش میں بھر لیا۔

"صنم —! صنم —!!" آثم کی پکار میں جیسے سسکیاں گونج اٹھیں۔

"کیا ہوا اثمی جان — ؟ کیا ہوا — ؟" وہ نرم نرم سی انگلیوں سے اس کا سر سہلانے لگی۔

"میری بد نصیبی کی داستان آج مکمل ہو گئی ہے صنم —! میرے مولیٰ نے میری لوحِ تقدیر پر تم سے میری ابدی جدائی لکھ دی ہے۔ پیار، محبت اور رفاقت کی لذتوں سے روشناس کرا کے آخر میں میری باقی پوری زندگی میں فراق کا زہر گھول دیا ہے۔"

"کیا مطلب — ؟ اثمی! تم یہ کیا کہہ رہے ہو — ؟" صنم نے گھبراہٹ کے مارے اثم ہی کے سر کو جھنجھوڑ ڈالا۔ "کیا امی بیگم کسی صورت نہیں مانتیں — ؟"

"وہ اب مان بھی جائیں صنم ! تو میرا نوشتۂ تقدیر نہیں مٹا سکتیں —"

"پہیلیاں نہ بجھواؤ اثمی —" وہ تقریباً چیخ سی پڑی، اس کے صبر و حوصلے ٹوٹے جا رہے تھے۔ اس کی برداشت کی قوتیں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کا کلیجہ شق ہونے کو تھا —! آثم نے ہاتھوں میں سے سر نکالتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"یہ جو اک لڑکے اور اس کی منگیتر کا قصہ میں نے تمہیں سنایا ہے، یہ دھنک کی داستان ہے۔ یہ میری کم نصیبی کی کہانی ہے۔ دھنک نے اپنے خط میں مجھ سے یہ رشتہ توڑنے کی درخواست کی ہے۔ اور میرا ضمیر مجھ سے یہ کہہ رہا ہے کہ ایسا مت کرو۔ میں جو ایک فلاحی ادارہ چلا رہا ہوں، میں جو دوسروں کے مسائل حل کرتا ہوں، آج ایک مظلوم، بے بس اور بے سہارا لڑکی کو مصائب کا مقابلہ کرنے کیلئے اس دنیا میں تنہا چھوڑ دوں۔ جہاں قدم قدم پر شہزاد جیسے خونخوار بھیڑیئے موجود ہیں —" آثم کے لہجے میں جوانوں ایسے جوش کے بجائے بزرگوں ایسی بردباری اور سنجیدگی تھی۔

"یہ اقدام تو میرے نیک ارادوں کی نفی کرے گا۔ یہ میرے راسخ عزائم کو جھٹلا دیگا یہ میرے ایمان کی کمزوری پر دلیل ہوگا، یہ میرے سچے اور پاک مذہب کی بے حرمتی کریگا۔ تب اپنی ہی سوچوں سے گھبرا کر، پریشان ہو کر میں نے تمہارا سہارا لیا، آخری فیصلہ تم پر چھوڑ دیا — اور تم —! تم تو صنم —! ہمیشہ ہی میرے ضمیر کی آواز بن کر ابھری ہو۔ آج ایک بار پھر تم نے وہی کردار ادا کیا ہے — وہی فیصلہ، جو میرا دل کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن میرا ضمیر مجھے مجبور کر رہا تھا۔ اور میرے ضمیر کی ہم آواز بن کر آج پھر تم سامنے آئی ہو۔"

آثم خاموش ہو گیا اور اب — اسی کے سے انداز میں صنم ہاتھوں میں سر لیئے بیٹھی تھی۔ کتنے ہی لمحے یونہی بیت گئے۔ یا شاید گھڑیاں —! یا پھر شاید کئی زمانے!!!

"تو اٹھی ——!" اپنی ٹوٹی پھوٹی آواز کو بڑی مشکل سے صنم نے جوڑا ——"یہ فیصلہ کرتے ہوئے تم اتنا دکھی کیوں ہو رہے ہو ——؟"

"یہ تم پوچھ رہی ہو صنم! تم ——؟؟"

"ہاں —— میں پوچھ رہی ہوں ——" اور اب صنم کے لہجے میں اک استحکام تھا۔

"لیکن صنم! میں نے تم سے ٹوٹ کر محبت کی ہے، میں نے تمہیں اپنے تمام تر سچے جذبوں کے ساتھ چاہا ہے۔ میں نے ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ تمہاری طلب کی ہے اتنے سارے لوگ میرے ارد گرد تھے لیکن میں نے ہمیشہ اک صرف تمہیں ہی سب سے زیادہ اپنا سمجھا ہے —— صرف تمہیں ——!"

"اور تمہارے لئے بھی اٹھی! میرے دل میں ایسے ہی جذبات و احساسات موجود رہے ہیں۔ میں نے بھی ہمیشہ تمہیں بالکل، بالکل اپنا سمجھا ہے۔ تبھی تو چاہتی ہوں کہ میرا اٹھی کسی بھی آزمائش میں ناکام نہ ہو۔ وہ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سرخرو رہے۔ محبت کا تاج محل تو ہر دل والا تعمیر کر لیتا ہے لیکن تم میرے اٹھی! تم قربانی کی ایسی مثال قائم کرو گے، جس کے سامنے تاج محل کی عظمت بھی پست نظر آئے گی۔ اور میں تو اٹھی! پہلے بھی تمہاری تھی اور انشاء اللہ زندگی کے آخری سانس تک تمہاری ہی رہوں گی۔ جسمانی رشتے ہی سب کچھ نہیں ہوتے اٹھی! روحانی رشتوں کی قدر اور مقام ان سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اور میرے اور تمہارے درمیان سدا وہ رشتہ قائم رہے گا۔ ہم دونوں اسی طرح مل کر کام کیا کریں گے، ہمارے ذہن اسی طرح مل کر لوگوں کی فلاح کے لئے سوچیں گے اور ان کی الجھنیں اور پریشانیاں دور کریں گے۔ ہمارا یہ رشتہ تو اٹھی! دنیا کی کوئی بھی طاقت نہیں توڑ سکتی —— یہ ابدالآباد تک قائم رہیگا۔ تم یوں کیوں دلگیر ہو رہے ہو ——؟"

پھر جیسے وہ اس کے درد کی شدت کو کم کرنے کے لئے اس کے دل پر تسلی کی مرہم کے پھاہے رکھنے لگی۔

"تم ساتھ یہ بھی تو ذہن میں رکھو کہ تمہیں اگر اپنی محبت کی دائمی فرقت کا دکھ سہنا پڑیگا تو

اس کے بدلے میں تمہیں مل کیا کیا کچھ رہا ہے۔ یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے اٹھی ——! تم تو فائدے ہی فائدے میں ہو ——"

"فائدے میں ——؟" آثم نے بڑے کرب سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں —— اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کی لذت اور خوشی کے علاوہ دھنک کی ہستی خدا کا ایک انمول عطیہ ہے۔ ایسی ہمت اور جرأت کم ہی کسی میں ہوتی ہے کہ ایسا تلخ سچ بول کر خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی برباد کر لے، وہ عظیم ہے اٹھی! جس نے خود اپنی عصمت لٹنے کی داستان بیان کر کے اپنی محبت کے ساتھ وفا کی ہے۔ ایسی سچی، کھری اور مقدس عورت قابل صد ستائش ہے اور اس کی عظمت کو ہمیں سلام کرنا چاہیئے —— اور تم تو خوش قسمت ہو آثم! تمہیں دھنک ایسی شریک حیات مل رہی ہے۔ میں تمہیں مبارکباد دیتی ہوں۔"

"یہ —— یہ تم کیا کہہ رہی ہو ——؟"

"میں اپنے دلی خیالات بیان کر رہی ہوں اٹھی! میں، جس کا محبوب اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہے مجھے اس عورت کے ساتھ حسد ہونا چاہیئے۔ وہی میں، ایسا کہہ رہی ہوں، وہ عورت سچائی کا ایسا دشوار گزار راستہ اختیار کر سکتی ہے تو میں بھی تو اک عورت ہوں۔ کیا میں ایک معمولی سا سچ بھی نہیں بول سکتی ——؟"

آثم سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ صنم اس کے عزائم کو بلند تر کرنے اور اس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے اسے تسلیاں دلاسے دیتی رہی، اس نیکی کے کام میں خوشی اور خلوص سے قدم بڑھانے کی تلقین کرتی رہی۔ اپنے سینے میں ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔ آنکھوں کے آگے تاریکی سی چھا رہی تھی۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اور سارے کا سارا وجود بے جان سا ہوا جا رہا تھا۔ مگر اس نے پوری کوشش سے اپنے تمام حواس بحال رکھے۔ ٹوٹتی بکھرتی ہمتوں کو مضبوطی سے تھامے رہی۔

وہ بھی تو اس ادارے کی ممبر تھی۔ اس پر بھی تو کچھ فرائض عائد ہوتے تھے۔ اس معاملے میں وہ عملاً اگر کچھ نہیں کر سکتی تھی تو زبان کے ساتھ تو آثم کو اخلاقی سہارا دے

سکتی تھی۔ اور اس میں اس نے بخل نہیں برتا۔

صبح کی اذان کی آواز کانوں میں اتری تو دونوں کو ہوش آیا۔ دونوں اٹھے ——
گو ابھی رات کی تاریکی ہی تھی مگر آج صبح کے اجالے بھی پھیل جاتے تو انھیں کسی کا ڈر یا خوف نہیں تھا۔ خود غرضی کو پاؤں تلے روندتے ہوئے آج انھوں نے انسانیت کے رشتوں کے ساتھ انصاف کیا تھا۔ سر بلند کئے دونوں اپنے اپنے کمرے کیطرف چل دیئے۔

آثم کے قدموں کی چاپ پر امی بیگم باہر نکل آئیں۔

"میں نماز پڑھنے لگا تھا امی بیگم —" ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی آثم نے بتا دیا۔

"نماز سے فارغ ہو کر میرے پاس آنا بیٹے —" امی بیگم کی آواز میں بڑی نرمی اور گھلاوٹ تھی۔ ورنہ پچھلے کئی دنوں سے تو ان کی اس سے بول چال تقریباً بند تھی ہی تھی۔ کبھی کبھار آثم کے کئی کئی بار بلانے پر اگر بولتی بھی تھیں تو آواز میں ہمیشہ جیسی محبت کے بجائے ایک عجیب سا تضاد اور سختی بھری بے رخی ہوتی تھی۔

"آ جاؤں گا امی بیگم —" شائد انھوں نے اپنا فیصلہ، اپنی ضد پھر دہرانا تھی۔ مگر آج آثم ان کی طلبی پر ذرا گھبرایا نہیں۔ ذرا پریشان نہیں ہوا۔

جب تک اس کا فیصلہ ڈانواں ڈول سا تھا، صرف ضمیر کی آواز ہی من میں گونجتی رہی تھی۔ تو وہ حد درجہ بے چین اور مضطرب تھا۔ اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا —— اور اب — صنم کے ساتھ باتیں کر کے، اس کی تسلیوں، دلاسوں کے ٹھنڈے میٹھے پھاہے سینے پر لگے تو فیصلہ پکا ہو گیا۔ فیصلہ پکا ہوا تو اندر کی ٹوٹ پھوٹ بند ہو گئی۔ سارا اضطراب، ساری بے چینی رفع ہو گئی۔ طوفان کے بعد والا سکون تھا وہاں اب —!

نماز کے بعد اپنے فیصلے پر مستحکم رہنے کے لئے اس نے خدا سے ڈھیروں دعائیں مانگیں۔ پھر بڑی دیر قرآن پاک کی تلاوت کرتا رہا۔ بے حد سکون ملا۔

"اٹھی! اٹھی بیٹے —!" امی بیگم شائد نماز سے فارغ ہو گئی تھیں۔

"حاضر ہوا امی بیگم —" وہ درمیانی کمرے میں چھوٹے پلنگ پر تھیں۔

"یہاں میرے پاس آ جاؤ —" انکے انداز میں ہمیشہ کی سی شفقت تھی اور آواز میں ممتا کا وہی ٹھنڈا میٹھا پیار رس —— "میں چاہتی ہوں بیٹے! اگلے مہینے تیری شادی کر دوں —"

"کر دیجیئے امی بیگم —" آثم کا جواب شائد ان کی توقع کے خلاف تھا۔ انہوں نے قدرے چونک کر اسے دیکھا۔

"جانتے ہو کس کے ساتھ تمہاری شادی کروں گی —؟"

"میری جو بچپن کی منگیتر ہے امی! اسی کے ساتھ ہو گی اور کس کے ساتھ ہو سکتی ہے"

"نہیں اٹھی! میرے بچے نہیں —— میں تو اپنی صنم کے متعلق بات کر رہی تھی"

"کیا مطلب —؟"

"میں تمہاری شادی تمہاری خواہش کے مطابق صنم کیساتھ کروں گی —"

"اور اب امی بیگم! وہ بچپن کی منگنی کہاں گئی —؟"

"تم درست کہتے تھے اٹھی! کہ بچپن کی منگنی ٹھیک نہیں ہوتی۔ کیا پتہ لڑکی کی طبیعت کیسی ہو اور اس کے اطوار کیسے ہوں —؟"

"مگر آپ کے کہنے کیمطابق دھنک تو امی بیگم! خوبصورت بھی بہت ہے اور اس کا مزاج اور طور اطوار بھی بہت اچھے ہیں —"

"چھوڑو اس سارے قصے کو — مجھے اب سمجھ آ گئی ہے —"

"اور امی بیگم! مجھے بھی اب ہی سمجھ آئی ہے"

"کیا —؟"

"کہ وہ رشتہ اب ٹوٹنا مناسب نہیں — یوں دھنک کی بڑی بدنامی اور رسوائی ہو گی۔ میں اس کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے امی بیگم! میں دھنک سے شادی کروں گا ——"

"اور صنم — ؟"

"صنم میری بچپن کی منگیتر نہیں ہے۔ اسے اور بہت سارے رشتے مل سکتے ہیں۔"

امی بیگم تھوڑا سا تاؤ کھا گئیں — عجیب ہی لڑکا تھا نا — جب وہ دھنک سے کرنا چاہتی تھیں تو وہ صنم کے لئے جان دیئے دے رہا تھا۔ اور اب وہ خود ہی صنم کے ساتھ کرنے پر رضامند ہوئیں تو اسے بچپن کی منگیتر یاد آگئی تھی۔ قدرے غصیلے لہجے میں بولیں — "اور — وہ جو صنم سے پیار و محبت کی پینگیں تھیں وہ کہاں گئیں — ؟"

"وہ جوانی کی بھول تھی امی بیگم! اور یہ عقل و ہوش کا تقاضہ — ! دھنک کیساتھ شادی سے انکار میں اس لئے کر رہا تھا کہ وہ ایک غلط قسم کی رسم کے خلاف جہاد تھا —"

"اور اب خود ہی اس رسم کے پابند بھی ہو رہے ہو۔ صرف میری مخالفت کے لئے شاید۔ ماں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کر رہے بیٹے — !" امی بیگم رونے لگیں۔

"آپ کی مخالفت نہیں امی بیگم — ! ایک مرد کی منگیتر کو کوئی دوسرا بیاہ لے جائے۔ تو یہ مردانگی تو نہ ہوئی نا —" پھر وہ ماں کو منانے کے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا — "امی بیگم! آپ بھی نماز پڑھ کر بیٹھی ہیں اور میں بھی۔ پلیز! اچھی اچھی باتیں کیجیے — نیکی کی باتیں — !"

"اور تم بڑی نیکی کی باتیں کر رہے ہو، ماں کی نافرمانی کرنا نیکی کی بات ہوتی ہے نا؟"

"توبہ توبہ — ! میں آپ کی نافرمانی کیوں کروں گا — ؟ آپ ہی کے قائم کئے ہوئے رشتے کو اور مضبوط اور قائم و دائم کرنے جا رہا ہوں — آپ کی زبان سے کئے گئے عہد کو نبھانے والا ہوں — کہ میری ماں بے زبان نہ سمجھی جائے۔ امی بیگم! آپکو تو مجھے اپنا سعادت مند بیٹا کہنا چاہیئے —"

"دیکھو اثمی!" تب امی بیگم آنسو پونچھتے ہوئے بڑے سنجیدہ اور رازدارانہ لہجے میں بولیں — "وہ لڑکی اب تیرے قابل نہیں رہی۔"

"چند دنوں میں ہی میرے قابل نہیں رہی، کیا ہو گیا اسے یکایک — ؟"

"یکایک تو نہیں — دراصل ایک دوسرے سے سات آٹھ سو میل کے فاصلے پر ہم رہتے ہیں — نزدیک رہتے تو پل پل کی خبر ملتی رہتی — پتہ چلا ہے کہ اسکا کردار اچھا نہیں ہے —"

"لیکن اتنے فاصلے سے آخر کیسے آپ کو پتہ چل گیا — ؟"

"کل مجھے ایک گمنام خط ملا ہے —" امی بیگم نے گریبان میں سے ایک خط نکال کر اس کے آگے ڈال دیا، اثم نے کھولا، پڑھا، چند لمحے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ تحریر دھنک ہی کی تھی — اس نے پوری دیانتداری سے کام لیتے ہوئے امی بیگم کو بھی مطلع کر دیا تھا — انھیں کا جوڑا ہوا تو یہ ناطہ تھا — !

"اب — ؟" وہ خاموش تھا۔ امی بیگم نے کسی امید کے سہارے پوچھا۔

"یہی میں سوچ رہا تھا کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی دشمن نے دشمنی کی بنا پر ایسی قبیح حرکت کی ہو —"

"دشمن کی اڑائی ہو یا دوست کی — ! بہر حال شبہے والا رشتہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کا کبھی نہیں کروں گی — میری بہو آنے والی ہماری نسل کی ماں ہوگی، ہمارے گھر میں اچھی لڑکی آنی چاہیئے۔"

"یہ تو امی بیگم! اٹھارہ سال پہلے سوچنے والی بات تھی۔ اب آپ نے میرا جو مقدر بنا دیا، وہ بن گیا —"

"سنو اثمی!" امی بیگم اپنی ہی کہے گئیں۔ "صنم ہماری دیکھی بھالی لڑکی ہے۔ اس کے طور اطوار میں شک شبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہمارے سامنے پلی بڑھی ہے شکل و صورت کی بھی بڑی پیاری ہے۔ دھنک جیسی اگر نہیں تو ہزاروں میں سے ہے پھر بھی — اور عادات کا تو کہنا ہی کیا —"

"امی بیگم ـــــــ!" آثم زور سے چلایا ـــــ "میں نے کہہ دیا ہے کہ میرا وہ رشتہ نہیں ٹوٹے گا۔ اپنی منگیتر کو میں خود ہی بیاہ کر لاؤں گا۔"

"یہ ماں بیٹے میں صبح صبح کیسا جھگڑا چل رہا ہے ـــ؟ یہ وقت ہے نماز تلاوت کا اور تم دونوں بیٹھے جھگڑ رہے ہو۔"

"ابا میاں ـــــ"

"ہاں ہاں ـــ باپ کے سامنے کرو شادی کی بات ـــــ"

"تو ہو کیا جائے گا اگر شادی کی بات خود مجھ سے کر لے گا ـــــ" ابا میاں کے ہاتھ میں تسبیح تھی ـــــ پھیرتے ہوئے ان کے پاس آ بیٹھے۔

"کل رات میں نے آپ سے ساری بات کی تھی نا ـــــ؟"

"کون سی بات ـــــ؟"

"اوئے ہوئے! ایک تو آپ کی اس بھول بھلکڑ قسم کی عادت نے خراب کیا ہوا ہے۔"

"تو بیگم، دوبارہ بتا دو ـــ کس بات کی طرف تمہارا اشارہ ہے ـــ؟"

"وہی ـــــ کہ آثم کی شادی صنم کے ساتھ کرنا ہی مناسب ہوگا ـــــ"

"ہاں ہاں بھئی ـــ!" ابا میاں یکایک آثم کی طرف گھومے ـــــ "مبارک ہو تمہاری امی مان گئی ہیں ـــــ"

"مبارک کیسی ـــــ؟ اب صاحبزادے اس پہلے والے رشتے کو قائم رکھنے پہ بضد ہیں۔"

"ہائیں ـــــ! یہ کیا معاملہ ہے ـــ؟ پہلے ماں دھنک سے کرنا چاہتی تھی اور بیٹا راضی نہیں تھا اور بیٹا صنم سے کرنا چاہتا تھا، مگر ماں رضامند نہیں تھی۔ پھر یکایک دونوں اکٹھے ہی راضی ہو گئے، یعنی کہ بیٹا دھنک کے لئے اور ماں صنم کے لئے۔ اور یوں پٹڑیاں دونوں کی پھر بدل گئیں۔ میاں صلاح مشورہ کر کے تو ایک ہی پٹڑی پہ چلو دونوں، آگے پیچھے۔ یوں مخالف سمتوں کی طرف جب تک چلتے رہو گے ٹکریں لگتی ہی رہیں گی۔"

"ہاں ہاں ـــــ سمجھائیے! اپنے لاڈلے کو۔"

"لاڈلے اور لاڈلی دونوں ہی کو سمجھانا پڑے گا۔"

"بیٹھیے بھی ـــــ" امی بیگم مسکرا پڑیں۔

آثم اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کہاں چل دیئے ـــــ؟" ابا میاں نے پوچھا۔

"کہیں کچھ سمجھانے بیٹھیں نا ـــــ" آثم کے بجائے امی بیگم جلدی سے بول پڑیں۔

"آج کل کی اولاد سمجھنے کی کوشش کب کرتی ہے۔ جو اسے سمجھائے گا، عقل کی بات بتائے گا، وہ اس کا دشمن ہوگا ـــ"

"ابا میاں! آپ میرے ساتھ ذرا میرے کمرے تک آئیے گا ـــ"

"جاؤ لے جاؤ باپ کو ـــ سکھا لو جو سکھانا ہے۔ مگر میں بھی کہہ دوں......"

"ارے بیگم!" ابا میاں نے امی بیگم کی بات کاٹ دی "تم تو کہتی ہی رہتی ہو اور ساری عمر ان شاء اللہ کہتی ہی رہو گی، میرا بیٹا آج پہلی بار مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔ مجھے پہلے وہ سن لینے دو ـــــ آؤ بیٹے ـــــ! آ جاؤ ـــــ" ابا میاں تسبیح کے دانے جلد جلد گراتے ہوئے آثم کو ساتھ لئے اس کے کمرے میں چلے گئے۔

اندر پہنچتے ہی آثم نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگائی تو ابا میاں نے بڑے تعجب سے اس کی یہ حرکت دیکھی ـــــ "کیا بات ہے ـــ؟" ان کے لہجے میں تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔

"ابا میاں! آپ نے ہمیشہ حق و انصاف کی بات کی ہے۔"

"دوسرے لوگوں کے سامنے بیٹے! مگر تمہاری امی بیگم بہت زبردست ہیں۔"

"تو آج ہی تو پھر آپ کے انصاف کا امتحان ہوگا۔ مقابلہ میرا اور امی بیگم کا ہے۔"

"توبہ توبہ! ماں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہو ـــ؟ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے بیٹے ـــ!"

"ہر عورت کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے ابا میاں ـــــ! اور ہمیں سبھی کا احترام کرنا چاہیئے۔ سبھی کا ابا میاں ـــــ؟ دنیا کی ہر عورت کا ـــ! ہمارا مذہب ہمیں یہ تو نہیں

سکھانا کہ صرف ماں ہی عورت ہوتی ہے ۔۔۔"

"بڑی خوبصورت بات کی تم نے بیٹے ۔۔۔۔ ! خدا تمہیں سدا راستی اور نیکی کی راہ پر چلائے ۔"

" ذرا یہ خط پڑھئے ابامیاں ! لیکن نہیں ۔ پہلے وعدہ کیجئے کہ اس خط میں جو کچھ آپ پڑھیں گے وہ کسی اور کو نہیں بتائیں گے ۔۔"

" وعدہ کرتا ہوں بیٹے ۔۔۔ !"

" لیجئے ۔۔۔۔ بڑے غور اور توجہ سے پڑھئے گا ۔ پھر اس کے بعد جو کچھ کہیں گے مجھے منظور ہوگا ۔۔۔"

ابا میاں نے آثم کے ہاتھ سے خط لے لیا ۔۔۔ آثم چپ چاپ پاس بیٹھا ان کے چہرے کے تاثرات کو بغور پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ اور ابامیاں خط پڑھ رہے تھے ۔ آدھے سے زیادہ خط انہوں نے پڑھ لیا تو آثم نے محسوس کیا ، ان کی آنکھیں بھیگ گئی ہیں مگر وہ بڑی تیزی سے پلکیں جھپک جھپک کر ان کی نمی جیسے اندر ہی اندر جذب کرنے کی کوشش کر رہے تھے ۔۔۔ پھر ایک صفحہ اور پڑھا ۔۔۔ اب ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر رخساروں پر بہے جا رہے تھے ۔ مگر انھیں کوئی ہوش ، کوئی احساس نہ تھا ۔ آثم کی نگاہیں ان کے چہرے پر مرکوز تھیں ۔ اور ۔۔۔ آخری سطور پڑھتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے ۔

" میری بچی ! تم اتنی ایماندار ہو کر نتیجے کی پرواہ کئے بغیر ایسا بھیانک سچ اس قدر دلیری اور بے باکی سے بول دیا ۔۔۔ تم پاکباز ہو ۔۔۔ تم مقدس ہو ۔۔۔۔ تم عظیم ہو بیٹی ! تم اچھے سے اچھے اور نیک سے نیک انسان کے قابل ہو ، ہم لوگ تو تمہاری عظمت کے سامنے حقیر کیڑے ہیں ۔۔۔"

" ابا میاں ! اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے ۔ بتایئے میں کیا کروں ۔۔؟"

" تم کیا کرو ۔۔۔ ؟ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ۔۔؟ جلد از جلد جہاز کی سیٹیں بک کراؤ ۔۔۔ ہم کراچی چلیں گے ۔

" اور امی بیگم ۔۔۔ ؟"

" بیٹے ! تمہاری ماں اتنی بری نہیں ۔۔۔"

" میں بری نہیں کہہ رہا ابامیاں ! توبہ توبہ ۔ ! وہ میری ماں ہیں ، میری بہتری کیلئے ہی یہ سب کچھ کر رہی ہیں نا ۔۔۔۔ دراصل میں کہنا چاہتا ہوں کہ دھنک کا استقبال اس گھر میں اسی طرح ہونا چاہیئے جسطرح ساری زندگی امی بیگم ان لوگوں کو باور کراتی رہی ہیں ۔ جس چاہت اور الفت اور گرویدگی کا اظہار ان پہ کرتی رہی ہیں ۔۔"

" شاباش بیٹے ! آج میں تم پر صحیح معنوں میں فخر کر سکتا ہوں ۔" انہوں نے بڑھ کر آثم کو سینے سے لگا لیا ۔۔۔" میں نے ہمیشہ خدا سے ایسی ہی نیک اور اعلیٰ صفات والی اولاد کی تمنا کی تھی ۔۔۔" انہوں نے اس کی روشن پیشانی چوم لی " شکر ہے پروردگار تیرا ۔۔۔" پھر وہ باہر جانے کیلئے مڑے ۔" آؤ تم بھی ۔۔۔"

" میں یہ خط چھپا آؤں ۔۔۔"

" تلف کر دو بیٹے ! اور آج کے بعد اس خط کو ، اس کے عنوان کو ، اس کے موضوع کو بھول جانا ۔۔ سمجھے ۔۔ ؟ دھنک کے ساتھ تمہاری زندگی بہت اچھی گزرے گی انشاء اللہ ۔۔! ایسی ۔ کہ کچھ ہی عرصہ بعد یہ بیتے دن یاد کر کے تم خود پر ہنسا کرو گے کہ تم کیوں اس کے ساتھ شادی سے انکار کرتے رہے تھے ۔ یہ ازدواجی زندگی بیٹے ! ایسی ہی ہوتی ہے ۔ جس طرح وہ تمہاری پرستش ساری زندگی کرتی رہی ہے ۔۔ بیوی بن کر ، اور خصوصاً ان حالات میں بیوی بن کر تمہاری بہت خدمت کرے گی تب تمہیں ۔۔۔ سکون اور سکھ ملے گا ۔۔ تمہیں اپنا گھر جنت لگے گا ۔ اور جس کے دم سے تمہیں سکھ اور راحت ملے گی پھر تمہارا دل بھی اس کا ہو جائے گا ۔ دیکھ لینا بیٹے ! ایسا ہی ہوگا ۔۔۔۔ انشاء اللہ ! انشاء اللہ ۔۔!"

ابامیاں کیسی باتیں کر رہے تھے آثم کو شرم سی آگئی ۔

" جاؤ وہ خط تلف کرو اور کراچی جانے کی تیاری کرو ۔۔۔" پھر چٹخنی کھولتے ہوئے ابامیاں کی آواز بلند ہوگئی ۔۔۔" میں یہ جھگڑا ہی نمٹاؤں ۔۔۔ روز روز کی چخ چخ سے

میں تو تنگ آچکا ہوں ـــ"

"کیسی یہ چیخ چیخ ـــ ؟ کونسا جھگڑا ـــ ؟" امی بیگم ان کے انتظار میں دروازے پہ آنکھیں اور کان لگائے بیٹھی تھیں۔

"آثم کی شادی کا ـــ"

"کس طرح نمٹائیں گے ـــ ؟"

"میں اسے لے کر جمعہ کو کراچی جا رہا ہوں ـــ"

"اور کراچی جا کر کیا کریں گے ؟" امی بیگم نے تیکھی نگاہ سے شوہر کو دیکھا۔

"اس کا عقد پڑھا کر دھنک کو ساتھ لے آؤں گا ـــ"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی ـــ ؟"

"کمال تو بیگم تم کرتی ہو ـــ معاملہ ایسا خطرناک ہے، ہمیں جلد از جلد اسے یہاں لے آنا چاہیئے ـــ وہ ہماری ہے۔ اس کے ساتھ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو ساری زندگی پچھتائیں گے ـــ"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ـــ ؟" امی بیگم حیران اور پریشان ہو گئیں۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں ـــ ماشاءاللہ ہماری بیٹی بہت خوبصورت ہے، بہت خوب سیرت ـــ اور ـــ اور بھی بہت سارے لوگوں کی اس پر نگاہیں ہیں۔ لہذا وہ غلط سلط باتیں ہم تک پہنچا کر، اس معصوم و پاکیزہ لڑکی پہ تہمتیں لگا کر یہ رشتہ تڑوانا چاہتے ہیں ـــ ایک خط تمہیں لکھ دیا ہے ایسا ویسا، ایک آثم کو لکھ دیا ہے"

"اثمی کو بھی کوئی خط موصول ہوا ہے ـــ ؟"

"ہاں ـــ مگر اسے دھمکیاں دی ہوئی ہیں کہ یہ رشتہ کیا تو یہ ہو جائے گا اور وہ ہو جائے گا ـــ اور چوڑیاں میرے بیٹے نے بھی نہیں پہنی ہوئیں کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے ڈر کر اٹھارہ سال کا کیا ہوا رشتہ توڑ دے گا، میرا بیٹا تو شیر کا بچہ ہے۔ اسے تو بلکہ اس خط نے غیرت دلا دی ہے۔ تبھی تو اس نے اپنے دوسرے مطالبات چھوڑ چھاڑ اپنی منگیتر کو خود ہی بیاہ کر لانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"ہائے ہائے ! ایسا ظالم زمانہ ہے۔ تبھی میں بھی کہوں اپنی دھنک تو اتنی نیک اتنی معصوم تھی کہ حوریں بھی اس کے دامن پر نماز پڑھیں ـــ اتنا میرا اور آپ کا خیال رکھتی تھی۔ اتنی ہم سے اسے محبت تھی، ایسے ایسے خوبصورت سویٹر بنا کر بھیجتی تھی، آخر دل میں کوئی جذبہ تھا نا۔ پھر یہ یکایک بدل کیسے گئی جو کاشف کے دوست کے ساتھ ـــ"

امی بیگم بھولی بھی بہت تھیں ـــ اپنے دونوں کان زور زور سے کھینچنے لگیں "توبہ توبہ ! کسی نے بہتان بازی کی، تہمتیں لگائیں اور میں یقین کر بیٹھی ـــ کیسی مجھ سے بھول ہوئی۔ کتنا بڑا گناہ ہو گیا"

پھر وہ یکدم تیز لہجے میں بولیں۔

"لیکن کہاں ہے آثم ـــ ؟ اس نے بھلا پہلے ہی مجھے کیوں نہ وہ خط دکھا دیا ؟ کیوں مجھے گناہگار ہونے دیا ـــ"

"اس کا یہ خیال تھا کہ ماں کا کلیجہ بڑا نازک ہوتا ہے" آثم کے بجائے ابا میاں نے ہی جلدی سے جواب دیا۔ "خط پڑھتے ہی تم کہیں ان دھمکیوں سے ڈر کر رشتہ توڑنے کا اعلان نہ کر دیتیں نا ـــ"

"ہائے ! تو ادھر بھی تو کوئی غیر نہ تھا، آپ کو کیا علم کہ دھنک کیلئے میرے دل میں کتنی ممتا ہے، جس طرح اثمی کو پالا ہے اسی طرح میں نے اپنے دل میں دھنک کی محبت پالی ہوئی ہے"

"تو بس پھر چپکے چپکے ہم دونوں کے کراچی جانے کی تیاری کر دو ـــ" ابا میاں نے فیصلے پر جیسے مہر لگا دی۔

"اور میں ـــ ؟"

"بیگم ! یہ کام بڑی خاموشی اور رازداری سے ہونا چاہیے۔ اسی لئے بغیر انہیں اطلاع دیئے ہم جا رہے ہیں ـــ آثم کو پہلے کسی نے وہاں دیکھا نہیں ہوا۔ کوئی نہ جان سکے گا کہ ہم لوگ کون ہیں، اور کس لئے ان کے گھر آئے ہیں۔ اور ہم چپکے سے اپنی بیٹی

کا عقد پڑھا کر، وداع کرا کے لے آئیں گے۔"

"مگر میرا تو ایک ہی بیٹا ہے، میں اس کی شادی بڑی شان و شوکت سے کرنا چاہتی تھی۔"

"جتنی جی چاہے شان و شوکت کر لینا۔ اتوار کو ہم اپنے تمام ملنے جلنے والوں اور عزیز و اقارب کو مدعو کریں گے۔ دعوتِ ولیمہ ہو گی۔ بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے، بھئی ساری زندگی اتنا ڈھیروں کمایا کس لئے ہے، جمعہ کے دن ہم نکاح کیلئے کراچی جائیں گے تم اسی دن اس خوشی میں غریبوں مسکینوں اور محتاجوں میں کھانا اور کپڑے تقسیم کرنا۔ یہ خاص طور پہ میری طرف سے ہو گا۔"

آثم دروازے میں چپ چاپ کھڑا ماں اور باپ کی باتیں سن رہا تھا۔ امی بیگم کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اور بڑے پر اثر طریقے سے ابا میاں کا بیان جاری تھا۔۔۔ کتنے عقلمند تھے وہ۔۔۔! ایسی بات ٹالی۔۔۔ ایسی بات بنائی۔۔۔ کہ امی بیگم کو ذرا بھی کوئی احساس نہ ہوا۔۔۔ وہ خط اور اس کا موضوع سب بھول بھال گئیں۔ اس وقت انہیں یاد تھا تو صرف یہ کہ ان کے اکلوتے بیٹے کی شادی تھی۔ جوش و مسرت میں بھر کر نانی اماں کو آوازیں دینے لگیں۔ نانی اماں کے بعد گلابو کی باری آ گئی۔

"گلابو! تیاریاں کر تیرے چھوٹے صاحب کی شادی ہے۔" اماں کمرے میں داخل ہوتی دکھائی دیں تو گلابو والا فقرہ ادھورا چھوڑا انہیں سے مخاطب ہو گئیں۔۔۔

"اماں! میں ابھی ادھر سے لڑکیوں کو بلاتی ہوں پہلے دن کا عروسی جوڑا تو گھر میں ہی تیار ہو گا۔ انجوا امی کو بڑا اچھا گوٹہ لگانا آتا ہے، وہ میرے ساتھ لگیں گی، اوپر کا انتظام صنم سنبھال لے گی۔"

"آثمی بیٹے۔۔۔!" ابا میاں نے امی بیگم کو ان کے حال پر چھوڑا اور خود آثم سے مخاطب ہوئے۔۔۔ "فون کر کے پتہ کرو اور جمعہ کے روز جو سب سے پہلی پرواز ملے اس میں پانچ سیٹیں واپسی کی ریزرو کرا لو۔"

"پانچ ابا میاں۔۔۔؟" آثم نے تعجب سے پوچھا۔۔۔ وہ تو صرف دو تھے۔

"کرنل صاحب، تلقین حیدر اور مولانا فیض الٰہی بھی ساتھ جائیں گے۔"

"ساتھ وہ سب کیوں ابا میاں۔۔۔؟"

"بیٹے! یہ تمہاری سمجھنے سمجھانے والی باتیں نہیں ہیں۔۔۔" پھر ابا میاں بڑے خوبصورت انداز میں مسکرا پڑے۔۔۔ "بیٹے! مولانا صاحب نکاح کیلئے اور ساتھ وکیل اور گواہ وغیرہ۔۔۔ بڑے بیوقوف ہو۔۔۔!" انتہائی پیار سے انہوں نے بیٹے کی طرف دیکھا۔۔۔ "پوچھ رہا ہے باقی لوگ کس لئے۔۔۔؟"

"ہائے ہائے اتو اس معصوم کو کیا پتہ۔۔۔ پہلی پہلی بار بیچارے کی شادی ہو رہی ہے۔" پاس سے امی بیگم بیٹے کی حمایت میں بلا سوچے سمجھے بول پڑیں۔

"تو اور لوگوں کی کئی کئی بار ہوا کرتی ہے۔۔۔؟" ابا میاں نے اک زوردار قہقہہ لگایا۔۔۔ "بیگم! ہمیں پہلے بتانا تھا نا۔ ہم بھی زیادہ نہیں تو صرف ایک بار ہی اور منہ میٹھا کر لیتے۔۔۔"

ہاں ہاں۔۔۔ پہلے والا تو کڑوا ہو گیا۔۔۔ شادی کو کچھ وقت گزر جائے تو ہر مرد کا یہی ہو جایا کرتا ہے۔" امی بیگم بڑی ترنگ میں تھیں۔۔۔ ہنسنے لگیں۔

"کر لیں۔۔۔ تین اور کر لیں۔۔۔ بیٹے کی بعد میں ہوتی رہے گی۔۔۔ پہلے خود سہرا باندھ لیں۔"

یوں امی بیگم اور ابا میاں کے درمیان پیار بھری، شرارت بھری نوک جھونک شروع ہو گئی۔

آثم سر جھکائے ہوئے خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

O

اگلے دن امی پھر اس کے جہیز کے کپڑے لے کر تیار کرنے بیٹھیں تو دھنک نے بڑے عجیب انداز میں ہنستے ہوئے انہیں سب کچھ بتا دیا کہ پچھلی رات ابیہ نے کیا کیا تھا۔۔۔ امی کا خط جو وہ پوسٹ کرنا بھول گئی تھیں پھاڑ کر پھینک دیا تھا

اور اس کے بدلے میں دو خط خود لکھ کر پوسٹ کر دیئے تھے۔ ایک آثم کے نام اور ایک امی بیگم کے ——— اور یوں ——— اس نے تمام حقیقت حال سے انہیں باخبر کر دیا تھا۔

امی نے جب یہ سنا تو سینہ پیٹ پیٹ لیا۔ کیسی انش لڑکی نے سارے خاندان کی عزت کی خاک اڑائی تھی ——— انہوں نے ڈھیروں ڈھیر اسے بددعائیں دے ڈالیں ——— وہ پیدا ہی منحوس ہوئی تھی اور ساری عمر اس کی نحوست ان کے خاندان پر چھائی رہی تھی۔ اس کے مقدر میں یتیمی تھی تو ماں بیوہ ہو گئی۔ بھائی کا سہارا باقی تھا تو وہ اسی کی خاطر ناکردہ گناہ میں ملوث ہو گیا۔ ڈیڑھ دو سال جیل کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد رہا ہو کر گھر آیا تو سچ مچ کا خونی مجرم بن کر پھر وہیں چکی پیسنے جا بیٹھا تھا ——— پھر گھر سے بے گھر وہ علیحدہ ہوئے۔ غرض امی نے طیش میں آ کر ہر بات، ہر معاملہ میں اسے ہی قصوروار ٹھہرا ڈالا۔ وہ پورا دن ان کا بولتے ہوئے گزرا۔ رات آ گئی۔ ساری زندگی کی راتوں کی تاریکی جیسے اسی ایک رات میں سما گئی تھی ——— اور پھر اسی رات انہوں نے واپس اپنے اسی پرانے گھر میں چلے جانے کی ٹھان لی۔ نہ اس عالی شان کوٹھی کے اخراجات ان سے پورے ہو سکتے تھے اور نہ وہ اس کا کرایہ ہی ادا کر سکتی تھیں۔ اب تو جمعہ والے دن کی آس بھی ختم ہو گئی تھی۔ آخر پھر کس لئے مزید ایک دن بھی وہاں گزارتیں ——— ؟ جھٹ پٹ واپسی کی تیاری کرنے لگیں۔

ان کے خیال میں دھنک شائد اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی تھی۔ اس نے انہیں وہاں سے کچھ بھی اٹھانے نہ دیا۔ جو جو چیزیں شہزاد نے لا کر دی ہوئی تھیں سب توڑ پھوڑ دیں۔ جو ٹوٹ نہ سکیں انھیں اسی طرح پھینک دیا۔ کپڑے تار تار کر دیئے اتنی قیمتی ساڑھیاں تھیں ——— سویٹر تھے ——— کوٹ اور گاؤن تھے ——— ان سلا کپڑا تھا۔ امی چیختی رہیں، چلاتی رہیں، مگر اس نے کچھ سنا ہی نہیں ——— بس اتنا کہتی رہی" میری شادی تو ہوئی نہیں۔ اس لئے ان سب کی اب ضرورت باقی نہیں رہ گئی "

" تم نہیں پہنو گی تو کاشف کے تو کام آ ہی سکتے ہیں ——— اتنی قیمتی چیزیں ہیں، بیچ کر مقدمے پر لگا دیں گے۔ ہمارا کمائی والا بھی تو کوئی نہیں ——— "

" اور کاشی جی پہ ایسی کمائی خرچ کریں گی امی ——! کیوں ان کی عاقبت بھی گنواتی ہیں۔ اپنے کاشی جی کے لئے میں خود کماؤں گی ——— حق حلال کی کمائی "

" دیکھ لوں گی تم جو تیر مارو گی ——— " امی نے غضبناک نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے طنز کیا۔ مگر اس پر نہ ان کے کسی طنز نے اور نہ نگاہوں کے تیروں نے کوئی اثر کیا۔

یوں انھیں اسی طرح اپنے پرانے اور بوسیدہ سے ملبوسات اور پرانے سڑانے ساندہ سامان کے ساتھ واپس گھر جانا پڑا۔ شہزاد نے ان کا گھر کرائے پر نہیں دیا تھا۔ وہ اسی طرح بند پڑا تھا۔ انھیں گھر واپس آتے دیکھ کر محلے کی عورتیں آ گئیں۔ عجیب معنی خیز سی نظروں سے دونوں ماں بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔ اور عجیب عجیب قسم کے طنزیہ فقرے کس رہی تھیں۔

انہیں کاشف کے دوبارہ قید ہونے کی اطلاع جانے کیسے مل گئی تھی، بڑے عجیب سے انداز میں اور عجیب عجیب سی دبی دبی مسکراہٹوں کو ہونٹوں میں مزید دباتے ہوئے افسوس کا اظہار کر رہی تھیں۔ امی ہر نگاہ ہر انداز کو بخوبی سمجھ رہی تھیں۔ دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ کچھ اپنے مقدر پہ، کچھ اولاد کی نالائقی پہ ——!!

اور اک دھنک تھی ——— بے حس ——— ! پتھر کا پتھر ——— ! اس پر جیسے کسی کی نگاہ یا طنزیہ فقرے کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اسے جیسے اس گھر میں آ کر بڑا سکون مل گیا تھا۔ گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھی۔ سب سے پہلے اس نے کاشف کے کمرے کو درست کیا۔

" خود ہی اس کو جیل میں جھونک اب اس کے لئے کمرے سجاتی پھر رہی ہے "
امی ہر کسی کا غصہ اس پر نکال رہی تھیں۔

" خود ہی جیل سے نکلوا بھی لوں گی ان شاء اللہ ——— " بڑے اطمینان سے اس نے

ماں کو جواب دیا۔

"مر گئے جیل سے نکلوانے والے"

"بس — ! صرف آج کا دن اپنا ہے۔ کل سے میرے وقت کا ہر لمحہ میرے کاشی جی کے لئے ہوگا۔ میں اسی مشن کے لئے زندہ رہی ہوں امی ! انشاء اللہ پورا کر کے دکھاؤں گی"

رات گزری — اگلا دن آیا — منہ ہاتھ دھو کر اس نے صاف ستھرا لباس پہنا — کوئی ملازمت، کوئی ٹیوشن، کشیدہ کاری یا کپڑوں کی سلائی، جو کچھ بھی اسے کرنے کو مل گیا، وہ کرنے کو تیار تھی۔ یہاں تک کہ لوگوں کے برتن مانجھنے یا کسی گھر میں آیا گیری کرنے سے بھی اسے کوئی عار نہ تھی۔ محنت مزدوری کرنا، عزت بیچ کر کھانے سے بہتر تھا۔ ہر کام عظمت والا تھا۔ عزت والا تھا — !

وہ پورا دن گزرا — شام اس کے ٹوٹے حوصلوں کے ٹکڑے لئے ساتھ آئی۔ ایک قاتل کی آوارہ اور بدچلن بہن کو کوئی بھی گھر میں گھسنے دینا ہی پسند نہیں کرتا تھا۔ تو کوئی کام کیسے دیتا۔ ہر گھر میں کسی کا بھائی، کسی کا بیٹا، کسی کا شوہر موجود تھا اور وہ خوبصورت بھی اور ساتھ بدنام بھی — !!

اس دن اسے معلوم ہوا کہ اس کی کہانی تو ہر گھر، ہر محلے میں پھیل چکی تھی۔ ساری رات [illegible] نے روتے اور سسکتے ہوئے گزار دی۔ دن امی کے طعنوں سے شروع ہوا۔

"آج پھر نکل جا — اور دیکھ لینا شام کو رہے سہے حوصلوں اور ہمتوں کی کرچیاں تمہارے دامن میں بھری ہوں گی۔ ہمارے تجربوں کو تم لوگ ہنسی مذاق میں اڑا دیتے ہو —"

"امی ! آپ کے تجربوں کا تو میں نے کبھی بھی مذاق نہیں اڑایا۔ بس اک دل چاہتا تھا کہ عزت کی روٹی ملے"

"اور عزت کی روٹی ڈھونڈتے ڈھونڈتے نا اب بھائی کو ضرور پھانسی لگوا لینا"

"امی — !" وہ چیخ پڑی "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں — ؟ پھر آپ نے وہی کچھ کہنا شروع کر دیا"

"میرے کلیجے میں جس طرح تم نے آگ لگائی ہے اس کی جلن کچھ میں ہی جانتی ہوں۔ ہر ہر طرح عزت برباد ہوئی۔ رہا سہا جو چار دن گزارنے کے لئے پاس کچھ تھا وہ بھی تم فنا کر آئیں — اب مرنا بھی ہو سکے — ؟"

"وہ موت اچھی رہے گی"

"باتیں کیسی ٹکے ٹکے کی بنانا آ گئی ہیں۔ تو تو پیدا ہوتے ہی مر جاتی تو اچھا تھا مگر تمہاری بجائے تو میرا بیٹا بھگت رہا ہے"

"کہا نا امی ! کہ کاشی جی کو چھڑا کر دکھاؤں گی"

"پلے پیسہ نہیں اور چھڑا کر دکھاؤ گی —" امی نے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے دو چار دن اور کام نہ ملا تو وہ مکان بیچ دیں گے۔ یہ مکان فروخت کر دیں گے"

"خریدے گا کوئی — ؟ اور وہ بھی ہم بے آبروؤں کا مکان۔ اب تو لوگ ہم پر صرف تھوکیں گے ہی"

"امی ! امی !! پلیز ایسی تلخ باتیں نہ کیا کیجئے —"

"زبان سے نہ کروں گی تو دل جلتا رہے گا۔ خدایا ! میرے بچے کا انجام آخر کیا ہوگا"

"سب میری وجہ سے ہوا ہے نا — ؟" آخر دھنک جل کر بولی "پھر میں ہی بھگت بھی لوں گی"

"بھگتنے والے بیچارے تو بھگت رہے ہیں"

"سنیئے امی — ! مجھے اگر کوئی کام دام نہ ملا — ہمارا مکان نہ بکا، اور بھی روپے پیسے کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا تو — تو —" امی کے طعنوں نے اس کا کلیجہ چھلنی کر دیا تھا۔ مزید برداشت کا یارا نہ رہا "آپ کی کرم نوازی نے مجھے

طوا لفت تو بنا ہی ڈالا ... وہی آپ کا سکھایا ہوا کام شروع کر دوں گی۔ سبھی کہتے ہیں میری شکل ... اچھی ہے۔ اب بھی کافی خوبصورت ہوں۔ اپنے حسن کے جلوؤں سے لوگوں کی آنکھیں چکا چوند کر کے روپیہ کماؤں گی اور ایک بار ضرور آپکے بیٹے کو رہائی دلاؤں گی ۔"

"شادی کرنے کو کہا تھا وہ تو کی نہیں ۔۔۔" امی کو اس کے آنسوؤں پر بھی ذرا ترس نہیں آرہا تھا ۔۔۔" اور یہ تو بڑا عزت والا کام ہوگا ۔۔۔"

"کسی کو دھوکا یا فریب تو نہیں دوں گی ۔۔۔ جس قابل آپ نے کر دیا ہے اب وہی کچھ کروں گی اور کھلم کھلا کروں گی ۔۔۔"

ساتھ وہ سسکیاں بھرنے لگی ۔۔۔ اک اپنے غم ہی بہت تھے ۔ اوپر سے امی کی طنزیہ باتیں اور جلے کٹے فقرے۔ زبان بھی کھلتی تھی اور دل بھی اپنی اس گراوٹ اور پستی پر روتا تھا۔ کس مصیبت میں جان پھنس چکی تھی ۔۔۔؟

سارا دن اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ رات بھی فاقے سے ہی بستر پر چلی گئی۔ کھانے کو غم ہی اتنا ڈھیر دن ڈھیر ملا تھا کہ کچھ اور کھانے کی اشتہا وہ بھی نہیں گئی تھی۔ رات انھیں سوچوں اور خیالات میں گزر گئی ، صبح بڑی بے رنگ اور بے کیف سی تھی ۔ ساری رات جاگی تھی ۔ اور یہ مسلسل جاگنے والی اس کی دوسری رات تھی آنکھیں بڑی بوجھل اور دماغ بھاری سا تھا۔ جسم کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔

صبح کی اذان کی آواز کان میں پڑی تو اٹھنے کی اپنے میں ہمت نہ پاتے ہوئے بھی گھسیٹ کر اپنے بے جان وجود کو پاؤں پر کھڑا کر ہی لیا۔ وضو کرنے کے بعد اس نے نماز پڑھی۔ اور پھر اک بڑی طویل سی دعا مانگی۔

زندگی کا راستہ کٹھن تھا اور طے کرنے والی وہ اکیلی جان ۔۔۔! اس نے خدا سے ہمت و استقلال کی دعا مانگی۔ اس نے خدا سے اپنی رہی سہی عزت کی بھیک مانگی ۔ اس نے منزل تک پہنچنے کیلئے خدا سے راہ مستقیم مانگا ۔۔۔!!!

سورج طلوع ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ مگر ابھی تک اس کے ہاتھ اٹھے ہی ہوئے تھے ۔۔۔ باہر دروازے پر دستک ہوئی ، جانے کون تھا ۔۔۔؟ اب تو اسے کسی کی پرواہ نہ تھی۔ دل کے تمام دریچے بند کر چکی تھی ۔ نہ کسی کا انتظار تھا ۔ نہ کسی کی خواہش اور نہ کسی کی آرزو ۔۔۔!!!

وہ اسی طرح اپنے پروردگار کے حضور ہاتھ پھیلائے دعا مانگتی رہی۔ آنسو بہہ بہہ کر اس کے زرد رخساروں کو دھو رہے تھے ۔۔۔ کہ ۔۔۔ یہ کس نے اس کی محویت کو توڑا تھا ۔۔۔؟ باہر والے کمرے میں سے آنے والی کئی آوازوں نے اسے چونکا دیا ۔

"اللہ! میرے کاشی جی خیریت سے ہوں ۔۔۔" اس نے جلدی سے چہرے پر ہاتھ پھیرے ۔

"دھنک ۔۔۔! دھنک بیٹی ۔۔۔! دیکھو تو کون آیا ہے ۔۔۔!" امی کی آواز میں مسرتوں بھری کھنک تھی ۔۔۔ اس نے گردن پھیر کر نگاہیں اٹھائیں ۔۔۔ یہ مشفق سا بوڑھا چہرہ پہلے کہیں دیکھا تو تھا شاید ۔۔۔! وہ ناوٗف ذہن پر زور دیتے ہوئے پلکیں جھپک جھپک کر انہیں پہچاننے کی کوشش کرنے لگی ۔

"تمہارے ابا میاں ہیں ۔۔۔" امی کے لہجے پہ طاری برہمی انتہائی نرمی میں بدل چکی تھی ۔

"ابا میاں ۔۔۔؟"

"لاہور والے ابا میاں ۔۔۔ آتم کے ابا میاں ۔۔۔!"

آتم کا نام کان میں اترا تو ذہن کو جیسے بجلی کا اک جھٹکا سا لگا ۔ بند دریچے یکایک کھل گئے۔ من روشنیوں سے منور ہو اٹھا ۔ آنکھوں میں پہچان کی چمک لہرائی ۔۔۔ "ابا میاں ۔!" وہ لپک کر ان کے ساتھ لپٹ گئی ۔۔۔ چہرہ آنسوؤں سے پہلے ہی بھیگا ہوا تھا ۔ اب ابا میاں کا لباس بھی بھیگنے لگا ۔۔۔ ان کے سینے میں چہرہ گھسیڑے وہ روئے جا رہی تھی ۔۔۔ روئے جا رہی تھی ۔۔۔ کہ ۔۔۔ اسے اپنے سر میں نمی سی محسوس ہوئی ۔۔۔ وہ شاید ابا میاں کے آنسو تھے ۔

وہ چونک کر ان سے علیحدہ ہوئی ۔۔۔ سر اٹھا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا ۔ وہ رو رہے تھے ۔۔۔ کیوں ۔۔۔؟ کیوں ۔۔۔؟؟ ان کے آنسوؤں نے اسے اپنے گناہگار

وجود کا احساس دلا دیا۔ وہ اس قابل تو نہ تھا کہ ابا میاں کے مقدس و پاک سینے کے ساتھ مس ہوتا اور پھر اپنے آنسوؤں سے انہیں ناپاک کرتا۔ جلدی سے پرے ہٹتے ہوئے اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

" ابا میاں! میں اس قابل نہیں کہ آپ میری شکل دیکھیں — آپ یہاں کیوں آئے؟ آپ اپنی صاف ستھری اور پاکیزہ دنیا میں لوٹ جایئے ابا میاں —! ہماری رسوائیوں سے کہیں آپ کا اجلا اور سفید دامن بھی داغدار نہ ہو جائے —"

" یہ کیا کہہ رہی ہو دھنک بیٹی! تمہارا وجود جہاں ہوگا وہ جگہ تو کسی عبادت گاہ کی طرح مقدس اور پاک ہوگی — کہ تم خود ایک تقدس ہو، اک اجالا ہو، اک روشنی ہو — اور ہمارا گھر تمہارے بغیر بیٹی تاریک ہے۔ ہمیں روشنی چاہیئے۔ ہمیں پاکیزگی کی جستجو ہے — اور وہ صرف تمہارے ہی وجود سے ہمیں حاصل ہو سکتی ہے۔ صرف تمہاری ہستی سے — چلو آؤ — میں تمہیں لینے آیا ہوں —"

" نہیں نہیں — یہاں مجھے بہت کام ہیں ابا میاں —! یہاں میرے کاشی جی ہیں "

" وہ سب کام ہمارے ہیں بیٹی —! اور اپنا فرض، اپنا بوجھ ہمیں ہی اٹھانے دو۔ آثم کو — بچے — جب گھر کے مردوں کے ہاتھ شل ہو جائیں یا وہ چوڑیاں پہن لیں تو تب عورتیں میدان عمل میں نکلتی ہیں — اور بیٹی! تمہارے گھر کے مردوں کے بازوؤں میں ابھی بہت طاقت ہے اور ساتھ ہی ہیرے اور کانچ کے ٹکڑے میں امتیاز کرنے کی تمیز بھی —! تم جیسا ہیرا ہمیں اور کہیں نہیں ملے گا "

" لیکن —"

" بس بیٹے! بس —! بزرگوں کے سامنے حیل و حجت نہیں کیا کرتے — ابھی ابھی تمہارا نکاح ہونے والا ہے — آثم اپنی منگیتر کو خود ہی بیاہنے پہ بضد ہے۔ اور ہم بھی ہزاروں حسرتوں، خوشیوں اور ارمانوں کے ساتھ اپنی اس بہو کے ہاتھ میں گھربار سونپنا چاہتے ہیں جسے اٹھارہ سال سے منتخب کئے ہوئے ہیں "

" مگر ابا میاں —" بہو کے لفظ پر وہ سسک اٹھی — " آپ کی وہ بہو تو مر گئی "

" نہیں ہماری بہو تو اسی طرح سلامت ہے۔ جب تک ہم زندہ ہیں انشاء اللہ وہ ہمارے گھر میں، ہمارے دلوں میں، ہمارے جذبوں میں اپنی اسی آن بان، شان و شوکت اور عزت و وقار کے ساتھ زندہ و پائندہ رہے گی۔ بس بیٹے! اب مزید تمہیں کچھ نہیں کہنا۔ یہ تمہارے ابا میاں کا حکم ہے " اس کے سر پہ دستِ شفقت پھیرتے ہوئے وہ امی سے مخاطب ہو گئے۔

" بہن جی! ہم دوسرے کمرے میں انتظار کرتے ہیں۔ آپ ہماری بیٹی کو جلد از جلد دلہن بنا دیئے اور پھر ہمیں اجازت دیجیئے کہ عقد شروع کریں۔ ایک بجے کی پرواز سے ہمیں واپس بھی جانا ہے "

" لیکن بھائی صاحب! کچھ بھی ہو آخر بیٹی کی رخصتی ہے، کوئی کھانا وانا۔ کوئی دوسرا انتظام وغیرہ — ماں کے گھر سے بیٹی یوں خالی ہاتھ وداع ہو جائے۔ زمانہ کیا کہے گا۔"

" زمانے کی آپ پرواہ نہ کریں اور یہ بیٹی ہماری ہے اب — ہم خود سب کچھ کر لیں گے۔ سب کچھ — اس کے سارے ارمان اس کی امی بیگم پورے کر رہی ہیں۔ آپ بالکل کوئی فکر نہ کریں۔ بس دعائیں جتنی دے سکتی ہیں ان سے ضرور اس کا دامن بھر دیجئے۔ آپ کی طرف سے اس سے بڑا تحفہ، اس سے بڑا جہیز بیٹی کے لئے اور کوئی نہ ہوگا " ابا میاں نے انہیں تسلی بخش جواب دیتے ہوئے بڑھ کر ایک بار پھر دھنک کے ڈگمگاتے اور لرزتے وجود کو سینے کے ساتھ لگا لیا۔

" سن میری بیٹی! زندگی میں بہت سارے نشیب و فراز آیا کرتے ہیں۔ یہ تو پروردگار کی طرف سے اپنے نیک بندوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ تم کامیاب نکلی ہو اپنی آزمائش سے — اور اب ہماری شروع ہے۔ تمہیں چاہیئے ہماری ہمت بندھاؤ اور ہماری مدد کرو کہ ہم بھی اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کر سکیں اور پھر سرخرو اور سربلند جائیں اپنے مولا کے حضور —! تمہاری یہ ایک اور بھلائی ہوگی ہمارے ساتھ۔ تم تو مجسم رحمت ہو ہم سب کے لئے۔ جو ایک اتنی بڑی نیکی کا وسیلہ بنی ہو۔ تم نے ہمیں جنت کا راستہ دکھایا ہے بیٹی —! ہم تو تمہارے احسان مند ہیں —!"

اس کے سر کو تھپتھپاتے ہوئے وہ دوسرے کمرے میں تشریف لے گئے۔ کتنی خوبصورت بات کہہ گئے تھے ابامیاں ۔۔! اور کتنے عظیم تھے وہ سب لوگ ۔۔!!

دھنک گم سم سی کھڑی تھی۔

○

ہر کسی کی زندگی میں یہ دن، یہ لمحات آتے ہیں، جب دل میں امنگیں ہوتی ہیں، سینے میں دھڑکنیں۔ آنکھوں میں نئی زندگی کے خوش آئند تصورات اور ہونٹوں پر دلنشین مسکراہٹیں ۔۔۔ تب ۔۔ انتہائی جوش و ولولوں بھرے جذبات اور مچلتی تمناؤں کے ساتھ ہر کوئی ان لمحات سے گزرتا ہے۔

مگر ۔۔۔ اس پر تو ایسا کوئی لمحہ آیا ہی نہیں تھا ۔۔۔ اس کے گلے میں طلائی ہار جگمگائے ضرور تھے مگر دولہا بننے والے جذبات و احساسات اور بے تابیوں و بیقراریوں سے دل یکسر خالی تھا۔ نکاح پڑھا گیا تو ۔۔۔ جیسے روز دفتر میں کاغذات میں کئی کئی دستخط کیا کرتا تھا، نکاح نامے پر بھی اسی انداز میں کر دیئے تھے۔ اک معمول کیطرح ۔۔۔ نہ دل دھڑکا تھا، نہ ہاتھ کانپے تھے۔

پھر ۔۔۔ کار میں، طیارے میں اپنی دلہن کے ساتھ پہلو سے پہلو ملائے بیٹھا رہا تھا۔ مگر اس کے وجود کے لمس نے اس کے جوان جذبات کو ذرا بھی نہیں گرمایا تھا۔ ذرا بھی نہیں گدگدایا تھا ۔۔۔ بس اک فرض تھا جو ادا کرتا کر رہا تھا۔ اور ہر مرحلے سے وہ بحسن وخوبی گزرتا گیا تھا۔ مگر یہ مرحلہ ۔۔۔ یہ مرحلہ ۔۔۔

وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا ۔۔۔ روشنیاں! پھول!! مہک!!! وہ چونک اٹھا ۔۔۔ یہ رنگ و بو کی دنیا بڑی خوبصورت تھی۔ بڑی خوشگوار اور دلکش تھی ۔۔۔!!

اردگرد دیکھتے ہوئے وہ اپنی ہی رَو میں آگے بڑھتا گیا اور ۔۔۔ جب اپنے عین سامنے پھولوں اور طلائی ہاروں سے سجی مسہری کی طرف نگاہ اٹھی تو وہیں

ٹھٹھک کر رہ گیا ۔۔۔ وہ خالی نہیں تھی ۔۔۔ اس کی آغوش میں اک جگمگ جگمگ کرتا وجود سمٹا ہوا تھا ۔۔۔ تب اسے احساس ہوا کہ ۔۔۔

پھولوں کی اس سیج پہ بیٹھی دلھن کا دولہا تو وہ خود ہی تھا۔ اور یہ ۔۔۔ آج اسکی سہاگ رات تھی ۔۔۔ اس کی اپنی سہاگ رات۔ کیونکہ اس پر سے وہ شادی والا حادثہ جو زندگی کا خوبصورت ترین حادثہ متصور کیا جاتا ہے۔ اک روح فرسا حادثہ بن کر گزر چکا تھا۔ اور اب سامنے طلائی زنجیروں اور مہکتے پھولوں سے سجی مسہری پہ یہ لمبا سا گھونگھٹ نکالے اس کی دلھن اس کی منتظر بیٹھی تھی۔ اس کی توجہ، اس کے پیار، اس کی محبت کی طالب اور اس کے ہر جذبے کی حقدار بن کر وہ اس کمرے میں آئی تھی ۔۔۔ اس سیج پر موجود تھی۔

لیکن ۔۔۔ اس دلھن کو پیش کرنے کیلئے اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی جذبہ، نہ کوئی ارمان، نہ کوئی چاہت، نہ کوئی امنگ اور آرزو ۔۔۔ اس کا خالی دامن تھا، خالی ہاتھ تھے اور خالی ہی دل تھا ۔۔۔ !!!

اور ۔۔۔ یہ مرحلہ، یہ وقت بڑا ہی کٹھن تھا۔

ضمیر کی آواز پہ لبیک کہتے ہوئے وہ سب کچھ کر گزرا تھا۔ مگر یہاں تو اس کے ضمیر کی آواز بھی خاموش تھی۔ اور نہ صرف یہ کہ خاموش ہی، بلکہ وہ خود یہاں پہنچ کر راستہ بھولے جا رہی تھی۔

دھنک کے ساتھ اس کا نکاح ہو گیا تھا۔ وہ اس کی بیوی بن کر اس کے گھر میں آ گئی تھی۔ اس بے سہارا لڑکی کو اک باعزت سہارا مل گیا تھا۔ اک گھر، اک مکمل پناہ گاہ مل گئی تھی۔ ان کے خاندانی وقار اور آن کے سائبان کا اسے اک پرشکوہ تحفظ مل گیا تھا۔ ابامیاں نے اس کے بھائی کے مقدمے کو اپنے خاص وکیل کے سپرد کر دیا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں کا ماہوار وظیفہ مقرر کر کے اس بڑھاپے میں اسے محنت مزدوریوں سے نجات دلا دی تھی ۔۔۔ یوں ۔۔۔ اس کے سارے مسائل حل ہو گئے تھے۔ سارے

کے سارے ——!!

اور اب —اس سے زیادہ اسے دینے کیلئے آثم کے پاس کچھ تھا بھی نہیں —
کچھ بھی نہیں —— اپنے اختیار میں جو کچھ تھا وہ کر گزرا تھا۔ آگے دل کا معاملہ تھا۔ اور
اس کا دل اب مزید ایک قدم بھی بڑھانے کو قطعی تیار نہ تھا۔ وہ دھنک کے ساتھ
ساری زندگی اک شوہر والی اداکاری کرنے پر کسی بھی طرح نہ قائل ہو رہا تھا نہ مائل۔۔

اور یوں — یہاں ضمیر کی آواز بھی خاموش تھی۔ وہ بھی اس کی کچھ رہبری نہیں
کر پا رہی تھی۔

کئی لمحے وہ مسہری کے پاس کھڑا رہا— ضدی دل سرکشی پہ آمادہ تھا اور کچھ تھوڑے
سے حقوق اپنے لئے بھی طلب کر رہا تھا—— آخر—— اس کے اس مطالبے کے
ہاتھوں بے بس ہوتے ہوئے وہ کمرے کے پرلے سرے پر جا کر دلھن کے
بجائے صوفے کی نرم و گداز آغوش میں دھنس گیا۔ اب کیا کرے —— ؟ اس کا دماغ
ماؤف سا ہوا جا رہا تھا۔

اور پھر—— اس پریشانی کے وقت میں، اس مشکل کے وقت میں اسے اپنی
صنم یاد آ گئی —— اس وقت اس مسہری پر وہ ہوتی تو دل اور دماغ کے درمیان کوئی
بھی کشمکش نہ ہوتی۔ کوئی بھی فساد نہ مچتا — دونوں ہی خوشیوں اور ارمانوں کیساتھ
بازو پھیلا پھیلا کر سیج پر بیٹھی دلھن کا انتہائی خندہ پیشانی سے استقبال کرتے۔ اسکے
دل سے اک آہ نکل گئی — اور وہ یاد آئی تو اس کی من موہنی صورت دیکھنے کو یکایک
اس کا دل مچل اٹھا۔ ہمیشہ کی طرح —— کہ ایک دن بھی اس کا دیدار نہ ہو پاتا تو بے قرار
بے چین ہو جایا کرتا تھا۔

پھر آثم بہانے بہانے سے اسے بلا بھیجتا۔ وہ کسی مصروفیت وغیرہ کی وجہ سے
اگر آ نہ سکتی یا پھر کہیں گئی ہوتی تو—— حد سے بڑھ جانے والی بے تابیوں اور بیقراریوں
کو سکون و قرار بخشنے کیلئے اس کی تصویروں کا البم ہی کھول کر بیٹھ جانا۔ اور اس وقت

بھی —— اس کا اس کے پاس چلے آنا ناممکن تھا۔ اور اس کی یاد کچھ اس شدت کے
ساتھ آئی تھی کہ وہ نہ دل پر، نہ دماغ پر اور نہ خود پر ہی قابو رکھ سکا۔

اس کے بستر کے ساتھ والی تپائی پہ ہر وقت اس کا البم موجود رہا کرتا تھا۔ بیقرار
دل کو تھامتے ہوئے آثم نے نگاہ اٹھائی —— وہ اب بھی وہیں موجود تھا— جا کر جلدی
سے صنم کے محبوب وجود کی طرح بازوؤں میں بھر سینے کے ساتھ لگا لیا۔ کتنی گھڑیاں
وہ اس سے جدا رہا تھا۔ اس نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ تصویروں اور تصورات میں
ہی سہی، کچھ وقت اس کی معیت میں گزارنے کے لئے بیتاب سا ہوتے ہوئے اس
نے البم کھولا۔

مگر وہ سٹپٹا اٹھا۔ پھر جلد جلد اس کے باقی اوراق پلٹنے لگا—— اوہ —— وہاں
تو صنم کی ایک بھی تصویر موجود نہیں تھی۔ اور اس کے بجائے ہر صفحہ پر دھنک کا
حسین پیکر بڑے دلفریب انداز میں اپنی مسکراہٹیں بکھیر رہا تھا۔ یقیناً یہ صنم کا کارنامہ
تھا۔ وہ اتنی ہی عقل مند اور ایسی ہی دوراندیش تھی—!

لیکن —— !" آثم مسکرا پڑا —— اس کے دل کے البم میں تو اب بھی اپنی پوری
حشر سامانیوں کے ساتھ وہی موجود تھی — "صنم! میری جان!! میری روح!! اپنی تصویر دل
کو وہاں سے کیسے ہٹاؤ گی —— ؟"

ساتھ ہی اس کی نگاہ پھر اٹھ گئی۔ البم کے صفحات کی طرح سامنے مسہری پر
بھی اس کی تقدیر دھنک کے روپ میں جلوہ افروز تھی۔ وہ ہولے سے بڑبڑایا ——
"ہاں — اس البم کے ہر ورق پر اب تم ہی تم ہوگی دھنک، اگر میرے دل کا البم
کھولنے کی کبھی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ ہماری حیات کی راہیں دھندلا جائیں گی۔ ہماری
منزل گم ہو جائے گی —— اور ہمیں ابھی بہت سارے کام سر انجام دینا ہیں۔ بہت
سارے ایسے ہی گم گردہ راہ مسافروں کو راستہ دکھانا ہے" اس نے البم بند
کر کے وہیں اپنے سامنے درمیانی تپائی پر رکھ دیا اور بڑے درد و کرب کے ساتھ

کراہ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے سر صوفے کی پشت پر گرا دیا۔

"سنیئے ــــ" ایک مترنم ، مگر غیر مانوس سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

یہ ــــ یہ ــــ کون تھی وہ ــــ ؟ اک اچٹتی سی نگاہ اس عروسی لباس اور زیورات کی جگمگاہٹ سے سجے ہوئے روشن اور منور پیکر پر ڈالنے کے بعد اس نے گھبرا کر مسہری کیطرف دیکھا۔ وہ خالی تھی ــــ تو ــــ یہ دھنک ، اس کی دلھن ، اپنے دولھا کا انتظار کر کر کے اب خود اس کے پاس چلی آئی تھی۔ لیکن ــــ سہاگ رات میں اک دلھن کے یہ انداز ــــ یہ اطوار ــــ آثم کے جی کو کچھ اچھا نہ لگا۔

"مجھے آپ سے ایک بات کرنا تھی ــــ" وہ اس کے قدموں کے قریب نیچے قالین پر بیٹھ گئی ــــ "ابامیاں کے حکم کے سامنے مجھے سر خم کرنا ہی پڑا۔ ورنہ میں یہ بندھن کبھی بھی نہ بندھنے دیتی ــــ" اس کا لہجہ بے حد شائستہ تھا۔ اس کی آواز آواز میں ایک انوکھا سا وقار اور عجیب سی کشش تھی۔ آثم کے سارے حواس اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"اور اب ــــ میں اس گھر میں رہوں گی ضرور کہ میں یہاں کی عزت بن گئی ہوں۔ لیکن ــــ آپ کی بیوی نہیں صرف اک خدمت گزار بن کر اور ابامیاں اور امی بیگم کی بہو نہیں بیٹی بن کر ــــ"

آثم چونکا ــــ یہ تو اس کے اپنے ہی دل کی بات دھنک کے ہونٹوں تک آگئی تھی ــــ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کے دل کے بند دروازوں پر وہ کبھی بھی ، کبھی بھی نہ دستک دے ــــ ! اتنی بڑی مشکل اس نے اس کی حل کر دی تھی۔ اطمینان و سکون کی اک لہر جیسے اس کے سارے وجود میں پھیل گئی۔

دھنک نے اس پر اتنا بڑا احسان کیا تھا ــــ آثم نے اک تشکر بھری نگاہ اسکے چہرے پر ڈالتے ہوئے زبان سے بھی شکریے کا کوئی لفظ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض

سمجھا ــــ مگر یہ کیا ــــ ؟ اس کی تو قوتِ گویائی ہی سلب ہوئی جا رہی تھی۔ پوری کوشش کے باوجود وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کی نگاہیں دھنک کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہاں ــــ

تقدس کا ایک انوکھا سا نور بکھرا تھا۔ بڑے ہی حسین انداز میں پاکیزگی بھری حیا کا عکس اس کے رخساروں کو گلابی کئے دے رہا تھا۔ خود آثم کے لئے ۔ اسکے دل میں جو محبت تھی ، جو عقیدت تھی اور احسان مندی کے جو جذبے تھے وہ قوس و قزح کے خوبصورت رنگوں کیطرح اس کی نشیلی آنکھوں میں لہرا رہے تھے۔ اور اس کے خم کھائے بیحد خوبصورت ہونٹ زندگی میں پہلی بار اپنے محبوب کے سامنے وا ہونے کی وجہ سے بڑے ہی دلفریب انداز میں کپکپا رہے تھے۔

زہد و تقویٰ لوٹ لینے والا ایسا سحر انگیز نظارہ ــــ ! ہوش و خرد سلب کر لینے والا ایسا روح پرور اور دلنواز منظر ــــ ! آثم کی آنکھوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایسی قیامت خیز گھڑی سے اس کی حیات پہلے کبھی نہ دوچار ہوئی تھی۔ وہ سحر زدہ سا حسن و رعنائی کے اس پیکرِ مجسم کو دیکھتا ہی چلا گیا ــــ دیکھتا ہی چلا گیا ــــ وہ گھبرائی ــــ اس کی لمبی لمبی پلکوں نے اس کے شعلہ بار رخساروں پر گر کر ان شعلوں کو اور ہوا دی۔

"میں خود کو آپ کے قابل نہیں سمجھتی ــــ میں زمین کا ایک حقیر ذرہ کسی بھی طرح آپ کی عظمت کے افق تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی ــــ"

آثم کی نگاہیں ہنوز دلوں کو تاراج کر دینے والے اس کے انوکھے سے روپ پر گڑی تھیں اور وہ حیرت سے سوچ رہا تھا۔

یہ وہ کہہ رہی تھی ــــ ؟ اس کے پر نور چہرے کا تقدس ، اس کی جھکی جھکی خمیدہ پلکوں والی خوبصورت آنکھوں کی حیا ، اس کے لبوں کی جھجک بھری کپکپاہٹ اور اس کے لہجے کا حجاب ــــ !!! یہ سب کچھ تو اس کے منہ سے

نکلنے والے ہر ہر لفظ کی تردید کر رہا تھا۔

انسان کا چہرہ اس کے کردار کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور اس کا آئینہ تو اس کی بے حد خوبصورت تصویر دکھا رہا تھا۔ ایسی حسین، ایسی دلآویز، ایسی انوکھی اور ایسی پرکشش، کہ اس کے چہرے سے اس کی نگاہ ہٹ ہی نہیں رہی تھی۔

اور اس کا کردار چہرے کے اس آئینے کے علاوہ اپنے عمل سے بھی تو اک ایسی عظیم ترین مثال پیش کر رہا تھا، کہ اس کی ساتھ شادی والا کارنامہ سر انجام دینے کے بعد بھی آثم کو اپنا آپ اس کے سامنے بہت چھوٹا بہت کمتر محسوس ہونے لگا تھا۔

اتنا کچھ کرنے کے بعد آخر اس کا دل ضمیر پہ غالب آ گیا تھا۔ اور وہ اس سے، اپنی دلھن سے چھپ کر یہاں آ بیٹھا تھا۔ مگر اس کا ضمیر تو اب بھی دل پر حاوی تھا۔ وہ اس کے سامنے سر بلند کئے موجود تھی۔

اس کے خط سے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اس نے ساری زندگی اسی کے سپنے دیکھے تھے۔ اور اسی کے تصورات میں ڈوبی رہی تھی، اور اب —— اس کی جائز بیوی، اس کی زندگی کی مالک، اس کے ہر جذبے کی حقدار بن کر بھی، گویا منزل پا لینے کے بعد بھی، وہ یہ سب کہہ رہی تھی۔ اس کا کردار تو بلندی کی انتہا تک پہنچ گیا تھا۔

"میں نے ہمیشہ آپ کو اپنا سب کچھ سمجھا ہے۔ اپنے دل کا مالک، اپنے جسم کا مالک، اپنی جان کا مالک آپ کو دیکھنے، آپ کو پانے کے لئے میں نے حیات کا اک اک لمحہ گن گن کر گزارا ہے، لیکن —— لیکن محبوب کے وصل کی خوشی کے علاوہ بھی بہت خوشیاں ایسی ہوتی ہیں جو مقدم ہو جاتی ہیں۔ اور میری خوشی اب اسی میں ہے کہ آپ کے آنگن میں جو بچے کھیلیں وہ اک باعزت اور باعصمت عورت کی کوکھ سے جنم لیں۔ وہ اک پاکیزہ گود میں پرورش پائیں ہا

وہ حیا آلود سی مدہم اور مترنم آواز کی مضبوط ڈور کے ساتھ آکاش کی بلندیوں کی طرف پرواز کرتی رہی۔ اور آثم کی متعجب و مسحور نگاہیں اس کے رخ پر جمی رہیں۔ جہاں حوروں کا تقدس تھا۔ جہاں فرشتوں کی پاکیزگی تھی۔ جہاں پھولوں کی نزاکت تھی۔ اور جہاں حوا کی حیا کا نور تھا —— !

پھر —— اسے پتہ ہی نہیں چلا —— کب اس کے بازو بڑھے، کیسے پھیلے اور کس طرح انہوں نے حسن و پاکیزگی کے اس سچے کھرے پیکر کو اپنے قدموں میں سے اٹھا کر آغوش میں بھرتے ہوئے اپنے مضبوط حصار میں محصور کر لیا تھا —— جانے وہ کون سا جذبہ تھا ——؟

"تم سے زیادہ مقدس وجود اس روئے ارض پر اور کونسا ہو گا دھنک ——؟ تمہاری گود سے بڑھ کر پاکیزہ گود اس آنگن میں کھیلنے والے بچوں کو اور کونسی ملے گی —— "!" اس کے بازوؤں کا حلقہ تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا گیا —— اور دھنک کے معطر وجود کا لمس ایسا مدہوش کن تھا کہ اسے نہ اپنی حرکات پہ قابو رہا اور نہ گفتار پر۔

" مجھے تم ایسی محبوب رفیق حیات اور کوئی نہیں مل سکتی تھی۔ کوئی نہیں —— تم ہی اس گھر کی بہو ہو، تم ہی آثم کے جسم و جان کی مالک و مختار ہو۔ اور تم ہی اس کے تمام تر جذبوں کی واحد وارث —— !!!"

اس کے شعلہ فشاں رخساروں، ستاروں ایسی بولتی اور روشنیاں بکھیرتی آنکھوں اور مدھ بھرے ہونٹوں کو دیوانہ وار چومتے ہوئے وہ کسی بدمست شرابی کی طرح لڑکھڑاتی زبان میں بڑبڑا رہا تھا۔

"آئندہ ایسی بات کبھی نہ کہنا —— کبھی نہیں —— اور اگر کہنے لگو تو پہلے میری آنکھوں میں، میرے دل میں ضرور جھانک لینا۔ تمہیں خود بخود ہی معلوم ہو جائے گا کہ تمہارا مقام کونسا ہے۔ تمہارا مرتبہ کیسا ہے اور تمہاری حیثیت کیا ہے !!!"

دھنک نے دفورِ حیا سے مندی آنکھیں کھول کر آثم کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں بڑی خوبصورت سی سچائیاں تڑپ رہی تھیں۔ اس نے سرشار ہوتے ہوئے اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپا لیا۔ اور اس کی اس معصوم اور پیاری سی ادا سے وارفتہ ہوتے ہوئے آثم نے اس کے سارے کے سارے وجود کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔ پھر جذب و مستی کی کیفیت میں ڈوبا ڈوبا سا سرگوشی کرنے لگا۔

" اپنی اس سہاگ رات میں، اس انوکھی اور پیاری سی دلھن کے حضور نذرِ گذار نے کو اور تو کچھ بھی اس قابل نہ تھا ـــ نہ زیور، نہ ہیرے، نہ موتی ـــ البتہ ـــ اپنا آپ پیش کر سکتا ہوں ـــ ویوں تو صدیوں سے، ازل سے تمہارا ہی ہوں مگر آج ـــ اک نئے انداز میں ـــ اک نئے روپ میں ـــ قبول کرو گی؟ قبول کرو گی ـــ ؟؟؟"

گلاب کی نازک، تازہ اور معطر پنکھڑیوں نے اس کے لرزتے تھرکتے ہونٹوں پر بڑی آہستگی سے جھک کر ان کی سرگوشی بند کرتے ہوئے قبولیت کی مہر ثبت کر دی۔ وہ رہے سہے ہوش و حواس بھی کھو بیٹھا ـــ!!!

○

"اثمی! ذرا یہ خط پڑھنا۔ کیسی عجیب سی اس عورت کی پرابلم ہے" صنم نے جھکا ہوا سر اٹھائے بغیر خوشخط سی تحریر والا وہ کاغذ میز کی پرلی طرف بڑھایا۔ خود اس کی نگاہیں دوسری تحریر پر مرکوز ہو چکی تھیں۔

کتنے ہی لمحات یونہی بیت گئے۔ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ اسی طرح وہ کاغذ تھامے بڑھا ہی رہا تو "اثمی ـــ!" اس نے قدرے جھنجلا کر سر اٹھاتے ہوئے نگاہیں بھی اٹھائیں۔

"اوہ ـــ!" آثم کی خالی کرسی نے اسے اس کی بھول کا احساس دلا دیا۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس کا ہاتھ واپس آ گیا۔ آثم تو حسبِ معمول آج پھر غائب تھا۔ اور وہ کمرے میں اکیلی تھی۔ اداسی اور افسردگی کی اک بڑی عجیب اور انتہائی بے دردسی لہر اس کے سارے وجود میں پھیل گئی۔

جب سے آثم کی شادی ہوئی تھی وہ اکثر دفتر سے غیر حاضر ہی رہتا تھا۔ پھر اس کا بھی سارا کام صنم ہی انجام دیا کرتی تھی۔ دفتر میں اور بھی لوگ موجود تھے وہ بھی اس کی مدد کر سکتے تھے۔ مگر آثم کی اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی طرف سے لاپرواہی وہ کسی اور پر عیاں ہونے نہیں دینا چاہتی تھی۔

"صنو! بیٹی ایک بات مانے گی ـــ؟"

"جی ممی! فرمایئے ـــ"

"تو اب ادارہ چھوڑ دے ـــ" کسی سرخ رنگ کے بے حد خوبصورت کپڑے پر وہ گوٹا لگا رہی تھیں۔ نگاہیں اسی پہ جمائے جمائے انہوں نے بڑی نرمی سے کہا تھا۔

"کیوں ـــ؟"

"تیری اب شادی کی عمر ہے اور یہ دیکھ میں تیرا عروسی جوڑا تیار کر رہی ہوں۔ مگر بیٹی! جو بھی ہمارے ہاں رشتے کیلئے آتا ہے وہ اعتراض ......"

"ممی ـــ!" ماں کی بات کاٹتے ہوئے اس کے لہجے میں سنگینی آ گئی۔ "میں نے پہلے بھی کئی بار کہا ہے کہ آپ میری شادی کا خیال چھوڑ دیجئے۔ میں یہ ادارہ نہیں چھوڑوں گی۔ میں نے اس کے لئے بہت قربانیاں دی ہیں"

اس سے پیشتر کہ ممی اسے کچھ سمجھانے بجھانے کی ایک بار پھر کوشش کرتیں وہ اٹھ کر کمرے سے ہی باہر نکل گئی تھی۔

"باجی ـــ!" جانے کس نے پکارا تھا۔ صنم اپنے خیالات سے چونکی، سر اٹھایا۔ نادانستہ نگاہ پھر آثم کی خالی کرسی پر جا پڑی۔

" باجی! اندر آسکتی ہوں —؟"

صنم نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا چہرے پر خوشیوں کی بہار کے ساتھ مسکراہٹوں کی خوش رنگ کلیاں کھلائے عابدہ دروازے میں کھڑی تھی۔ صنم کو اپنی طرف متوجہ پایا تو اجازت ملنے کی پرواہ کئے بغیر لپک کر اس کے پاس آگئی۔

" بس جلدی سے منہ کھول دیجئے۔ میں اپنے ہاتھ سے آپ کا منہ میٹھا کراؤں گی۔" میز پر یہ بڑا سا مٹھائی کا ڈبہ رکھنے کے بجائے تقریباً پٹخ کر وہ جلد جلد اسے کھولنے لگی

" میں اپنے سسرال جا رہی ہوں۔ وہ مجھے خود لینے آئے تھے۔ ساتھ میری ساس بھی تھیں۔ جب اپنی بیٹی پر سوت پڑنے لگی تو پھر دوسرے کی بیٹی کے درد کا احساس ہوا۔" جتنی تیزی سے اس کے ہاتھ مٹھائی کے ڈبے پر بندھی ڈوری کی گرہیں کھول رہے تھے اتنی ہی تیزی سے اسکی زبان سے الفاظ پھسل رہے تھے "بھلا ہو فرخندہ کا۔ خوب ساتھ دیا۔ ایسا ڈرامہ کیا ہے ناکہ ماں اور بھائی بھی سچ سمجھ بیٹھے۔ کم ہی کوئی نند بھابی کی ایسی خیرخواہ ہوگی ۔" وہ ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔ پھر یکایک سنجیدہ ہو گئی۔

" اور باجی! آپکا احسان تو میں مرتے دم تک نہیں بھولوں گی۔ مجھ پریشان حال کی اتنی خوبصورتی سے ساری پریشانیاں ختم کی ہیں، میرا اجڑا گھر ایسا آباد کیا ہے کہ میرا رواں رواں آپ کو دعائیں دے رہا ہے۔ آپ ہمیشہ سکھی رہیں باجی! آپ کے در پر سدا خوشیوں کی برات کھڑی رہے ۔"

ممی اسکا عروسی جوڑا بنا رہی تھیں۔ مگر وہ تو کئی بار پہن بھی چکی تھی۔ اس روز— جب آتم دولھا بنا تھا اور وہ دلھن، پھر قریشی صاحب کے بچوں نے انھیں رونمائی میں ٹھیکریاں دی تھیں۔

اس کے بعد اس دن بھی اس نے عروسی جوڑا پہنا تھا جب بیوہ صغرا اور اسکے یتیم و بے سہارا بچوں کو جائیداد سے اپنا حق ملا تھا۔ پھر اس دن— جب اس نے چوہدری جمیل کے ساتھ عشق و محبت کا ناٹک رچایا تھا اور ریشماں اپنے سسرال

سدھاری تھی۔

اس دن تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی جب دھنک کو آتم بیاہ کر گھر لے آیا تھا۔ اور یہ عابدہ۔ خوشیوں سے تمتایا اسکا روپ۔ یہ سب اسی کی تو آبادیاں تھیں۔ اسی کے تو سولہ سنگھار تھے۔ وہ تو جنم جنم سے سہاگن تھی۔

عابدہ نے اس کے منہ میں جو لڈو ٹھونسا تھا اسے جلدی جلدی نگلنے کے بعد اس نے وہی خوشخط سی تحریر والا خط میز پر سے اٹھا لیا۔ دو کمرے چھوڑ تیسرا ابا میاں کا تھا۔ اس خط کے متعلق ان سے مشورہ کرنے کے لئے وہ جا کر ان کے دروازے پر دستک دینے لگی۔

وہ پھر عروسی جوڑا پہننے کی تیاری کر رہی تھی۔ اور اطمینان و مسرت بھرا اک انتہائی دلآویز تبسم اس کے ہونٹوں پر سجدہ ریز تھا۔